تبصرات ماجدی

مرتب

عبدالعلیم قدوائی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تبصرات ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادی
کے
ادبی تبصروں کا مجموعہ

مرتب
عبدالعلیم قدوائی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 066

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 550
قیمت : -/277 روپے
سلسلہ مطبوعات : 1310

Tabsirat-e-Majidi
Compiled by Abdul Aleem Qidwai

ISBN : 81-7587-278-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: گوئیل اسٹیشنریز آفسیٹ پرنٹرس، 433، گلی روبن ٹاکیز، اولڈ، نئی دہلی۔ 007 110

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گی کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج

فہرست تبصرات ماجدی (ادبی)

افسانے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام پرچہ، حوالہ نمبر و جلد	تاریخ اشاعت	صفحہ
1	ناکام	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق نمبر 40 جلد 7	23/فروری 1942	1
2	چند افسانے	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق نمبر 42 جلد 8	8/مارچ 1943	4
3	پرانے خدا	کرشن چندر	صدق جدید نمبر 29 جلد 1	15/جون 1951	5
4	خلاصہ فسانۂ آزاد	ابو تمیم فرید آبادی	صدق جدید نمبر 29 جلد 4	18/جون 1954	7
5	شکستہ کنگورے	حیات اللہ انصاری	صدق جدید نمبر 31 جلد 6	22/جون 1956	8
6	فسانۂ عبرت	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	صدق جدید نمبر 35 جلد 8	یکم اگست 1958	11

اقبالیات

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام پرچہ، حوالہ نمبر و جلد	تاریخ اشاعت	صفحہ
7	ضرب کلیم	علامہ اقبال	صدق نمبر 17 جلد 2	11/اکتوبر 1936	14
8	پس چہ باید کرد اے قوم شرق	علامہ اقبال	صدق نمبر 22 جلد 2	11/دسمبر 1936	22
9	اقبال کا تصور زمان و مکان	ڈاکٹر رضی الدین	صدق نمبر 9 جلد 10	26/جون 1944	27
10	اقبال کا فلسفۂ خودی	ڈاکٹر میر ولی الدین	صدق نمبر 23 جلد 10	19/اکتوبر 1944	28
11	رموز اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین	صدق نمبر 23 جلد 12	26/جولائی 1946	29
12	اقبال کامل	عبدالسلام ندوی	صدق نمبر 39 جلد 14	29/اپریل 1949	30

تاریخ

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام پرچہ، حوالہ نمبر و جلد	تاریخ اشاعت	صفحہ
13	تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	صدق نمبر 9 جلد 6	8/جولائی 1940	32
14	بزم تیموریہ	صباح الدین عبدالرحمن	صدق نمبر 39 جلد 14	29/اپریل 1949	33
15	تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	صدق جدید نمبر 5 جلد 6	30/دسمبر 1955	35

16	بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد	رئیس احمد جعفری	صدق جدید نمبر 8 جلد 7	25/جنوری 1957	37
17	میرے زمانے کی دہلی	ملّا واحدی	صدق جدید نمبر 45 جلد 8	10/اکتوبر 1958	40
18	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	صباح الدین عبدالرحمٰن	صدق جدید نمبر 37 جلد 9	14/اگست 1959	41
19	گزشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر	صدق جدید نمبر 39 جلد 21	26/نومبر 1970	44

تذکرہ

20	انجمن ترقی اردو کی کہانی	غلام ربانی	صدق نمبر 3 جلد 6	2/مئی 1940	47
21	ہم اور وہ	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق نمبر 25 جلد 6	28/اکتوبر 1940	48
22	دلّی کا سنبھالا	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق نمبر 46 جلد 6	12/اپریل 1941	49
23	تذکرہ اردو مخطوطات	ڈاکٹر محی الدین زور	صدق نمبر 2 جلد 10	8/مئی 1944	51
24	مادر ہمدرد	خواجہ حسن نظامی	صدق نمبر 45 جلد 15	31/مارچ 1950	52
25	ادبی اور قومی تذکرے	کشن پرشاد کول	صدق جدید نمبر 26 جلد 2	20/مئی 1952	54
26	تاریخ انجمن ترقی اردو	سید ہاشمی فرید آبادی	صدق جدید نمبر 16 جلد 4	19/مارچ 1954	56

تنقید

27	تنقیدات عبدالحق	مرتبہ تراب علی خاں	صدق نمبر 28 جلد 1	11/فروری 1936	57
28	خمسہ کیفی	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	صدق نمبر 1 جلد 6	6/مئی 1940	58
29	تاریخ ادبیات ایران درعہد جدید	مترجمہ سید وہاج الدین	صدق نمبر 3 جلد 6	20/مئی 1940	59
30	محمد حسین آزاد	جہاں بانو بیگم	صدق نمبر 11 جلد 6	23/جولائی 1940	61
31	باقیات بجنوری	عبدالرحمٰن بجنوری	صدق نمبر 47 جلد 6	21/اپریل 1941	62
32	بزم اکبر	قمر الدین بدایونی	صدق نمبر 8 جلد 7	23/جون 1941	64

نمبر	عنوان	مصنف	شمارہ	تاریخ	صفحہ
33	شرح درد	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق نمبر 28 جلد 7	17/نومبر 1941	66
34	نقد ونظر	حامد حسن قادری	صدق نمبر 34 جلد 8	4/جنوری 1943	68
35	تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	صدق نمبر 9 جلد 9	28/جون 1943	70
36	مداوا	غلام احمد فرقت	صدق نمبر 44 جلد 9	30/مارچ 1944	71
37	تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	صدق نمبر 44 جلد 10	19/مارچ 1945	72
38	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	صدق نمبر 50 جلد 10	30/اپریل 1945	74
39	مرزا غالب کی شاعری	مرزا محمد عسکری	صدق نمبر 23 جلد 11	4/ستمبر 1945	76
40	مےخانہ ریاض	تسنیم مینائی	صدق نمبر 33 جلد 11	4/ستمبر 1945	77
41	ن م راشد	حیات اللہ انصاری	صدق نمبر 22 جلد 12	19/جنوری 1946	78
42	ادبی تبصرے	مولوی عبدالحق	صدق نمبر 43 جلد 13	12/مارچ 1947	79
43	ناول کی تاریخ	سید علی عباس حسینی	صدق نمبر 37 جلد 14	16/اپریل 1949	81
44	نیا ادب	کشن پرشاد کول	صدق نمبر 10 جلد 16	21/جولائی 1950	84
45	چھان بین	مرزا جعفر علی خاں اثر	صدق نمبر 11 جلد 21	14/جولائی 1950	87
46	دلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	صدق نمبر 15 جلد 16	18/اگست 1950	90
47	ایم اسلم اور اس کا عہد	خواجہ بدرالسلام	صدق جدید نمبر 25 جلد 1	18/مئی 1951	93
48	انیس کی مرثیہ نگاری	مرزا جعفر علی خاں اثر	صدق جدید نمبر 29 جلد 1	15/جون 1951	95
49	ذکر غالب	مالک رام	صدق جدید نمبر 29 جلد 1	15/جون 1951	98
50	ناول کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، حسن فاروقی	صدق جدید نمبر 31 جلد 1	29/جون 1951	100
51	کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی	صدق جدید نمبر 5 جلد 4	یکم جنوری 1953	103
52	شرح دیوانِ غالب	نظم طباطبائی	صدق جدید نمبر 21 جلد 4	23/اپریل 1954	105
53	تحقیقی مطالعے	نذیر احمد	صدق جدید نمبر 21 جلد 4	23/اپریل 1954	108
54	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	صدق جدید نمبر 24 جلد 4	14/مئی 1954	109
55	آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ	سید مسعود حسن رضوی ادیب	صدق جدید نمبر 42 جلد 4	[illegible]4/ستمبر 1954	111

56	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	صدق جدید نمبر 45 جلد 4	22/اکتوبر 1954	113
57	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	صدق جدید نمبر 6 جلد 5	7/جنوری 1955	116
58	اردو تنقید کی تاریخ	مسیح الزماں	صدق جدید نمبر 1 جلد 5	4/فروری 1955	119
59	اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین	صدق جدید نمبر 19 جلد 5	3/اپریل 1955	121
60	ذوق ادب اور شعور	سید احتشام حسین	صدق جدید نمبر 32 جلد 5	8/جولائی 1955	124
61	لکھنؤ کی زبان	محمد باقر شمس	صدق جدید نمبر 5 جلد 6	30/دسمبر 1955	126
62	نئے اور پرانے چراغ	آل احمد سرور	صدق جدید نمبر 14 جلد 6	2/مارچ 1956	128
63	اردو زبان اور ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	صدق جدید نمبر 29 جلد 7	21/جون 1957	132
64	تذکرہ نادر	سید مسعود حسن رضوی ادیب	صدق جدید نمبر 41 جلد 9	11/ستمبر 1959	135
65	تشبیہاتِ رومی	خلیفہ عبدالحکیم	صدق جدید نمبر 6 جلد 10	8/جنوری 1960	137
66	صہبائے مینائی	آفتاب احمد صدیقی	صدق جدید نمبر 71 جلد 10	15/جنوری 1960	139
67	گل رعنا	مالک رام	صدق جدید نمبر 36 جلد 20	14/اگست 1970	141
68	شرح دیوان غالب	محمد احمد بیخود موہانی	صدق جدید نمبر 51 جلد 10	14/نومبر 1970	142

حکایت

69	حکایات رومی حصہ اول	ترجمہ سید نظام شاہ لبیب	صدق نمبر 19 جلد 5	یکم فروری 1940	143
70	حکایات رومی حصہ دوم	ترجمہ سید نظام شاہ لبیب	صدق نمبر 22 جلد 12	26/جولائی 1946	144

صنف ادب......خاکے

71	کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی	صدق نمبر 20 جلد 7	15/ستمبر 1941	145
72	گنج ہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	صدق نمبر 19 جلد 8	7/ستمبر 1942	146
73	چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	صدق نمبر 42 جلد 8	8/مارچ 1943	148
74	شیش محل	شوکت تھانوی	صدق نمبر 26 جلد 9	یکم نومبر 1943	150
75	دید و شنید	رئیس احمد جعفری	صدق نمبر 36 جلد 15	27/جنوری 1950	151
76	یادرفتگاں	سید سلیمان ندوی	صدق جدید نمبر 29 جلد 5	17/جون 1955	154

خطوط

77	خطوط محمد علی	مرتبہ محمد سرور جامعی	صدق نمبر46 جلد6	14/اپریل 1941	156
78	غبار خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد	صدق نمبر19 جلد12	3/جولائی 1946	158
79	خطوط غالب	مرتبہ مولوی مہیش پرشاد	صدق نمبر13 جلد7	28/جولائی 1941	160

داستان

80	آرائش محفل	میر شیر علی افسوس	صدق نمبر25 جلد15	11/نومبر 1949	162
81	الف لیلہ ولیلۃ	ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد	صدق نمبر13 جلد9	28/جولائی 1941	164
82	خلاصہ فسانۂ عجائب	الیاس احمد مجیبی	صدق جدید نمبر28 جلد2	13/جون 1952	165
83	خلاصہ باغ و بہار	الیاس احمد مجیبی	صدق جدید نمبر28 جلد2	13/جون 1952	165
84	نوطرز مرصع	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	صدق جدید نمبر35 جلد9	21/جولائی 1959	168

ڈرامہ

85	کہرے کا چاند	ڈاکٹر محمد حسن	صدق جدید نمبر13 جلد6	27/فروری 1970	170

صنف ادب......روزنامچہ

86	ایک نادر روزنامچہ	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	صدق جدید نمبر5 جلد6	7/جنوری 1955	171

سفرنامہ

87	ساحل اور سمندر	سید احتشام حسین	صدق جدید نمبر3 جلد5	17/دسمبر 1954	175

سماجیات

88	اس بازار میں	شورش کاشمیری	صدق جدید نمبر52 جلد6	30/نومبر 1956	179

سوانح

89	غالب	غلام رسول مہر	صدق نمبر28 جلد2	11/فروری 1937	186
90	حیاتِ جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	صدق جدید نمبر7 جلد6	17/جون 1940	189
91	اعمال نامہ	سر سید رضا علی	صدق نمبر44 جلد9	20/مارچ 1944	190
92	حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی	صدق نمبر1 جلد10	یکم مئی 1944	192

93	مابدولت	شوکت تھانوی	صدق نمبر8 جلد12	22/مئی 1946	194
94	ذکر شبلی	محمد امین زبیری	صدق نمبر9 جلد14	4/جولائی 1947	196
95	رند پارسا	رئیس احمد جعفری	صدق نمبر25 جلد15	11/نومبر 1949	198
96	یاد ایام	احمد سعید خاں چھتاری	صدق نمبر6 جلد16	9/جون 1950	200
97	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	صدق جدید نمبر21 جلد1	8/دسمبر 1950	203
98	حیات سرسید	نورالرحمٰن	صدق جدید نمبر21 جلد1	8/دسمبر 1950	203
99	حیات اکبر	ملاّ واحدی و عشرت حسین	صدق جدید نمبر10 جلد2	8/فروری 1952	207
100	کشکول محمد علی شاہ	محمد علی ردولوی (چودھری)	صدق جدید نمبر26 جلد2	30/مئی 1952	209
101	حیات اجمل	عبدالغفار (قاضی)	صدق جدید نمبر25 جلد2	یکم اگست 1952	211
102	شروانی نامہ	عباس خاں شروانی (حاجی)	صدق جدید نمبر14 جلد4	19/مارچ 1954	216
103	مشاہدات	ہوش یار جنگ	صدق جدید نمبر6 جلد6	6/جنوری 1956	218
104	حیات آفتاب	حبیب اللہ خاں (ڈپٹی)	صدق جدید نمبر13 جلد6	24/فروری 1956	222
105	عطاءاللہ شاہ بخاری	شورش کاشمیری	صدق جدید نمبر32 جلد8	11/جولائی 1958	224
106	ظفر علی خاں	شورش کاشمیری	صدق جدید نمبر32 جلد8	11/جولائی 1958	224
107	میری آپ بیتی	نثار احمد فاروقی	صدق جدید نمبر38 جلد8	22/اگست 1958	226
108	جلال لکھنوی	ڈاکٹر محمد حسن	صدق جدید نمبر44 جلد8	3/اکتوبر 1958	228
109	تلامذۂ غالب	مالک رام	صدق جدید نمبر49 جلد9	6/نومبر 1958	230
110	ابوالکلام آزاد	مرتبہ وزارت اطلاعات حکومت ہند	صدق جدید نمبر51 جلد9	16/نومبر 1959	233
111	شاہراہ پاکستان	چودھری خلیق الزماں	صدق جدید نمبر35 جلد20	22/مئی 1970	236
112	یادوں کی بارات	جوش ملیح آبادی	صدق جدید نمبر36 جلد22	21/28/جنوری 1972	239

شاعری

113	مسدس حالی	خواجہ حالی	صدق نمبر21 جلد1	یکم دسمبر 1935	247

114	کلیات سلطان محمد قلی شاہ	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور	صدق نمبر 17 جلد 7	25/اگست 1941	248
115	کلیات سراج	مرتبہ عبدالقادر سروری	صدق نمبر 17 جلد 7	25/اگست 1941	248
116	نغمۂ زندگی	فضل کریم فضلی	صدق نمبر 48 جلد 7	13/اپریل 1942	250
117	رنگ محل	ساغر نظامی	صدق نمبر 29 جلد 9	22/نومبر 1943	252
118	دیوان نظیر اکبرآبادی	مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	صدق نمبر 29 جلد 9	22/نومبر 1943	253
119	گلبانگ حرم	حمید لکھنوی	صدق نمبر 1 جلد 10	یکم مئی 1944	254
120	کیفیہ	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	صدق نمبر 3 جلد 10	16/مئی 1944	256
121	ذکر جمیل	ماہر القادری	صدق نمبر 45 جلد 10	26/مارچ 1945	258
122	لہو ترنگ	سکندر علی وجد	صدق نمبر 2 جلد 11	16/مئی 1945	259
123	نقش امروز	علی اشرف	صدق نمبر 22 جلد 11	یکم ستمبر 1945	261
124	طوفانِ محبت	ہوش بلگرامی	صدق نمبر 42 جلد 12	27/دسمبر 1946	263
125	لاجونتی	سرشانتی سروپ بھٹناگر	صدق نمبر 45 جلد 12	17/جنوری 1947	266
126	جہانِ آرزو	آرزو لکھنوی	صدق نمبر 6 جلد 12	18/مئی 1946	269
127	کلیات ولی	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	صدق نمبر 22 جلد 12	19/جولائی 1946	271
128	نشاط خاطر	حمید لکھنوی	صدق نمبر 12 جلد 13	25/جولائی 1947	273
129	آئینہ	اصطفا خاں لکھنوی	صدق نمبر 4 جلد 15	27/مئی 1942	275
130	مسدس بے نظیر	جان صاحب ریختی گو	صدق جدید نمبر 1 جلد 1	8/دسمبر 1950	278
131	اردو	جگن ناتھ آزاد	صدق جدید نمبر 14 جلد 1	3/مارچ 1951	281
132	ہفت رنگ	عرش ملسیانی	صدق جدید نمبر 19 جلد 1	6/اپریل 1951	283
133	کشکول مجذوب	عزیز الحسن مجذوب	صدق جدید نمبر 22 جلد 1	12/مئی 1951	285
134	فانوس	شفیق جونپوری	صدق جدید نمبر 14 جلد 2	7/مارچ 1952	287
135	ترجمان اسرار	شیخ عبدالرحمان	صدق جدید نمبر 16 جلد 2	21/مارچ 1952	289
136	نقد رواں	جگت موہن لال رواں	صدق جدید نمبر 31 جلد 2	4/جولائی 1952	292

137	تجلیات	ضیاء احمد بدایونی	صدق جدید نمبر 5 جلد 4	یکم جنوری 1953	296
138	اجالے	انجم بدایونی	صدق جدید نمبر 31 جلد 4	2/جولائی 1954	298
139	روح کلام غالب	مرزا عزیز بیگ	صدق نمبر 4 جلد 16	26/مئی 1950	301
140	کلیات ولی	نورالحسن ہاشمی	صدق جدید نمبر 45 جلد 4	22/اکتوبر 1954	303
141	بھگوت گیتا	منور لکھنوی	صدق جدید نمبر 5 جلد 6	30/دسمبر 1955	305
142	چشم غزال	فضل کریم فضلی	صدق جدید نمبر 6 جلد 6	6/جنوری 1956	307
143	ذوق جنوں	آل احمد سرور	صدق جدید نمبر 26 جلد 6	25/مئی 1956	310
144	گفتنی و ناگفتنی	شورش کاشمیری	صدق جدید نمبر 41 جلد 6	7/ستمبر 1956	313
145	انتخاب کلام آتش	مرتبہ ڈاکٹر اعجاز حسین	صدق جدید نمبر 44 جلد 6	28/ستمبر 1956	316
146	مثنویات میر بخط میر	مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	صدق جدید نمبر 45 جلد 7	11/اکتوبر 1957	318
147	تذکرہ مرقع شعراء فارسی	مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	صدق جدید نمبر 42 جلد 7	8/نومبر 1957	320
148	گنج معانی	تلوک چند محروم	صدق جدید نمبر 52 جلد 7	22/نومبر 1957	322
149	رزم نامہ انیس	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	صدق جدید نمبر 32 جلد 8	4/جولائی 1958	324
150	نوبہاراں	جعفر علی خاں اثر	صدق جدید نمبر 32 جلد 8	4/جولائی 1958	324
151	پھول مالا	منے آغا زکی	صدق جدید نمبر 34 جلد 8	25/جولائی 1958	326
152	دیوان غالب	مرتبہ مالک رام	صدق جدید نمبر 49 جلد 8	7/نومبر 1958	328
153	کلام بے نظیر	اکبرالدین صدیقی	صدق جدید نمبر 27 جلد 9	5/جون 1959	330
154	انجم کدہ	عزیز لکھنوی	صدق جدید نمبر 7 جلد 10	15/جنوری 1960	333
155	صدائے بازگشت	زین العابدین بیکس	صدق جدید نمبر 10 جلد 10	5/فروری 1960	335
156	صحرا میں اذان	گوپال متل	صدق جدید نمبر 17 جلد 20	27/مارچ 1970	338
157	مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	صدق جدید نمبر 49 جلد 21	5/نومبر 1971	339

طنز و مزاح

158	پطرس کے مضامین	پطرس اے ایس بخاری	صدق نمبر 19 جلد 5	یکم فروری 1940	341

نمبر	عنوان	مصنف	شمارہ	تاریخ	صفحہ
159	خنداں	رشید احمد صدیقی	صدق نمبر 7 جلد 6	17/جون 1940	343
160	جزیرہ سخنوران	غلام عباس	صدق نمبر 25 جلد 7	13/اکتوبر 1941	345
161	شوکتیات	شوکت تھانوی	صدق جدید نمبر 15 جلد 2	24/مارچ 1952	347
162	بزم بے تکلف	سید عابد حسین	صدق جدید نمبر 40 جلد 4	17/ستمبر 1954	350
163	اپنی موج میں	آوارہ	صدق جدید نمبر 13 جلد 5	25/فروری 1955	353
164	کف گلفروش	غلام احمد فرقت	صدق جدید نمبر 18 جلد 5	یکم اپریل 1955	354
165	لطائف السعادت	آمنہ خاتون	صدق جدید نمبر 45 جلد 6	5/اکتوبر 1956	356
166	صید ہدف	غلام احمد فرقت	صدق جدید نمبر 29 جلد 7	21/جون 1957	359
167	طنز و مزاح	غلام احمد فرقت	صدق جدید نمبر 34 جلد 7	22/جولائی 1957	360

لسانیات

نمبر	عنوان	مصنف	شمارہ	تاریخ	صفحہ
168	آریائی زبانیں	سد حیشور ورما	صدق نمبر 11 جلد 10	10/جولائی 1944	362

لغت

نمبر	عنوان	مصنف	شمارہ	تاریخ	صفحہ
169	لغات جدیدہ	سید سلیمان ندوی	صدق نمبر 16 جلد 3	یکم اکتوبر 1937	364
170	اصطلاحات پیشہ وراں حصہ ا	ظفر الرحمن	صدق نمبر 30 جلد 5	29/اپریل 1940	365
171	سٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	ڈاکٹر مولوی عبد الحق	صدق نمبر 10 جلد 6	16/جولائی 1940	366
172	اصطلاحات پیشہ وراں حصہ ۲	ظفر الرحمن	صدق نمبر 18 جلد 7	یکم ستمبر 1941	372
173	اصطلاحات پیشہ وراں حصہ ۳	ظفر الرحمن	صدق نمبر 18 جلد 7	یکم ستمبر 1941	372
174	بیان اللسان	زین العابدین سجاد (قاضی)	صدق نمبر 36 جلد 15	27/جنوری 1950	374
175	مصباح اللغات	عبد الحفیظ بلیاوی (مولوی)	صدق جدید نمبر 19 جلد 1	6/اپریل 1951	376
176	اردو عربی ڈکشنری	عبد الحفیظ بلیاوی (مولوی)	صدق جدید نمبر 35 جلد 4	30/جولائی 1954	378
177	مہذب اللغات جلد ۵،۶	مہذب لکھنوی	صدق جدید نمبر 42 جلد 20	20/ستمبر 1970	381
178	مہذب اللغات جلد ۷	مہذب لکھنوی	صدق جدید نمبر 31 جلد 21	2/جولائی 1971	383

مضامین

179	مقالات شبلی حصہ ۴	شبلی نعمانی (مولانا)	صدق نمبر 10 جلد 1	10/اگست 1935	384
180	مقالات شبلی حصہ ۵	شبلی نعمانی (مولانا)	صدق نمبر 15/16 جلد 2	2/ستمبر/یکم اکتوبر 1936	386
181	مقالات شبلی حصہ ۶	شبلی نعمانی (مولانا)	صدق نمبر 11 جلد 3	12/اگست 1937	388
182	مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	صدق نمبر 21 جلد 5	26/فروری 1940	390
183	مقالات محمد علی حصہ ۱	رئیس احمد جعفری	صدق نمبر 36 جلد 9	24/جنوری 1944	392
184	مقالات محمد علی حصہ ۲	رئیس احمد جعفری	صدق نمبر 46 جلد 10	12/اپریل 1945	395
185	مقالات شروانی	حبیب الرحمٰن خاں شروانی	صدق نمبر 24 جلد 15	28/اکتوبر 1949	397
186	مضامین سید سلیمان ندوی	شفیع احمد	صدق نمبر 39 جلد 15	17/فروری 1950	400
187	پرچھائیں	سید آصف علی	صدق جدید نمبر 8 جلد 1	19/جنوری 1951	402
188	آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	صدق جدید نمبر 50 جلد 8	14/نومبر 1958	404
189	انتخاب مضامین شبلی	رشید حسن خاں	صدق جدید نمبر 41 جلد 21	10/ستمبر 1971	406

ناول

190	مرزا بلگرامی۔لال کنور	ظفر عمر صاحب	رسالہ الناظر	1930	408
191	بیوہ	منشی پریم چند	صدق نمبر 19 جلد 5	یکم فروری 1940	418
192	میٹھی کٹنین یا فسانہ جمیل	عبدالرؤف عباسی	صدق نمبر 29 جلد 6	22/اپریل 1940	419
193	گئو دان	منشی پریم چند	صدق نمبر 5 جلد 6	3/جون 1940	427
194	میدان عمل	منشی پریم چند	صدق نمبر 7 جلد 6	17/جون 1940	428
195	ضمیر	محمد عبدالرحمٰن خاں	صدق نمبر 9 جلد 6	8/جولائی 1940	429
196	ہوائی	سلطان حیدر جوش	صدق نمبر 45 جلد 12	17/جنوری 1947	430
197	شبنم	عزیز احمد	صدق جدید نمبر 20 جلد 2	8/اپریل 1952	433
198	خوجی	احسن فاروقی	صدق جدید نمبر 27 جلد 2	6/جون 1952	437
199	یزید	سعادت حسن منٹو	صدق جدید نمبر 31 جلد 2	2/جولائی 1952	438

نمبر	عنوان	مصنف	ماخذ	تاریخ	صفحہ
200	عشق	رئیس احمد جعفری	صدق جدید نمبر43 جلد2	22/ستمبر 1952	441
201	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا لکھنوی	صدق جدید نمبر41 جلد6	7/ستمبر 1956	443
202	آتش خاموش	خواجہ محمد شفیع دہلوی	صدق جدید نمبر38 جلد7	23/اگست 1957	445
203	لہو کے پھول	حیات اللہ انصاری	صدق جدید نمبر66 جلد21	8/جنوری 1971	449
204	امراؤ جان ادا کا نیا ایڈیشن	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	صدق جدید نمبر32 جلد22	10-17/نومبر 1971	454
	متفرق				
205	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	عمران خاں ندوی (مولوی)	صدق نمبر35 جلد12	25/اکتوبر 1946	462
206	اشاریہ				463

دیباچہ

ملک کے نامور عالم، ادیب بے بدل، انشاء پرداز اور صحافی حضرت مولانا دریابادیؒ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ انہوں نے ادب، انشا، فلسفہ، سوانح، تنقید، سیرت، تفسیر، ترجمہ، صحافت کے ذریعہ علم وادب کی زبردست خدمات انجام دی ہیں اور ان کا شمار برِ اعظم صغیر کی عبقری شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلام مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے جو انہوں نے یکہ وتنہا انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کر کے علمی و مذہبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب، اور انشاء پرداز تھے اور انشاء پرداز بھی ایسے جو اپنے طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ بیسویں صدی کے صاحب اسلوب نثر نگاروں میں وہ صفِ اول پر ابوالکلام آزاد، حسن نظامی کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں جن کے یہاں سلاست، فصاحت، بلاغت خاص لکھنوی روزمرہ اور محاوروں میں ملتی ہے اور عبارت میں بلا کی شگفتگی اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھیں، مضامین، پیغامات، مقالات، مقدموں، تبصروں، دیباچوں، تقریظوں اور ریڈیائی نشریوں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ یہ کتاب ان کے لکھے ہوئے منتخب ادبی تبصروں پر مشتمل ہے جو ان کے ہفتہ وار اخباروں صدق اور صدق جدید میں شایع ہوئے۔

شخصیت وحالاتِ زندگی

مولانا دریابادیؒ کی پیدائش اودھ کے ایک شریف قدوائی گھرانے میں قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی میں مارچ 1892 میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے وطن دریاباد کو اپنے نام کا ایسا جز بنالیا کہ اس کا نام ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم قرآن مجید ناظرہ اردو فارسی وعربی کے حاصل کرنے کے بعد سیتاپور سے ہائی اسکول اور کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانات پاس کئے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ اور دلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں ایم اے فلاسفی میں داخلہ لیا مگر والد ماجد کے انتقال کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ بچپن ہی سے انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ کم سنی ہی سے مضمون اور مراسلے لکھنے لگے جو وکیل امرتسر اور اودھ اخبار لکھنؤ وغیرہ میں شایع ہوئے۔ ان کے دو مفصل مقالے ''محمود غزنوی'' اور ''غذائے انسانی'' کتابی شکل میں وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی امرتسر نے 1910 میں چھاپے اس وقت جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ ان کے والد مولوی عبدالقادر صاحب بڑے ذی علم تھے ان کے پاس متعدد اخبارات و رسائل آتے تھے۔ ان کے ایک چچازاد بھائی عبدالحلیم اثر بھی اخباروں اور کتابوں کے مطالعے کے بڑے شائق تھے اور انہوں نے ہی ان کے اندر یہ ذوق پیدا کیا۔ چنانچہ ہر قسم کی کتابیں اردو اور انگریزی میں گھر پر اور لائبریری میں پڑھا کرتے، مگر اس بے قید مطالعے کا مضر اثر یہ ہوا کہ الحاد و شکوک کی دلدل میں پھنس گئے۔ فلسفہ اور مغربی فلسفہ اور مستشرقین کی کتابوں سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ بعض فرنگی مستشرقین کے مطالعے سے وہ مذہب، ذات رسالت اور اخلاقی قدروں سے برگشتہ ہوگئے اور خود کو کھلم کھلا ریشنلسٹ یا عقلیت پسند کہنے لگے۔ بس غنیمت یہ تھا کہ مسلمانوں سے میل جول اور معاشرتی تعلقات قائم رہے جس کی وجہ سے سوشل حیثیت سے نام کے مسلمان اس وقت بھی رہے۔ تشکیک والحاد کا یہ سلسلہ 1909 سے 1918 تک چلتا

رہا۔ مذہب کی طرف واپسی میں انہیں لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری، مہدی افادی اور بھگوان داس جیسے اکابر سے مدد ملی۔ کتابوں میں مولانا شبلی کی سیرت النبی، مثنوی مولانا روم، مکتوبات مجدّدی، بھگوت گیتا، بدھ مت کی تعلیمات، تھیاسوفسٹ لٹریچر، اور گاندھی جی کی تحریروں نے ان کو نفس مذہب کی اہمیت وضرورت کا قائل کیا اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی عظمت و معنویت کو راسخ کیا جس کی وجہ سے وہ ازسرنو اسلام کے دائرے میں آ گئے۔ تعلیم کے بعد مختلف ملازمتوں کے لیے کوششیں کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مولانا شبلی مرحوم نے انگریزی کتابوں کے ترجمہ اور حوالوں کے لیے اپنا معاون رکھا نیز مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے انجمن ترقی اردو ہند کے لیے متعدد کتابوں کے ترجمے کرائے جن سے ان کے علمی مذاق اور معیار میں اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، اکبرالہ آبادی، مرزا رسوا لکھنوی اور لکھنؤ کے نامور شاعروں اور ادیبوں سے تعلقات بڑھے اور مختلف قسم کے علمی وادبی مشغلوں میں مصروف رہے۔ 1916 میں اپنی پسند سے شادی کی۔ کچھ عرصے کے لیے مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کام کیا مگر اس میں جی نہ لگا پھر تقریباً گیارہ ماہ دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازمت کی۔ مگر ملازمت کی پابندیوں اور قیود کو برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے مستعفی ہو کر وطن واپس آ گئے اور کتابوں کے ترجمے اور مختلف اخبارات ورسائل میں مضامین لکھ کر گزر اوقات کرتے رہے۔ 1919 میں نظام حیدرآباد سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے سوا سو روپے ماہوار کا علمی وظیفہ (پنشن) تاحیات دینا منظور کیا اور شرط یہ رکھی کہ مولانا شبلی کی طرح آزادی سے جہاں چاہیں قیام کر کے کتابیں لکھتے رہیں اور انہیں حکومتِ آصفیہ سے منسوب کرتے رہیں۔ یہ علمی وظیفہ ان کو وفات تک ملتا رہا اور پھر انہوں نے کسی ملازمت کا خیال نہیں کیا۔ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ میں رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی صرف عربی بطور مضمون بی اے میں پڑھی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی محنت سے عربی فارسی کی استعداد میں معتد بہ اضافہ

کیا اور حدیث وتفسیر و مذہبی کتابوں پر پورا عبور حاصل کیا۔ انہوں نے خارزار سیاست سے اپنا دامن ہمیشہ الگ رکھا۔ صرف مختصر عرصے کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی وجہ سے جو ان کے محبوب مقتدا تھے تحریکِ خلافت میں کچھ عملی حصہ لیا اور اودھ خلافت کانگریس کے صدر رہے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور ملک کی دیگر سیاسی و علمی شخصیتوں سے تعلقات بڑھے، گاندھی جی کی اخلاقی تعلیمات اور تحریروں سے بہت متاثر ہوئے۔ 1922 میں مستقل طور پر اپنے آبائی وطن قصبہ دریاباد جو لکھنؤ سے تقریباً 67 کلومیٹر فاصلے پر لکھنؤ۔ فیض آباد۔ کلکتہ ریلوے لائن پر واقع ہے منتقل ہو گئے اور آخر وقت تک وہیں بیٹھ کر تصنیف وتالیف وصحافت کے مشغلوں میں لگے رہے۔ وہاں انہوں نے 54 سال کی بڑی صاف ستھری منضبط اور پرسکون زندگی گزاری اور اردو ادب کو اپنی بیش بہا تصانیف سے مالا مال کیا۔ 1925 میں لکھنؤ سے اپنا ہفتہ وار ''سچ'' نکالا جو نو سال تک نکلتا رہا اور اس نے اصلاح معاشرہ، ہندو مسلم اتحاد، رد بدعات، اقدار مشرق، مذہب اور اردو کی زبردست خدمات انجام دیں۔ ملّی، قومی، مذہبی اور ادبی دائروں میں قابلِ قدر اور ذمہ دارانہ احتساب کے نمونے پیش کیے۔ اس کے بعد صدق اور صدق جدید بھی ان کی وفات تک نکلتے رہے۔ ان کی 52 سالہ صحافتی زندگی حق گوئی اور اعلیٰ صحافت کا نمونہ تھی۔ ان کے ہم عصروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، سید جالب جیسے نامور صحافی تھے مگر انہوں نے اردو صحافت میں اپنے لیے ایک منفرد و عظیم مقام حاصل کیا اور اسے کچھ ایسے زریں رہبر اصول سکھائے اور عملی طور پر برت کر دکھائے جن کے لیے وہ ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔ ان اخباروں کے ذریعے انہوں نے مذہبی اور معاشرتی اصلاح کا بڑا کام انجام دیا اور ساتھ ہی زبان کی صحت وسلاست کا خیال رکھا۔ لکھنوی روزمرہ محاورہ، اشعار اور مصرعوں کے برمحل استعمال، منھ سے بولتی ہوئی حسب حال سرخیوں اور مضمون آفرینی کی بنا پر یہ تینوں اخبار بہت مشہور اور مقبول ہوئے ان کے اقتباسات کثرت سے ہندوستان اور پاکستان کے اخباروں اور رسائل

میں نقل ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے اداریے ''سچی باتیں'' اردو صحافت اور انشا میں بیش بہا اضافے ہیں۔ مولانا مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان اخباروں اور اپنی تحریروں کے ذریعے فرنگی تہذیب وتمدن کی خامیوں اور مضرتوں کا پردہ چاک کیا اور دانش حاضر کے تاریک گوشوں کی پردہ دری کی۔ تفرنج اور آزادی کے بعد تہنید کے خلاف ان کا قلمی جہاد ملی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ ثابت قدمی سے وطن عزیز میں جمے رہے اور زبانِ قلم سے مسلمانوں، اردو زبان، مٹتی ہوئی مشرقی طرزِ معاشرت کی مظلومیت کی داستان بیان کرتے رہے اور مشترکہ ہندوستانی کلچر، ہندو مسلم اتحاد، صحیح جذبۂ حب الوطنی اور ادبِ صالح وشریف کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کی بے مثل صحافت کے ذریعے مستقبل میں فکر وفرزانگی، حکمت و دانش، سوز وسرور اور جذب وجنوں کی کتنی ہی نئی حکایتیں رقم کی جاتی رہیں گی۔

جیسا اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے مولانا دریابادی اردو نثر میں ایک منفرد اور ناقابلِ تقلید اسلوب کے مالک تھے جو ان کی تصانیف، مضامین، خطبات، نشری تقریروں، شذرات اور تبصرات سے ہر جگہ ظاہر اور نمایاں ہوتا ہے جس کی اہم خصوصیت شگفتگی، فصاحت، سلاست، معنویت، رعایت لفظی، معتدل طریقہ پر ضلع جگت کا استعمال، عبرت آفرینی، سوز وگداز اور تاثر ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں انگریزی و اردو ترجمہ، تفسیر قرآن، تفسیر ماجدی، آپ بیتی، سفر حجاز، محمد علی کی ذاتی ڈائری، حکیم الامت، اکبر الہ آبادی میری نظر میں، تشریحات ماجد، معاصرین، فلسفہ جذبات، مثنوی بحر المحبت، قصص ومسائل، فلسفہ، ذکر رسول وغیرہ شامل ہیں۔ 1966 میں حکومت ہند نے آپ کو عربی کی سند اعزاز (نیشنل اسکالرشپ) عطا کی اور حکومت یوپی نے اردو کے بہترین مصنف کا انعام دیا۔ 1976 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی۔

مولانا مرحوم کا ملک کے مختلف ملی، ادبی اور علمی اداروں سے گہرا تعلق تھا

جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اعظم گڑھ (جس کے بانیوں میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ وہ بھی شامل تھے)، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، انجمن ترقی اردو، یوپی اردو اکیڈمی، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شخصیات میں وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی، مرزا رسوا لکھنوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے متاثر ہوئے تھے اور ان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا اشرف علی کو اپنا مقتدائے روحانی، مولانا محمد علی کو اپنا محبوب اور مولانا شبلی کو تحریر و انشا میں اپنا استاد معنوی تسلیم کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کو قدرت نے توازن و اعتدال کی نعمت سے نوازا تھا اس لیے وتحزب یا پارٹی بندی سے ہمیشہ الگ رہے، اتحاد فرقہ ہائے اسلامی اور برادرانِ وطن کے ساتھ اتحاد ان کو بہت عزیز تھا اور اس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات اور اخلاقی فلسفے کے بھی قائل تھے نیز پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، بھگوان داس، سری پرکاش، سی راج گوپال آچاریہ، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت سندر لال، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی خوبیوں کا کھل کر اعتراف کرتے تھے اور ان کو بطور مثال پیش کرتے تھے۔ حج کے سفر سے مشرف ہونے کے علاوہ انہوں نے دو دفعہ پاکستان کا بھی سفر کیا تھا اور اپنے مشاہدات تحریری شکل میں پیش کیے جو بہت پسند کیے گئے۔

6/جنوری 1976 کو 85 سال کی کامیاب زندگی کے بعد انہوں نے سفر آخرت لکھنؤ میں اختیار کیا اور ان کی تدفین ان کے آبائی مکان دریاباد میں ہوئی۔ ان کی وصیت کے بموجب کتبۂ قبر پر یہ موثر عبارت درج ہے۔ ''ایک گنہگار جو تائب ہو کر مرا''۔ ان کی وفات سے علم وادب اور خاص کر صحافت میں بڑا خلا پیدا ہو گیا۔

تنقید اور تبصرے ــــ خصوصیات

مولانا مرحوم کو شروع ہی سے تنقید و تبصرہ سے دلچسپی تھی چنانچہ اپنی طالب

علمی کے زمانے میں مولانا شبلی کی تصنیف ''الکلام'' پر لکھنؤ کے رسالہ ''الناظر'' میں تنقید کی۔ ان کے اسلوبِ تنقید اور موضوعات پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے ان کی تنقید سادگی سلاست، شگفتگی اور جدت ادا کی حامل ہے۔ انہوں نے مستقل ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں تبصرے بھی کیے ہیں تقریظیں بھی لکھی ہیں، پی ایچ ڈی کے بعض مقالات پر رپورٹیں بھی لکھی ہیں نیز ریڈیو پر تقریریں بھی نشر کی ہیں۔ ان کی شخصیت اور تحریروں پر مولانا شبلی کا بڑا گہرا اثر ہے چنانچہ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف یوں کیا ہے۔ ''باضابطہ شاگردی کی سعادت اس کم سواد کے نصیب میں نہ تھی۔ لیکن طرز تحریر کا چربہ اڑانے کی شعوری کوشش مدتوں برسوں کی۔ چلتے ہوئے فقروں کو نوک زبان کر لیا۔ ڈھلے ہوئے ترشے ہوئے جملے ٹھونس ٹھانس حافظے کے خزانے میں بند کر لیے۔ نقالی کو ایک مستقل مشغلہ بنائے رکھا اور مزید خوش نصیبی یہ کہ لکھنؤ میں دو ڈھائی سال تک کہنا چاہئے کہ روزانہ سہ پہر کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے حاضری کی توفیق ہو جاتی رہی۔ اس مجلس میں عموماً ادبی علمی شعری اور تنقیدی نکتے بیان ہوتے رہتے اور کبھی کوئی تاریخی یا دینی موضوع بھی چھڑ جاتا۔

(ادیب ستمبر 1965)

ان کے مضامین کی روشنی میں ان کے شعر و ادب کا تصور کچھ اس طرح کا نظر آتا ہے۔

1۔ سچا شاعر چھوٹی چیزوں سے بڑے نتائج نکال لیتا ہے۔

2۔ شعر و ادب کو برجستگی، سلاست، سادگی اور آمد کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی مطالب میں بلندی اور خیالات میں عمق بھی ہونا چاہیے۔

3۔ زندہ ادب وہی ہے جو حق کی طرف بلائے اور صالح لٹریچر یا ادبِ شریف تیار کرے جس کو ہر قوم و ملت کے شریف زادے اور شریف زادیاں پڑھ سکیں اور جس سے تہذیبِ نفس و تزکیہ باطن حاصل ہو سکے۔

4۔افسانہ اور ناول وہی کامیاب اور اہم ہیں جوانسانیت وطنیت کا سچ جذبہ، ایثار، اخلاص، اور خدمت خلق کی صفات پیدا کریں۔

5۔زبان ولغت، روزمرہ محاورہ کی صحت کا خاص اہتمام رکھنا چاہیے۔ پہلوئے ذم اور آورد و تصنع سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

ادب وشاعری کو دشوار پسندی، زیادہ عربی فارسی کے استعمال، فحش وعریانی سے پاک ہونا چاہیے اور واقعہ نگاری اور معنویت سے پر ہونا چاہیے جو بعض حالات میں عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی حال صحافت کا بھی ہے جو خدمت وعبادت ہے نہ کہ تجارت اور وسیلہ منفعت۔

مولانا کے ان خیالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولانا شبلی، اکبرالہ آبادی، حالی، محمد حسین آزاد، رسوا، مہدی اور امداد امام اثر سے متاثر ہیں، سادگی صفائی، سلاست کے ساتھ محاکات، تاثرات، جمالیات اور ادب کے افادی اور اخلاقی تصور کے قائل ہیں۔ وہ ایک ٹھیٹھ روایتی نقاد ہیں اور ان کا زاویۂ نقد اصلاحی اور اخلاقی ہے چنانچہ انہوں نے قصہ گل بکاؤلی، نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق سے حکمت ودانش اور بند ونصائح کشید کیں۔ پریم چند کے ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ”شرافت ان کی تحریر کی جان ہے اور پاکیزگی ان کے قلم کا ایمان۔ منظر کیسا ہی گندا ہو ان کی نظرِ انتخاب ہمیشہ انہی عنصروں کو چن لیتی ہے جو نفس کو نہیں روح کو تڑپائیں اور جذبات کی سفلی نہیں علوی حصے کو گرمائیں اور بدی کو نہیں نیکی کو قوت وحرکت میں لائیں۔“

اسی طرح کی رائے انہوں نے مرزا رسوا کے ناولوں کے بارے میں بھی ظاہر کی ہے۔ ایک اور جگہ مشرق ومغرب کی اصنافِ ادب میں شامل افسانے کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کے بُعد کو واضح کرتے ہیں:

> ”مشرق و مغرب کے افسانوں میں زمین اور آسمان کا فرق

ہوتا ہے۔اصل روح یا اسپرٹ کے لحاظ سے مشرقی ومغربی قصص ایک دوسرے سے محض طرزِ ادا و پیرایہ افسانہ گوئی کی بنا پر ممتاز نہیں ہوتے بلکہ جانِ سخن و مغز کلام کے لحاظ سے بھی بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"جو مشرقی افسانے مہذب جماعت کے نزدیک عامیانہ اور مبتذل سمجھے جاتے ہیں ان میں تلاش کیا جائے تو موعظت واخلاقی تزکیہ نفس وروح کے بے شمار موتی دستیاب ہوں گے بلکہ اکثر ثابت ہوگا کہ مجاز سے پردہ میں پوری داستانِ حقیقت ومعرفت یہاں ہو رہی ہے"۔

مولانا مرحوم نے شاعری کے ساتھ نثری ادب خصوصاً ناول و افسانہ پر خاصی تنقید کی ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر مشرقی ومغربی تصنیفات خاص کر ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ماحول ومعاشرہ کے موثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا، ان کی وسعت نظر اور تنقیدی بصیرت کی داد دیتے ہوئے اردو کے مشہور نقاد سید احتشام حسین نے لکھا ہے:

"ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نظر ڈالتی ہے اس کی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی زہر عشق اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا پر ان کے خیالات ہیں، ان کے فنی اور ادبی محاسن کے ساتھ انہوں نے بخل سے کام نہیں لیا اور ان پہلوؤں کی داد دی جن کے وہ مستحق تھے"۔

(فروغ اردو عبدالماجد دریابادی نمبر ص 100-99)

انہوں نے اکبرالہ آبادی اور اقبال کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھا اور دکھایا۔ وہ ترقی پسندی کے مخالف نہ تھے اور اس کو مانتے تھے کہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے، مگر وہ بے تمیزی اور اخلاقی و مذہبی اقدار کی پامالی و استخفاف نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے پریم چند، علی عباس حسینی، عزیز احمد جیسے ترقی پسندوں کی تعریف کی ہے۔

ان کی تنقید کی ایک اہم خصوصیت ایجاز و اختصار ہے۔ وقت کی کمی اور اپنی علمی مشغولیات کی بنا پر وہ لمبے چوڑے تبصرے نہیں لکھتے تھے، بلکہ 1972 میں تبصروں کی بڑھی ہوئی فرمائشوں اور اصرار سے عاجز آ کر انہوں نے اخبار میں سرے سے تبصرے لکھنا ہی بند کر دیئے صرف رسید کتب کے عنوان سے ایک دو سطریں کتاب یا رسالہ کے متعلق لکھ دیتے۔ اس کتاب میں شامل تبصرے 36، 37 سال کی مدت میں لکھے گئے ہیں اور قدرتاً لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے ان کی سطح ایک سی نہیں اور ہر مصنف کی طرح ان کے افکار و تاثرات کی تبدیلیاں اور اتار چڑھاؤ برابر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا مرحوم بڑے کثیر المطالعہ شخص تھے اور آخر عمر تک وہ طلب و تحصیل علم میں مشغول رہے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی، مغربی تہذیب اور دانش حاضر کے مختلف پہلوؤں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور چند سال کی مدت چھوڑ کر گہرے مذہبی اور راسخ العقیدہ مسلمان رہے اسی لیے ان کی تنقید بڑی حد تک تاثراتی اور روایتی ہے۔ بعض نقادوں مثلاً عبادت بریلوی، نسیم قریشی، ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ نے ان کی قدرت بیان، ذوقی اور وجدانی رجحانات کی داد دی ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام تر مشرقی ہے اور مشرقی اقدار و عظمت کی علم بردار، دورِ جدید کے کچھ مغرب زدہ نقادوں کی طرح وہ مغربی افکار و اقوال سے نہ تو مرعوب ہوتے ہیں اور نہ ان کے حوالوں اور مبہم و مجرد نظریوں سے کوئی اثر قبول کرتے ہیں۔ شاید اسی بنا پر ترقی پسند نقاد ان کی تنقیدات پر منہ بناتے اور اعتراضات کرتے رہے کہ وہ بڑے متشدد مذہبی اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والے انسان ہیں اور قدامت پسندی کی عینک سے ہر ادبی فن پارہ کا تجزیہ و محاکمہ کرتے ہیں۔ ان اعتراضات کے باوجود تنقیدات

ماجدی کے وزن اور اعتبار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب میں ان کے قلم سے لکھے ہوئے 209 تبصرے شامل ہیں جو زیادہ تر انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبارات صدق اور صدق جدید میں شایع کیے۔ صرف دو مفصل تبصرے جن کو مقالات بھی کہا جا سکتا ہے مرزا رسوا کے قصہ کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے اور پریم چند کہیں اور شایع ہوئے ہیں مگر موضوع کی دلچسپی اور اہمیت کے پیش نظر ان کو کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو ریڈیو نشریوں غالب کا فلسفہ اور دلم در عاشقی آوارہ شد کو بھی ان کی ادبی دلآویزی کی بنا پر کتاب میں ضمیموں کی شکل میں شامل کیا گیا ہے۔

ان تبصروں کو مندرجہ ذیل بیس اصناف ادب میں تقسیم کیا گیا ہے:

افسانہ، اقبالیات، تاریخ ادب، تاریخ، تذکرہ، تنقید، حکایت، خاکے، خطوط، داستان، ڈرامہ، روزنامچہ، سفرنامہ، سماجیات، سوانح، شاعری، طنز و مزاح، لغت، مجموعہ مضامین، ناول۔ زیادہ تر تبصرے تنقید، شاعری، ناول اور سوانح کی کتابوں پر کیے گئے ہیں۔ فہرست میں کتاب کا نمبر شمار، صنف، نام، مصنف یا مرتب کا نام اور جس پرچہ میں تبصرہ شایع ہوا ہے اس کا حوالہ اور تاریخ اشاعت درج ہے۔ آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے جس میں ہجی وار مصنفین/مرتبین اور کتابوں کے نام و نمبر شمار دیئے گئے ہیں۔

ان تبصروں میں مرحوم نے جن خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے اختلاف ہونا عین ممکن ہے۔ مگر اس میں ذرا بھی قباحت کا پہلو نہیں۔ ہمارے ادب میں اس طرح کے اختلافات ہر دور میں پائے جاتے ہیں اور میرے خیال میں ادب کے صحت مند ارتقاء کے لیے یہ اختلاف مفید اور باعث رحمت کہا جا سکتا ہے۔ شگفتگی، حسن انشا اور معنویت کے اعتبار سے غالباً یہ تبصرے پڑھنے والوں کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کریں گے۔ کلام اقبال لہو کے پھول، یادوں کی بارات، شیش محل۔ دید و شنید، شبنم، مرزا بلگرامی، پریم چند۔ ایک وضاحت اور ضروری ہے حضرت اکبر پر مولانا

مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے جو ان کی ایک مستقل تصنیف ''اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں'' میں شامل ہیں اس لیے ان تبصروں میں اس کے مشمولہ مضامین شامل نہیں کیے گئے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ان تبصروں میں مولانا نے جو باتیں کہی ہیں اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ دلچسپ، حقیقت افروز اور جچے تلے ہیں۔ایک بالغ النظر نقاد کی طرح وہ محض مدح و تعریف ہی نہیں کرتے بلکہ زیر تبصرہ کتابوں کی لفظی و معنوی فروگزاشتوں اور لغزشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور لکھنے والے یا ترتیب دینے والے کو ہمدردی و اخلاص سے صائب مشورے بھی دیتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔مولانا کے ان تبصروں میں سوز و گداز، عبرت آفرینی اور معنویت کے ساتھ ہی شستہ و سلیس لکھنوی روز مرہ اور محاوروں کا لطف ملتا ہے۔ان کی تحریروں میں آمد، روانی اور بڑے سلیقے سے رعایت لفظی یا ضلع جگت کا استعمال کیا جاتا ہے جس کے وہ بڑے ماہر تھے۔ادب و انشاء کے لحاظ سے یہ نوشتہ جات بڑے قابلِ قدر ہیں۔اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ مولانا مرحوم کے طرز املا کے بارے میں کچھ وضاحت کی جائے۔

مولانا مرحوم صحت زبان، لغت اور روز مرہ کے ساتھ صحیح تلفظ اور املے کا بھی خاص خیال رکھتے تھے چنانچہ اس بارے میں ہندوستان و پاکستان کے اپنے معاصر ماہرین لسانیات جو تقریباً سبھی ان کے دوست تھے برابر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے مثلاً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، شان الحق حقی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رشید حسن خاں، مرزا جعفر علی خاں اثر، گیان چند جین وغیرہ۔

ان تبصروں میں انھوں نے بہت سے عربی الاصل الفاظ بجائے الف کے ہائے مختفی سے لکھے ہیں۔مثلاً خاصہ کافی کے معنی میں ہے، مجموعہ، طبقہ، حصہ وغیرہ۔ان الفاظ کا املا وہ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں یہی برقرار رکھتے ہیں۔ جب کہ ان الفاظ کو الف سے لکھنے کا چلن اردو میں ہو چکا ہے۔

اسی طرح وہ زرا کو بجائے 'ذ' کے 'ز' سے لکھتے تھے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اس معاملے میں تشدد یا سختی کے قائل نہ تھے۔ بس یہ کہہ کر رہ جاتے تھے کہ میں اسی طرح لکھتا ہوں۔ چونکہ وہ خود اہلِ زبان اور صاحب طرز ادیب تھے اس لیے میرے خیال میں ان کا یہ اجتہاد صحیح ہے۔

فروغ اردو کونسل کے پیش رو ترقی اردو بیورو کا مرتبہ ''املا نامہ'' ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا جس کو انھوں نے پسند فرمایا تھا اور اس کے متعلق اپنے ہفتہ وار صدق جدید مورخہ 10 جنوری 1975 میں یہ رائے ظاہر کی تھی۔

'املا نامہ' بڑے کام کی کتاب ہے، فارسی پڑھنے والوں کے لیے جو اہمیت ''آمدنامہ'' کی اور درس قرآن کے لیے ''قاعدہ بغدادی'' کی ہے اسی طرح اردو لکھنے پڑھنے والوں کے لیے املا نامہ کی ہے۔ اس کتاب کو آج سے بہت پہلے وجود میں آجانا چاہیے تھا۔

کونسل برائے فروغ اردو، اس کے دانشور وائس چیئر میں جناب شمس الرحمٰن صاحب فاروقی خاص طور پر شکریہ کے قابل ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو شایع کرنا منظور کیا اور اس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری اس ناچیز کو سونپی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ابوبکر عباد، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر اور محترمہ مسرت جہاں کے مخلصانہ تعاون کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔ مسودہ کی ترتیب کے سلسلے میں مکرمی پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب اور جناب ڈاکٹر ظفر احمد صاحب ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی سے کار آمد عملی مشورے ملے ان کے لیے میں ان دونوں حضرات کا ممنون ہوں۔ اچھی اور صحیح کتابت کے لیے حافظ ابرار احمد صاحب نے خاص اہتمام کیا جس کے لیے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔ خاکسار کو اپنی بے سوادی کا پورا احساس ہے اس لیے کتاب کی ممکنہ خامیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

عبدالعلیم قدوائی
علی گڑھ

صنفِ ادب

(افسانے)

(۱) ناکام

از خواجہ محمد شفیع دہلوی ٹیا محل دہلی

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ محمد شفیع کا نام اب نہ اردو کے طلبہ کے لیے نامانوس رہا ہے نہ ناظرین صدق کے لیے۔ ناکام ان کا تازہ ترین افادہ قلم ہے سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ، گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ اور ہر صورت میں ادب و انشاء کا ایک گنج شائگان۔ زہرہ ایک مشہور بیسوا ہے اور حسین و حاضر جواب مغنیہ۔ اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑ گیا ہے۔ کاظم ذہانت میں فرد، حاضر جوابی میں استاد، ہر رنگ میں رنگا ہوا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے۔ لیکن اپنے کو لیے دیے ہوئے نفس کو قابو میں کیے ہوئے۔ اس کا دل اس کے کہے میں وہ خود دل کے کہے میں نہیں بیسوا نے خوب خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے وہ ظالم ایک بار بھی نہ پھنسا۔ خود شکاری ہی کو شکار کرتا گیا اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت کو چر کے پر چر کے دیتا گیا لفظ و عبارت میں مے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوان حافظ کا ہونے لگے معنی و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل فشانیاں کہ گمان گلستان سعدی کا گزرنے لگے۔ زبان کے جوہر دیکھنے ہوں تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں ایک میراثی سے ملاحظہ ہو۔ رئیس صاحب اپنی بدآوازی پر نازاں سر محفل چنگھاڑ رہے ہیں، ساری محفل ان کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ۔ چوٹیں کاظم اور میراثی کے

درمیان چلنے لگیں۔ ہلکی سی جھلک دیکھتے چلیے۔

میراثی پھیکا پڑ جارہا تھا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے اتار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا "سرکار شانوں سے سر نکل رہے ہیں۔" کاظم نے کہا "عالیجاہ مجسم موسیقی ہیں۔" میراثی نے بہت زور مارا باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا "سرکار شاہ موسیقی ہیں۔" وہ حاضر دماغ بولا "عالی جاہ شہنشاہ موسیقی ہیں لحن داؤدی پائی ہے اس فن کے پیغمبر ہیں۔" میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا دیے اور بولا "تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے۔" کاظم نے عرض کیا بیجو باورے کی روح قدمبوس ہونے آئی ہے۔ اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سُر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ راگ جلو میں حاضر موسیقی دامن سے وابستہ سرکار راجہ اندر میں موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے۔ اعجاز ہے اعجاز۔ شجر و حجر جھوم رہے ہیں مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں۔ سُر نہیں نفس عیسوی ہیں۔" میراثی کچھ بھی ہو میراثی تھا۔ تابڑ توڑ فقرے سن کر تیورا سا گیا جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا اور لگا حال کھیلنے۔ یہ راگ کاظم کے بس کا نہ تھا میدان جاتا نظر آیا۔ بازی ہرتی نظر آئی۔ پر واہ رے دماغ۔ فوراً بولا "سُروں کا زور ہے آگ لگ جائے گی پانی ڈالو۔ جلدی کرو" ساتھ ہی برف کے پانی کا بھرا جگ اٹھا بدنصیب میراثی پر ڈال دیا۔ میراثی حال سے بے حال ہو گیا۔ گھگھی بندھ گئی۔" (49-48)

گنہگار عورت کے دل کی چبھن دیکھنا ہے تو ورق الٹیے۔ بیسوا کے کوٹھے پر کسی نے ایک پراثر قصہ مناسب تمہید کے بعد اکبر کا یہ شعر سنا دیا۔

کون خوش بخت ہے زمانہ میں گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر بیسوا کے تاثرات

"کان یہ سن رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشہ میں غرق تھی۔ ایک عجیب لطف تھا، عجب کھٹک، نرالی

کاوش تھی، اچھوتی خراش میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں، بانجھ اولاد کے خیال میں سینہ میں ایک چیز تھی جو کچھ مانگ رہی تھی پہلو میں ایک خلا تھا جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ میرا ہر قطرہ خون کسی کی تلاش میں رواں۔ میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا۔ آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے کے لیے، ماں بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سُلا دیا گیا تھا۔ آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب وریا اور غلط فضا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا رنڈی کا جامہ چاک کر کے وہ عورت برآمد ہونے کو تھی جو کھونے کو پانا سمجھتی ہے۔ وہ عورت جو اپنا خون چسا کر نسل انسانی کو پالتی ہے۔ عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے۔ عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔ میں آدم وحوا کے نمایندوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج میں فطرت ہی فطرت تھی ماحول سے مبرا فضا سے بالاتر۔ 30؎

غرض کتاب کیا ہے ایک عجوبہ صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی چہرہ پر شوخی وظرافت کی نقاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان۔ بیسویں صدی کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ افسانہ نام کا ''ناکام'' لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

صدق نمبر 40 جلد 7 23 فروری 1942

(2) چند افسانے
از خواجہ محمد شفیع دہلوی
اردو مجلس ٹمیا محل، دہلی

دہلی کے سحر طراز انشاء پرداز اہل زبان خواجہ شفیع سلمہٗ اب اس منزل سے گزر چکے ہیں کہ ان کی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو۔ ان کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے۔ مضمون کے پاکیزہ، شستہ ولطیف ہونے کی ضمانت، زبان کی صحت، سلاست، شیرینی کی دستاویز۔

مجموعہ جی میں آتا ہے اسے گلدستہ کے نام سے پکاریئے۔ اس میں دو نظمیں ہیں اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے۔ پر بہار جیسے موسم گل دلآویز جیسے نغمہ بلبل۔ افسانوں کے پلاٹ کسی مسجد وخانقاہ کے نہیں۔ وہی بازاروں، ہوٹلوں، کالج کے لڑکوں اور بیسواؤں کے کوٹھوں کے۔ لیکن مجال کیا جو دامن خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ فحش وابتذال کا پڑ جائے۔ خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے، گلاس پر گلاس چھلکائیں گے۔ بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔ اور لیبل دیکھ کر جن شیشوں پر جانی واکر (ولایتی شراب کے ایک مشہور وقدیم کارخانے کا نام ہے) کے قدحوں کا گمان تھا وہ شراب طہور کے جام نکلے۔! زبان خاص الخاص دہلی کی مستند اور ٹکسالی اور ادب کا مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب عوام پسند طبقہ میں شامل ہونے کے قابل نہیں۔ اچھی خاصی استعداد اور اردو کے نسبتاً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کو کوئی خاص بات شاید نہ محسوس کر سکیں۔

صدق نمبر 42 جلد 8 مورخہ 8/مارچ 1943

(3) پرانے خدا:

از کرشن چندر ایم اے ۔212 صفحہ، مکتبہ جامعہ نگر، دہلی۔

کرشن چندر، ترقی پسند ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں ایک بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ متانت بیان، شرافت زبان کے لحاظ سے اپنی جماعت بھر میں بہت غنیمت ہیں۔ لیکن گالیاں شاید ان کا تکیۂ کلام بن چکی ہیں۔ ''سالا'' کہہ دینے میں تو انھیں کوئی باک ہی نہیں ہوتا۔ اور کہیں کہیں تو فحش گالیاں تک ان کی تحریروں کا سرمایہ زینت بنی ہوئی ہیں۔ اور جا بجا ''جرکیت'' کا تعفن اور بھبکے تو شاید ترقی پسند کا جزو بھی بن چکے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو غریبوں، مفلسوں، ناداروں کا ہمدرد و وکیل ظاہر کرتے ہیں لیکن اس ہمدردی کا یہ انوکھا طریقہ انھوں نے نکالا ہے کہ ہر بد نظمی، ہر حادثہ کی ذمہ داری خدا کے سر ڈال کر، شان باری تعالیٰ میں دریدہ ذہنی کی وجہ جواز گڑھ لی جائے۔ کتاب کا عنوان پرانے خدا بھی خدا پرستوں کے لیے تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ لیکن کتاب کے اندر تو وہ اس سے کہیں بڑھ کر کھل کھیلے ہیں۔ چنانچہ ص: 162 پر گہر افشاں ہیں:

''میرے اللہ اس سے بہتر مذاق تجھے کبھی نہ سوجھا ہوگا!

ظاہر ہے کہ اللہ سے مخاطب ہو کر یہ فقرہ کسی خدا پرست کو تو سوجھ نہیں سکتا۔ اور جو ایمان کی نعمت سے محروم ہے وہ بیچارہ اللہ کا نام ہی کیوں لینے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فقرہ بازی کی کیا توجیہ و تاویل کی جائے بجز اس کے کہ فقرہ باز کو مقصود ہی خدا پرستوں کی دلآزاری ہو۔

رہی افسانوں کی زبان تو وہ دہلی یا لکھنؤ کی سی تو خیر کیا ہوتی معمولی حد تک بھی صحیح نہیں۔ اور صحیح زبان لکھنے کی تو کہنا چاہیے کہ ان حضرات نے قسم ہی کھا رکھی ہے۔ گویا زبان کا صحیح و بامحاورہ ہونا بھی ترقی پسندی کے منافی اور دلیل رجعت پسندی ہے!

مقدمہ ایک دوسرے ترقی پسند عزیز احمد کے قلم سے ہے جسے پڑھ کر اثر صرف یہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر اپنی زبان کے بہترین افسانہ نویس ہیں۔ اس لیے کہ وہ فلاں فلاں فرنگی افسانہ نگاروں کے کامیاب ترین نقال ہیں! اس مقدمہ میں ایک جگہ اپنے ممدوح کو منشی پریم چند کے قریب پہنچتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ جو پریم چند غریب کو ان بدتمیزیوں کی ہوا بھی لگی ہو۔

صدق جدید، نمبر 29، جلد 1، 25/جون 1951

(4) خلاصہ فسانۂ آزاد

از ابوتمیم فرید آبادی،

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی۔ قیمت ۳ روپے۔

سرشار کی فسانۂ آزاد اردو ادب و افسانہ کی ایک مشہور کتاب ہے لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا مرقع۔ اب ذرا پرانی البتہ ہوگئی ہے۔ 75 سال کا فاصلہ بڑا ہوا۔ اور پھر ضخیم اتنی کہ بیسویں صدی کے وسط میں آدمی کو اس دفتر کو ختم کرنے کی فرصت کہاں سے لائے۔ سید ابوتمیم فرید آبادی بھی کمال کے مرد ظریف و صاحب ذوق لطیف نکلے کہ اس زمانے میں اس دریا کو کوزے میں بند کرنے بیٹھے اور جو سوچتے تھے اسے کر کے دکھادیا یعنی بڑی تقطیع کے کئی ہزار صفحوں کی ضخامت کو چھوٹی تقطیع کے تین سو صفحوں ہی کے اندر سمودیا۔ اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے نہ کوئی حرف بڑھایا نہ کوئی لفظ بدلا۔ بس اتنا کیا کہ جا بجا سے عبارتیں چھانٹتے گئے اور جتنا حصہ حشو و مکررات کا تھا اصل حصہ میں خلل انداز اسے یک قلم نظری کرتے گئے گویا جہاں جہاں جھول تھا اسے دور کر کے چست کردیا اور اب کتاب کو بیسویں صدی کے کم فرصت جلد باز ناظرین کے ہاتھ میں جانے کے قابل بنادیا ______ کتاب پر اگر ایک مقدمہ کا اضافہ ہو جاتا اور جو محاورے اب پرانے ہو گئے ہیں ان پر جا بجا حاشیئے دے دیئے جاتے تو کتاب میں اور بھی چار چاند لگ جاتے۔

صدق جدید نمبر 29 جلد 4 مورخہ 18/ جون 1954

شکستہ کنگورے

(5) از حیات اللہ انصاری صاحب،

210 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ بارہ آنے، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی۔

حیات اللہ صاحب انصاری کی شہرت اس وقت ایک روزنامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک خاصے کہنہ مشق افسانہ نویس بھی ہیں اور پیش نظر کتاب ان کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے افسانہ کا عنوان مجموعہ کا بھی عنوان ہے۔ دو ایک ان میں سے نشر کیے جا چکے ہیں۔

مصنف کا شمار ترقی پسندوں میں ہوتا رہا ہے، لیکن یہ مجموعہ تو اس حسن ظن یا سوءظن کی زیادہ تائید نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ''ترقی پسندی'' کی علامتیں تو اب تک ہمارے ہاں یہی سمجھی گئی ہیں کہ

(1) مصنف مذہب کا مخالف ہو اور اس پر برابر چوٹیں کرتا رہتا ہو ...... مذہب پر کوئی چوٹ اس مجموعہ میں نہیں ملتی۔

(2) قدیم مشرقی اور اسلامی قدروں پر حملے ضرور ہوں، مثلاً دادا جان اور نانی بی بی کا ذکر جب آئے، تضحیک و تحقیر کے لہجے میں اور برقع پوشوں پر آوازہ کشی خوب ہو...... کتاب ترقی پسندی کے اس معیار پر بھی پوری نہیں اترتی۔

(3) کھلم کھلا نہ سہی، تو در پردہ، روسی نظام معاشرت و معیشت کی حمد و ثنا لازمی ہے...... کتاب کے صفحات اس پروپیگنڈے سے بھی خالی ہیں۔

(4) کچھ فحش فقرے ضرور ہوں اور بے حیائی، بے حیائی ہی کی غرض سے ہو...... کتاب اس حیثیت سے صفر محض ہے۔

(5) گندی گھناؤنی باتوں کا ذکر بھی جس سے طبیعت مالش کرنے لگے لوازم میں سے ہے۔ صرف ایک افسانہ بھیک میں اس ہنر کی کچھ جھلکیاں موجود ہیں۔

غرض کتاب اگر ترقی پسندی کی حد میں رکھی بھی جائے تو کچھ یوں ہی سی رہے گی اور شاید تیسرے چوتھے نمبر پر نکلے گی۔ افسانہ نویس کا قلم گاندھی جی کی تحریکات سے خاص طور پر متاثر ہے بلکہ وہ بڑی حد تک انھیں تحریکات کا مبلغ بھی ہے۔ پلاٹ جتنے ہیں سب گھریلو زندگی سے متعلق ہیں۔ سیاسی، اخلاقی، معاشرتی چاشنی پوری طور پر لیتے ہوئے۔

افسانہ ''ماں بیٹا'' سب سے بڑا ہے، جو 1947 کے خونریز ہنگاموں اور ہولناک فسادات سے متعلق ہے۔ اور یہی افسانہ فنکار کی بہترین قابلیت کا بھی مظہر ہے اور شاید اس کے معائب کا بھی۔ اس کے بعض حصے اس درجہ موثر ہیں کہ سنگدل انسان بھی انھیں آنسوؤں کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ اور رقیق القلب عورتیں تو عجب نہیں جو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ یہ تو ہوا اسکا ہنر۔ اور عیب یہ کہ افسانہ نویس خود اپنے جوش تاثر کا شکار ہو کر جا بجا کھلم کھلا واعظ یا مصلح بن گیا ہے۔

مصنف خاص لکھنؤ کے ہیں۔ چاہیے یہ تھا کہ زبان بھی خالص لکھنوی ہوتی۔ خیر ایسا تو نہیں۔ لیکن یہی بہت غنیمت ہے کہ زیادہ ہندیائی ہوئی نہیں۔ عموماً صحیح و بامحاورہ کہیں کہیں انگریزیت البتہ غالب آ گئی ہے، یعنی انگریزی ترکیبیں اور انگریزی محاوروں کے ترجمے اور کہیں کہیں ایسے ایسے خلاف فصاحت محاورے بھی استعمال ہو گئے ہیں جیسے تانین اڑانا ''تانیں لینا'' کی جگہ ''تانیں مارنا'' بھینس کے پڑدے کے بجائے ''بھینس کا بچھڑا'' توجہ کرنے کے بجائے ''توجہ دینا''۔

ص: 142 پر ایک لڑکی کی شادی کے موقع پر مردانہ کا نقشہ لڑکی کی زبان سے کھینچا ہے۔ یہ کچھ زیادہ مناسب نہ تھا۔ لڑکی کی زبان سے جو دلہن پسینہ میں شرابور ایک کوٹھری میں منہ ڈھکے لیٹی تھی۔ ص: 143، اگر منظر کشی کرنا تھی، تو زنانہ کی کرنا تھی۔ اسے ''پلاؤ کی دیگ'' اور دودھ کے گھڑے اور مردانہ میں بفاتی اور کلو اور رمضانی کی چیخ پکار کے بجائے اپنی سہیلیوں کی شوخی وشرارت اور نائن اور ڈومنی یا میراسن کی گلخپ اور نصیبن اور رسولن کے چاؤں چاؤں کی تصویر کھینچنا تھی...... مصنف کی بصیرت فطرت

بشری سے متعلق بہت گہری نہ سہی، پھر بھی کچھ ایسی سطحی بھی نہیں، فی الجملہ بہت غنیمت ہے۔ مصنف اس نکتہ کو بھی خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ فسادات کے زخموں کو تازہ رکھنا اور انھیں کریدتے رہنا ہرگز کوئی انسانی خدمت نہیں، ضرورت تو ان پر مرہم رکھنے کی ہے۔ مصنف کی مذہبیت تفریق یا توڑ پھوڑ والی بھی نہیں۔ اصلاحی اور گاندھی جی کے رنگ کی ہے۔

صدق جدید، نمبر 31، جلد 6، 22 جون 1956

(6) فسانۂ عبرت:
از رجب علی بیگ سرور،
مرتبہ: سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، 128 صفحہ، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ۔ (رزم نامہ انیس)

رزم نامہ انیس

(1) سید مسعود حسن رضوی اس وقت شاید میر انیس کے کلام کے بہترین شارح و ترجمان اور ان کی عظمت و ناموری کے عظیم ترین نقیب ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کا تازہ ترین افادہ یہ ہے کہ انھوں نے انیس کے سیکڑوں مرثیوں سے چھانٹ کر ایک مسلسل اور خاصی طویل، رزمیہ نظم مرتب کر دی ہے (گو یہ کام ایک محدود معنی میں اس کے قبل منشی منظور علی صاحب علوی کاکوروی کے ہاتھوں انجام پا چکا تھا) یہ کام اس نوک پلک کے ساتھ انجام دینا کہ نہ انیس کی عظمت پر کہیں سے حرف آنے پائے اور نہ کلام میں کہیں سے جھول پیدا ہونے پائے، آسان نہ تھا۔ اس کی ہمت وہی کر سکتا تھا، جو ایک طرف نفسیات بشری کی این و آن کا رمز شناس ہو، دوسری طرف شعر و ادب کی نزاکتوں پر نظر رکھتا ہو اور تیسری طرف کلام انیس کا حافظ ہو اور حافظ کیا معنی یہ کہیے کہ کلام انیس اس کے رگ و ریشہ میں بس چکا ہو۔ یہ مرتب صاحب ٹھہرے ان ساری شرطوں کے جامع، قدرۃً ان کے ہاتھوں کام اس حد کو پہنچ گیا جو اس کے پہنچنے کا حق تھا۔

مرتب کو جیسے جیسے پاپڑ اس کے لیے بیلنے پڑے اس کی داستان خود ان کی زبان سے سنیے:

مختلف مضمونوں اور مختلف فضاؤں کے مرثیوں سے اقتباسات لے کر یہ رزم نامہ اس شرط کے ساتھ تیار کرنا تھا کہ اس اجزاء میں کہیں تضاد، تناقص یا عدم مطابقت کا احساس نہ ہو اور اس کی فضا میں کیفیات کی گونا گوئی جذبات کی بوقلمونی اور مناظر کی

رنگارنگی کے باوجود ایک عام یک رنگی اور ہمواری قائم رہے۔ یہ شرط پوری کرنے کی غرض سے کہیں کسی بیان کی جگہ بدل گئی۔ کہیں ایک بیان کے اندر بندوں کی اور ایک بند کے اندر مصرعوں کی ترتیب بدل گئی۔ کہیں ایک بند کے چار مصرعے نکی جگہ کسی دوسرے مصرعے کو دی گئی۔ کسی بند کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھتے وقت ربط کلام اور مناسب مقام کے تقاضے سے کبھی کبھی ایک دو لفظ اور دو چار جگہ جہاں اور کوئی صورت ممکن نہ تھی کوئی پورا مصرعہ بدلنا پڑا۔ غرض ہر ممکن ذریعے سے کوشش کی گئی ہے، کہ متفرق اجزاء کا ایسا مجموعہ پیش کیا جائے جس میں جوڑ پیوند دکھائی نہ دیں''۔

انیس کے کلام میں اتنے تصرف کا بھی دل گردہ وہی لا سکتے تھے اور اس کا حق بھی انھیں کو پہنچ سکتا تھا۔

رزم نامہ اب ایک مرتب و مکمل شکل میں ہے اور اس سے جتنا کمال اصل شاعر کا نکلتا، اس سے کچھ ایسا دب کر پلہ مرتب کا بھی نہیں رہتا۔

کتاب ولادت، سوال بیعت، سفر، آخری منزل سفر، شب عاشورا، صبح عاشورا، روز عاشورا وغیرہ بہت سے عنوانات کے ماتحت تقسیم ہے اور پھر ہر عنوان کے جلو میں بہت سے تحتانی عنوان، گویا معرکۂ کربلا کا ہو بہو، مو بہ مو نقشہ، ایک صاحب فن کے قلم عقیدت رقم سے اور شروع میں خوب مفصل فہرست مضامین الگ - ایک انیس دوست وانیس پسند پڑھنے والے کو اپنی تسکین ذوق کے لیے اور چاہیے کیا۔

معتقدوں کے دلوں پر جو کچھ گزرتی ہوگی، خیر وہ تو ہئی ہے، شاعری کی ساحری یہ ہے کہ تبصرہ نگار جو مرثیوں کی تاریخیت کا ذرا بھی قائل نہیں کبھی تو درد و گداز کے موقع پر، آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کبھی منظر کشی کے وقت یا شجاعت وسپہ گری کے بیان میں بے اختیار داد و تحسین کے کلمے زبان پر لے آیا۔ اور لطف زبان کا تو خیر کہنا ہی کیا! - ماہر فن کی چابک دستی، عقائد و تاریخ دونوں کے عالم سے ماورا ہوتی ہے۔

(2) فسانۂ عبرت بہ ظاہر تاریخ کی کتاب ہے۔ اودھ کے آخری چار بادشاہوں نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد کے اس میں

حالات ہیں۔ فسانۂ عجائب کے بہت بعد کی ہے۔ سرور کا انتقال 1282ھ میں ہوا۔ اور یہ غالباً 1278ھ میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اب تاریخ سے کہیں بڑھ کر ادب و انشاء کی کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ایک زمانہ میں چھپی تھی، مگر اب کمیاب کیا، نایاب ہی ہوگئی تھی، سید مسعود حسن صاحب نے محنت کر کے اسے پھر سے چھاپا۔ ''محنت'' اس معنی میں کہ اس کی نئی ترتیب و تہذیب، حذف و ترمیم میں انھیں وقت خاصہ صرف کرنا پڑا۔

انشائے رنگین و عبارت بہار آفریں کا اندازہ ذیل کے چھوٹے سے نمونے سے کیجئے۔ سرور آخر سرور ہیں۔ ذکر محمد علی شاہ کے تیار کرائے ہوئے امام باڑے کا ہے۔

......شیشہ آلات اس قدر ہے کہ حلب والے حیرت سے منہ تکتے ہیں۔ حیران ہیں، جھاڑوں کی یہ کثرت ہے کہ ساکنان فرنگ ہاتھ جھاڑ بیٹھے۔ سر در گریباں ہیں۔ قندیل بے عدیل سونے چاندی کی جواہر نگار، ہزار در ہزار علمہائے نادر، جن کے دیکھنے سے الم آل عباس ہو، خلاصہ یہ کہ امام باڑہ ہو تو ایسا ہو۔ صحن میں حوض مصفا پانی سے ملبّب بھرا، تشنگی اہل بیت کی لہروں سے یاد دلواتا، ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کس چیز کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں۔ (ص:44)

6 صفحہ کا دیباچہ بجائے خود دلآویز ہے۔

صدق جدید، نمبر 35، جلد 8، یکم اگست 1958

۱۱۱۵

صنف ادب (اقبالیات)

(7) ضرب کلیم
از علامہ اقبال

طلوع اسلام میکلورڈ روڈ لاہور۔

اقبال مسلمانوں کی قوم کے حکیم اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے حکمت و شاعری پختہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ ''خام'' تو کبھی بھی نہ تھی۔ شاعری سے مراد رسمی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ مراد وہ شاعری ہے جو رومیؒ کی تھی سنائی کی تھی۔ وہ شاعری نہیں جو حق سے بھگاتی اور بھٹکاتی ہے وہ شاعری ہے جو حق کی طرف بلاتی، لاتی ہے۔

اقبال کا پیام ساری دنیا کے لئے ہے دنیائے اسلام کے لئے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے لیکن حقیقتاً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا درد دل سنانا تو سب ہی کو چاہتے ہیں، لیکن سنتے وہی ہیں جو پہلے سے اقبال کے خدا کی، اقبال کے رسول کی سن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت کچھ فارسی میں کہہ چکے ہیں۔ بہت کچھ اردو میں کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام ضرب کلیم ہے۔ زبان اردو ضخامت 182 صفحات۔ طباعت صاف و روشن، قیمت درج نہیں جو کچھ بھی ہے بہر حال کتاب کی معنویت سے کم تر ہی ہوگی۔ عصائے موسیٰ کی قیمت کا اندازہ کوئی صاحب کیا یوں بھی فرمائیں گے کہ اتنے فٹ لمبی اور اتنے انچ موٹی۔ جنگل کی لکڑی کا مول تول بازار میں کیا ہے۔

بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ امت میں کس زمانے کے لوگ بہتر ہوں

گے۔ سرور سردار کی زبان سے ارشاد ہوا کہ میری امت کی مثال تو بارش کے قطروں کی سی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے قطرے بہتر رہے یا پچھلے۔ اقبال کا کلام بھی مسلسل باران رحمت سے کم نہیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ بہتر کسے کہیے اور کسے نہ کہیے اور اگر کسی کو اعلیٰ و بلند ٹھہرا بھی لیجیے اور اس کے مقابل آخر ادنیٰ و پست کسے ٹھہرایئے! جب جو کلام سامنے آ گیا، دل نے کہا یہی خوب اور خوب تر۔ جب کسی دوسرے کلام پر نظر پڑی تو اب قوت فیصلہ مغلوب نگاہ انتخاب حیران!۔ یہ اور بات ہے کہ انتخاب کی حیثیتیں ہی شروع سے مختلف ٹھہرا لیجیے اور اس لحاظ سے فیصلہ کر دیجیے کہ شوخی و برجستگی فلاں میں زیادہ ہے، عمق میں فلاں بڑھا ہوا ہے، درد و گداز میں فلاں کا نمبر اول ہے وقس علیٰ ہذا۔

ضرب کلیم کا وصف امتیاز حکیمانہ ژرف نگاری ہے۔ ہر عنوان دقت نظر کا ایک مرقع ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ۔ بات وہی ایک ساڑھے تیرہ سو برس کی پرانی بلکہ اس سے بھی ہزاروں سال قبل کی، بات کہنے کے ڈھنگ نئے نئے اور عنوانات جدا جدا۔ بات میں کشش ایک تو ہر فطرت سلیم والے کے لیے ذاتی موجود اور پھر کہنے والے کی زبان میں موہنی۔ کتاب قدرتاً دلچسپ اس قدر ہو گئی کہ ایک بار شروع کر کے ختم کرنے کو جی نہ چاہے اور پڑھتے پڑھتے جب آخری صفحہ پر پہنچے تو دل میں یہ حسرت ہی رہ جائے کہ محفل برخاست اتنی جلد کیوں ہو گئی! وہی روئے گل کے سیر ہو کر نہ دیکھے اور موسم بہار کے ختم ہو جانے کا پرانا دکھڑا!

گھر کے بھید گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بت کدہ آذر پر تیشہء ابراہیمی سے بڑھ کر کس کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسم افرنگ کو توڑنے کے لیے خود اقبال سے بڑھ کر کون ملے گا۔ اسی طلسم کدہ کا پروردہ۔ اسی میکدے کا سرشار۔

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — راز دانِ دانشِ تو بودم ام
باغبانم امتحانم کردہ اند — محرمِ این گلستانم کردہ اند
مدتے با لالہ رویان ساختم — عشق با مرغولہ مویان یافتم

کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجیے ایک ہی چمن کی گلکاریاں نظر آئیں گی۔ قوت اگر بے دینوں کے ہاتھ میں ہے تو دنیا کو نمونہ جہنم بنانے کے لئے کافی ہے۔ وہی قوت اگر حق پرستوں کے ہاتھ میں ہے تو جنت کی رہبر۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
اس سیل سبک سیر و زمین گیر کے آگے — عقل و نظر علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

شیخ جد ید کا فتویٰ ہے کہ اب جہاد بالسیف کو منسوخ سمجھو اب تو صرف قلم کافی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جہادِ سیفی کی منسوخی کے اعلان کا بھلا اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے کیا محل ہے۔

تیغ و تفنگ دست مسلمان میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل میں موت کی لذت سے بے خبر

اور ہائے ذرا دل کو پکڑ کو سنئے۔

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت ہے

اب تو

تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے خال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

اس دوسرے مصرعہ 'یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر' کو مکرر پڑھے بغیر، اس سے لطف لیے بغیر آگے بڑھ جانا عین ظلم ہے۔ ظلم شاعری ہی پر نہیں خود پڑھنے والے کے ذوق سلیم پر۔

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ یورپ سے در گذر

جس لفظی طلسم بندی کا نام یونان نے کبھی اور یورپ نے آج بھی فلسفہ رکھا ہے کہتے ہیں کہ وہ نو جوانوں کے دلوں میں مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے، اس کی حقیقت کوئی اس کے دل سے پوچھے جو خود ان گلیوں کی خوب خاک چھاننے پڑا ہو۔

شاعر آج نہ سہی چند سال پہلے اُدھر تو آخر نوجوان تھا اور انہیں ڈگریوں، امتحانوں اور پروفیسروں کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا چکا ہے۔

معلوم ہے مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی　　مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گذر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　غواص کو مطلب ہے صدف سے نہ گہر سے

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

ہنگامہ برپا ہے کہ مسلمان زمانے کا ساتھ نہیں دیتے، اسی لیے برباد ہو جاتے ہیں۔ مٹے جاتے ہیں۔ حکیم امت کہتا ہے کہ نادانوں ذرا حواس درست کر کے زبان کھولو۔ مومن کو تم نے پہچانا کیا ہے۔ زمانہ کے آگے سجدہ پرستش میں گر پڑنا یہ تو کافروں کا شعار ہے۔ مومن کا کام زمانے کے ساتھ چلنا نہیں اسے اپنے ساتھ چلانا ہے۔ مومن زمانہ کا محکوم بننے کے لئے نہیں اس پر حاکم بننے کے لئے آیا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مومن کو فرشِ خاک کے بسنے والے خاک کے پتلوں نے پہچانا کہاں ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن　　حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

(ص4)

رہا تمدن اسلامی، سو اس کی حقیقت ہر قسم کی جوگیانہ زندگی اور ہر قسم کے اوباشانہ تعیش دونوں سے کہیں مختلف اور بالاتر ہے۔

نہ اس میں عصر رواں کی جہاں سے بیزاری　　نہ اس میں عہد کہن کا فسانہ وافسوں

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم فلاطون

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال　　عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

غلامی کی حالت میں رہ کر غلامی پر قانع رہ کر نبوت کی تبلیغ بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ صاحب الہام اگر آزاد ہے تو دیکھتے دیکھتے انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارتِ گر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز!

اب 'خود آگاہ' اور 'خدا مست' کی ترکیبیں کہیں حکیم مومن خاں دہلوی کے قلم سے نکل گئی ہوتیں تو آج ان کی شہرت میں، نیک نامی میں، ان کے کمال فن میں چار چاند لگ گئے ہوتے۔ اقبال غریب 'پنجابی' اور سیال کوٹی ہو کر ایسی قسمت کہاں سے لا سکتا ہے۔ یہی ترکیبیں آج خدا جانے کیسے کیسے 'نقادانِ فن' کو ہفتوں اور مہینوں دعوتِ تمسخر دیتی رہیں گی۔

محمد علیؒ کی زبان سے یہ مقولہ بارہا سننے میں آیا تھا کہ انسان کو خدا نے پیدا کیا اور اقوام کو شیطان نے اقبال کا کہنا ہے کہ بصیرت ہو تو سوچو کہاں مکہ کا پیغام اور کہاں جنیوا کا اقدام!

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریقِ ملل حکمت افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم
(ص55)

اکبر مرحوم فرمایا کرتے تھے عین بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو۔

اطاعت و پابندی تو بڑے سے بڑے ملحد، بڑے سے بڑے منکر کو بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں ایک لمحہ ایک آن کے لیے بھی چارہ نہیں، سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ پابندی کس کی کرنی منظور ہے؟ پابندیِ تقدیر کہ پابندی احکام؟ احکام تشریعی کی یا احکام تکوینی کی؟ جواب ترجمان حقیقت کی زبان سے سنئے اور داد دل ہی دل میں جتنی دیر تک چاہیے دیتے رہئے۔

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اپنے ہاں اسکول میں، کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں جس قسم کے نصاب

رائج ہیں جو جذبات ان درسگاہوں مین بیدار کیے جاتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے نام سے جس قسم کا تصورذہنیتوں میں جمع کر دیا گیا ہے ان سب کا جائزہ لے کر اقبال کی حقیقت نگاہی پر نظر کیجیے۔

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے مموں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علم نباتات

(ص77)

تہذیب جدید کا ایک خاص مظہر رقص ہے رقص آپ کے ہاں 'ارباب نشاط' والا نہیں، مردانہ اور زنانہ 'طائفوں' والا نہیں، بھانڈوں اور بیسواؤں والا نہیں بلکہ وہ ناچ جس میں 'صاحب' اور 'میم صاحب' مل کر غیروں کے جسم سے جسم ملا کر میم صاحب نیم برہنہ طرح طرح سے تھرکتے ہیں مٹکتے ہیں اور جب تھکنے لگتے ہیں تو چھلکتے ہوئے جام سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس منظر کو دیکھ کر اپنے ہم قوموں سے کہتے ہیں۔

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللہی
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن — صلہ اس رقص کا درویشی و شہنشہی

(ص135)

اکبرؒ نے کہا تھا کہ اگلوں کی تلوار تو جسم ہی کو کاٹ کر رکھتی ہے یہ کمال جدید حربہ تعلیم کا ہے کہ قالب وہی رہے روح کچھ سے کچھ ہو جائے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال نے اسی راز کو ایک لارڈ صاحب (لُرد) کی زبان سے فاش کیا ہے۔

اک لُرد فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — کرتے نہیں محکوم کو بھی تیغوں سے زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بہتر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے ایک ڈھیر

(ص157)

اقبال کو آپ نے اپنوں ہی کی زبان سے یہ بارہا سنا ہوگا کہ ایک سرکاری آدمی ہیں عہدہ کے حریص خطاب کے بھوکے اب ذرا اس حکومت کے آدمی کی زبان سے ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، سنئے ۔

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں　　زناریوں کو دیر و کہن سے نکال دو

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا　　روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات　　اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج　　ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو　　آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

ملکِ شام کی عظمت سے آپ واقف ہیں؟ دوسرے پیغمبروں کو چھوڑیے مسیحؑ کو تو یورپ پیمبر نہیں خدا کا اکلوتا بیٹا (نعوذ باللہ) تسلیم کرتا ہے مسیحؑ کا وطن یہی تھا۔ آج جب سے یورپ کے مسیحیوں کے قدم یہاں جمے ہیں تہذیب وتمدن کی تمام ''برکتوں'' کا اعلانیہ ظہور ہونے لگا ہے۔ برملا بے حیائی، بدچلنی اور کھلے خزانہ قمار بازی اور بدمستی، تفتہ جگر شاعر اس منظر کو دیکھتا ہے اور اسے دیکھ کر آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتا ہے ۔

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا　　نبی و عفت و غم خواری و کم آزاری

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے　　مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

(ص150)

سوریا ملکِ شام کو کہتے ہیں انگریزی میں Syria

بعض بعض شعر، بعض شعروں کے مصرعے، بعض مصرعوں کے ٹکڑے تو معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کی نہیں الہام کی پیداوار ہیں اور اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر سنبھلے ہوئے اور خودی کا سرشتہ ہاتھ سے چھوڑ بے خود نہیں ہونے پاتے ۔

آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ہند کے شاعر، صورت گرو افسانہ نویس

اس ایک مصرعہ کے آئینے میں ہمارے کتنے ادیبوں، کتنے افسانہ نویسوں اور کتنے شاعروں کی پوری شکل دکھادی۔

تمدنِ افرنگ کا عطر دو لفظوں میں اس سے بہتر، اس سے صحیح تر، اس سے جامع تر، اس سے مؤثر تر آج تک تو کسی نے پیش کیا نہیں۔ ع

مرد بیکار و زن تہی آغوش

شرح میں دفتر کے دفتر چاہے لکھتے جایئے۔

صدق نمبر 17 جلد نمبر 2 مورخہ 11/اکتوبر 1936

(8) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق معہ مثنوی مسافر
از علامہ اقبال

طلوع اسلام لاہور۔

اقبال کی ایک تازہ اور ایک کسی قدر قدیم دو فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ اقبال کے کلام کی مدح وتوصیف میں اب کچھ کہنا شاعر سے زیادہ خود اپنی سخن فہمی کا اعلان کرنا ہے اور اپنی جوہر شناسی کا اشتہار دینا ہے۔ آفتاب کے روشن ہونے میں اگر آپ شہادت دے رہے ہیں تو یہ ثبوت تو آفتاب کی روشنی سے بڑھ کر خود آپ کی بصارت کے صحیح وتندرست ہونے کے حق میں ہے۔ بقول حضرت رومی ؎

ایں دو چشم روشن و نا مرسدست مادح خورشید مداح خود است

نام کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے اور ایک ہی موضوع لے دے کے اب اقبال کے پاس رہ گیا ہے۔ پرانے ہونے پر ہمیشہ نیا! کثرت کے باوجود ہردم تازہ اور شگفتہ! عشق گننے میں ایک، کیفیات عشق ہر روز جدید، لذات عشق ہر لحہ مزید!

زبان فارسی لیکن اتنی سلیس کہ گویا اچھے پڑھے لکھوں کی اردو۔ کوئی لفظ ذرا سا بھی مشکل یا نامانوسِ لغت اگر آ گیا تو اس کا حل وہیں حاشیہ میں موجود۔ شروع ہی میں پڑھنے والے سے فرماتے ہیں کہ ہوش وخرد نے حرم میں بغاوت بپا کر رکھی تھی میں اس کے لیے دیارِ عشق سے لشکرِ جرار لے کر آ رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ عقل کے لیے یوم الحساب ہے ہی نہیں۔

نگاہ بندۂ مومن قیامتِ خرد است!

تمہید کا آغاز جس نام نامی سے ہوتا ہے اس سے دنیائے عشق میں کون نا واقف ہے؟

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر

نورِ قرآں درمیان سینہ اش　　جام جم شرمندہ از آئینہ اش

مرشد کی روحانیت مکشوف ہو کر اقبال سے کہتی ہے۔

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ　　کس نکو ننشست در نار فرنگ

باش مانند خلیل اللہ مست　　ہر کہن بت خانہ را باید شکست

عمر تو از رمز جاں آگاہ نیست　　دین او جز حبِّ غیر اللہ نیست

سرِّ شیریں را نہ فہمد گاؤ و میش　　جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

با حریفِ سفلہ نتواں خورد مے　　گرچہ باشد بادشاہِ روم و رے

یوسف مارا اگر گرگے برد　　بہ کہ مردے نا کسے اورا خرد

معنیِ دین و سیاست باز گوئے　　اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

ساری مثنوی اسی پیام کی شرح و تفصیل میں ہے 'حکمت کلیمی' وحکمت فرعونی کے بعد ایک عنوان لا الہ الا اللہ ہے۔ اس کے تحت میں فرماتے ہیں کہ لا جلال ہے الا جمال۔ لا نفی۔ الا اثبات۔ لا نیستی۔ الا ہستی۔ سارا نظام کائنات انہیں دو حرفوں کی قوتِ عمل کا تماشا گاہ ہے۔ ابتدا لا ہی سے کرنی چاہئے اور غیر اللہ کے مقابلے میں وظیفۂ حیات اسی کو بنانا چاہئے۔

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون　　حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

در جہاں آغازِ کار از حرف لاست　　ایں نخستین منزلِ مردِ خداست

پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامہء او کائنات

آگے ایام عرب سے گزرتے ہوئے دور حاضر کے سرمایہ سوز روس تک پہنچ جاتے ہیں اور ذرا دیکھئے اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہمچناں بینی کہ در دور فرنگ　　بندگی بخواجگی آمد بجنگ

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطین لا کلیسا لا الہ

فکر اودر تند باد لا نماند　　مرکبِ خود را سوئے اِلّا نماند

انجام جو ہونا ہے ظاہر ہے۔

آیدش روزے کہ از زور جنون — خویش را زین کند باد آرد برون

اس لیے کہ ۔

در مقامِ لا نیا ساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

اقبال کے سردار و آقا نے تو یہ فرمایا تھا کہ کل روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ ہے اور کہاں اب یہ دیکھنا پڑتا ہے یہ مسجد اپنوں کے نہیں بلکہ بیگانوں کے قبضہ میں ہے ۔

مومنان را گفت آں سلطانِ دین — مسجدِ من این ہمہ روئے زمین

الامان از گردش نُہ آسمان — مسجد مومن بدست دیگران

دوسروں کا فقر رہبانیت اور بھوگ ہے ۔ مومن کا فقر تو عین بادشاہی و حکمرانی ہے ۔

فقر قرآن احتساب ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود

فقر مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

فقر کافر خلوتِ دشت و در است — فقرِ مومن مرزہ بحر و بر است

فقر چون عریاں شود زیرِ سپہر — از او بلرزد ماہ و مہر

فقر عریاں گرمی بدر و حنین — فقرِ عریاں بانگ تکبیر حسینؓ

زمانے نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور عصر حاضر سے مقابلہ کے وقت ہم نے کیسی پہلی ہی باری میں اپنی ہی ہار مان لی، اس کا ایک جلوہ اس آئینہ میں ملاحظہ ہو ۔

اے تہی از ذوق و شوق و درد — می شناسی عصرِ ما باما چہ کرد

سوزِ دل از میان سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

عصرِ مارا از ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد

باطن این عصر را نشناختی — داد اول خویش زرا حاجتی ....

تہذیب فرنگ کی مصوری اقبال خدا جانے کتنی بار کر چکے ہیں لیکن ہر نیا نقش

اپنی دل آویزی میں پچھلے نقوش سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا ہے۔ ص 56 تا 63۔ ایک طویل نظم کا عنوان وہی ہے جو کتاب کا ہے پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

آدمیت زار نالید از فرنگ　　تا کجا در قید زنار فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد　　زیر گردوں رسم لا دینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برہ　　ہر زماں اندر مکینِ برہ
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش　　در ہلاکِ نوع انساں سخت کوش
آہ از افرنگ و از آئینِ او　　آہ از اندیشہء را دینِ او
علم حق را ساحری آموختند　　ساحری نے کافری آموختند
اے کہ جاں را باز می دانی زمن　　سحرِ این تہذیبِ لادینی شکن

ردّ بلا تو مومن کے اپنے ہاتھ میں ہے مومن اگر اپنے ایمان پر جم جائے اور اپنی خودداری پر ثابت قدم رہ جائے تو سارا طلسم آناً فاناً ٹوٹ کے رہ جاتا ہے۔

دانی از افرنگ واز کارِ افرنگ　　تا کجا در قید زنارِ فرنگ
زخم از نشتر او و سوزن از او　　ما جوئے خون وامید رفو
خفتہ دکانِ شریک تخت و تاج　　از تجارت نفع از شاہی خراج
کشتن بے حرب وضرب آئین اوست　　مرگہا در گردش ما شین اوست
بے نیاز از کارگاہ او گزر　　در زمستان پوستین او مخر
ہوشمندے از خمِ او مے نخورد　　ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ برد
وقت سودا قند قند و کم خروش　　ما چو طفلانیم و او شکر فروش

اقتباسات بہت ہو گئے۔ جبر کر کے قلم روکنا پڑتا ہے ورنہ اگر طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو شاید ساری کتاب بھی اول سے آخر تک نقل ہو کر رہے۔ ''اللہ مست'' ''مُلا صفات۔ خُود گداز'' اور اس قسم کی حسین ترکیبیں تو اقبال کا حصہ ہو چکی ہیں۔ ان پر کچھ کہنا تحصیل لا حاصل ہے۔

دوسری مثنوی مسافر کے نام سے ہے۔ پہلا ایڈیشن 1934 میں تھوڑی ہی تعداد میں نکلا تھا اس لئے زیادہ پھیل نہ سکا۔ دنیا کے لئے کہنا چاہئے کہ یہ مثنوی بھی نئی ہی ہے۔ اقبال نادرشاہ شہید کی دعوت پر معہ مولانا سید سلیمان ندوی اور سرراس مسعود کے 1933 میں کابل گئے تھے۔ واپسی پر اپنے تاثرات اس مثنوی میں جمع کر دیئے ہیں اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل باتیں تھیں سب کہہ ڈالی ہیں۔ نادر کون؟ مدح و وصف کے شعر بہت سنے ہوں گے۔ ذرا تعارف نامہ کا ایک شعر اقبال کی زبان سے سنئے ۔

خسروئے شمشیر و درویشی نگہ   ہر دو گوہر از محیطِ لا الہ

اس سفر میں اقبال شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں اور کس رنگ و بو کا گل عقیدت مزار پر چڑھاتے ہیں ۔

خوشا نصیب کہ خاک تو آرامید این جا   کہ این زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است

غزنی میں حکیم سنائی کی قبر پر جا کر مراقب ہوتے ہیں اور بہشت بریں سے صدا سنتے ہیں ۔

دینِ تو اندر کتب اے بے خبر   علم و حکمت از کتب دین از نظر

مزار سلطان محمودؒ پر جو کچھ گزری، ویرانہ غزنی میں مناجات پڑھنے والے نے کیا دیکھا اور کیا سنا اور کیا کہا اس قسم کے سارے دلکش منظروں کے لئے تو اصل کتاب کو ملاحظہ فرمایئے۔ آخر میں صرف اتنا اور سن لیجئے کہ اقبال کو شاہ شہیدؒ کی اقتدا میں نماز عصر پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ آہ! کہاں وہ ایک نماز شاہ اسلام کے پیچھے اور کہاں دوسری صدہا نمازیں! شاعر اگر ان مقامات کی شرح کرنا چاہے بھی تو بیان پر قدرت کہاں لاسکتا ہے۔ مجبوراً بس اتنی سی کسک دلوں میں پیدا کر کے رہ جاتا ہے ۔

راز ہائے آن قیام و آں سجود   جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود

صدق نمبر 23 جلد 2 مورخہ 11/ دسمبر 1936

(9) اقبال کا تصور زمان و مکان

از ڈاکٹر رضی الدین صاحب

ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد

زمان و مکان کے مسائل فلسفہ و قدیم دونوں کے اہم ترین عنوانات میں سے ہیں یونان و فرنگستان دونوں جگہ فلسفہ اور الٰہیات کے علماء نے ان پر بہت کچھ لکھ ڈالا ہے اور متکلمین کو بھی بادل نخواستہ ان بحثوں میں پورا حصہ لینا پڑا ہے اقبال کو بھی اپنی منظومات نیز مقالات میں ان منزلوں سے گزرنا ناگزیر تھا اب دنیائے اسلام کے شاید سب سے بڑے مسلم سائنٹسٹ ''ڈاکٹر رضی الدین صاحب نوبل پرائز پانے والے نے اقبال کے نظریات پر گفتگو کی ہے اور جو حقیقتیں کہنا چاہیے کہ نا قابل فہم ہیں انہیں بڑی حد تک قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے کتاب خالص علمی ہے اور مسائل اتنے دقیق کہ عوام کیا اکثر خواص کی دسترس سے بھی باہر تاہم فاضل مصنف کی کاوش قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنی والی کسر مقالہ کو سلیس و عام فہم بنانے میں اٹھا نہیں رکھی اور مثالیں جا بجا کثرت سے دیتے گئے ہیں۔ حیرت ناشر کی ہمت پر ہوتی ہے کہ آخر کیا سمجھ کر انہوں نے سینکڑوں اور چلتے ہوئے نظر فریب عنوانات کو چھوڑ کر یہ ٹھوس علمی موضوع اختیار کیا اور تجارتی پہلو سے یوں منھ موڑ لیا۔

صدق نمبر 9 جلد 10 مورخہ 26 جون 1944

(10) اقبال کا فلسفۂ خودی اور مسلمان کی زندگی

از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد۔

فاضل مصنف کے رسالوں مقالوں کا ذکر ان صفحات میں بارہا آچکا ہے۔ وہ نام اور عنوان کچھ بھی رکھیں۔ ہیر پھیر کر ان کا قلم فلسفۂ کلام اور تصوف قرآنی کا ایک خوش گوار امتزاج بھی پیش کرتا ہے۔ سلیس زبان میں ادب کی چاشنی خاصی لیے ہوئے۔ یہی رنگ ان دونوں رسالوں کا بھی ہے۔ گو ان کا مقصد قریب اقبال کی بعض تعلیمات کی تشریح و تعلیل ہے دونوں رسالے مصنف ہی سے ملیں گے اور ہر ایسے پڑھے لکھے کے پاس رہنے کے قابل ہیں جو اقبال سے دلچسپی رکھتا ہو یا علمی تصوف اسلامی فلسفہ و کلام سے ذوق رکھتا ہو۔

صدق نمبر 23 جلد 10 مورخہ 19/اکتوبر 1944

(11) رموز اقبال

از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

182 صفحات، ادارہ نشریات اردو، حیدر آباد۔

اقبال پر کتابیں لکھے جانے کا سلسلہ طویل برابر جاری ہے۔ کتابوں پر کتابیں رطب یابس ہر قسم کی نکلتی چلی آرہی ہیں۔ اچھی کتابیں اور اچھے لکھنے والے کمتر ہیں اور انھیں کمتر میں ایک ممتاز اہل قلم ڈاکٹر میر ولی الدین ہیں جن کا نام نامی کم از کم صدق کے صفحات میں تو اب کسی جدید تعارف کا محتاج نہیں۔

کتاب ان کے پانچ متفرق مقالوں کا مجموعہ ہے۔ (1) فلسفۂ خودی (2) نظریۂ عقل و حسن (3) حدیث جبر و قدر (4) عہد حاضر کا انسان (5) مسلمان کی زندگی۔ یہ مقالے الگ الگ بھی پہلے ماہ ناموں اور سہ ناموں میں چھپ چکے ہیں اور اب کتابی صورت میں یکجا کر دیئے گئے ہیں اور کلام اقبال کی بہترین شان و ترجمان ہیں ــــــ ڈاکٹر ولی الدین کے قلم کی امتیازی خصوصیت فلسفہ اور شریعت کا امتزاج! اس کتاب میں بدرجۂ اتم قائم ہے اور اس نے کتاب کو ہر پڑھے لکھے کے لیے قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ البتہ کتاب عوام کے کام کی نہیں۔

بات اصل موضوع سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے متعدد استادوں اور طالب علموں خصوصاً مولانا مناظر احسن گیلانی اور ان کے تلامذہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ولی الدین نے ادھر چند سال کے عرصے میں دین و علم کی بعض اہم ترین خدمات کا جو انبار لگا دیا ہے اس کے لحاظ سے تو یونیورسٹی کو بے ساختہ مبارکباد دینے کو دل چاہتا ہے۔

صدق، نمبر 23 جلد 12 مورخہ 26/جولائی 1948

(12) اقبال کامل

از مولانا عبدالسلام ندوی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

اقبال کی خوش اقبالی میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ وفات کے بعد سے اب تک ان پر کتابوں پر کتابیں نکلتی ہی چلی آ رہی ہیں گو ظاہر ہے کہ جب یہ کثرت و افراط ہو گی تو معیار یکساں اور بلند نہ رہ سکے گا۔ کوئی معیاری کتاب بس کبھی کبھی ہی نکل سکتی ہے اور اس قسم میں یہ کتاب آتی ہے۔

اس کی معیاریت اس کی تحقیق و تنقید کے لحاظ سے نہیں، اس کی جامعیت و کاملیت کے لحاظ سے ہے اور اس اعتبار سے اس کا نام اقبال کامل بہت صحیح ہے۔ گویا اقبال کی ذات صفات اور کمالات سے متعلق جو کچھ بھی جاننے کے قابل تھا وہ سارا سمندر اس کاغذی کوزہ میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ اقبال اصلاً شاعر تھے (جب کہ مصنف اصلاً سخن فہم ہی ہیں) حکمت، فلسفہ، دینیات، سیاست وغیرہ پر ان کی شعریت غالب تھی۔ مصنف نے اسی نظر سے اقبال و اقبالیات کو دیکھا، جانچا اور پرکھا ہے گو نظر انداز ان کی دوسری حیثیتوں کو بھی نہیں کیا ہے....... 400 صفحات کی متوسط ضخامت کے اندر اقبال اور اقبالیات ایک حیرت انگیز ایجاز اور سلاست کے ساتھ سما گئی ہے۔

مولوی عبدالسلام صاحب اردو کے ایک پختہ کار اہل قلم ہیں۔ ان کے طرز میں ایک خاص قسم کی پختگی آ چکی ہے۔ اگر وہ چاہیں بھی تو اس سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ ان سے یہ خصوصیات تحریروں کی تازہ ترین کتاب میں بھی ایک ایک کر کے موجود ہیں۔

انہوں نے بہت کچھ کہنا چاہیے کہ سبھی سب کچھ لکھ ڈالا ہے۔ اس پر بھی یہی جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی لکھ دیتے مثلاً یہی کے ان کے کلام کا ہندی مسلمانوں میں

عوام ہی پر نہیں بلکہ ان کے خواص اور محمد علی شوکت علی جیسے اخص خواص پر بھی کتنا گہرا اثر ڈالا۔ ترانۂ ملی کے عربی اور فارسی ترجموں کے نمونے نہ دے کر مصنف نے خاصے بخل سے کام لیا ہے۔

صدق نمبر 39 جلد 14 مورخہ 29/اپریل 1949

صنفِ ادب (تاریخ)

(13) تاریخ ادب اردو

مرتبہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن

تاریخ ادب اردو پر جیسی مفصل و محققانہ کتاب ہونی چاہیئے وہ تو اب تک نہیں ہو سکی ہے تاہم دو چار مختصر محدود کوششیں اس باب میں جو ہوئی ہیں وہ اپنی اپنی جگہ غنیمت ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی پیشِ نظر کتاب بھی ہے جو طلبہ کی ضروریات کو دیکھ کر لکھی گئی ہے اور اس مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہے۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے حصہ اول زبان اردو کی تاریخ اور ادب اردو کے آغاز پر ہے جلد دوم میں دہلی دکن لکھنؤ اور پھر دہلی کے ادبی مرکزوں کی مختصر تاریخ آ گئی ہے۔ حصہ سوم دور جدید سے متعلق ہے اور اس میں اردو صحافت پر بھی تبصرہ ہو گیا ہے۔ دکن کی ادبی کوششوں کا ذکر قدرتاً ذرا زیادہ تفصیل سے آیا ہے باقی دہلی لکھنؤ کا تذکرہ بھی اختصار کی ان حدود و قیود کے اندر تشنہ نہیں رہنے پایا ہے زندہ مصنفین کے کارناموں سے البتہ اس کے صفحات خالی ہیں۔

صدق نمبر 9 جلد نمبر 6 مورخہ 8/جولائی 1940

(14) بزم تیموریہ

ازسید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے۔
ضخامت 464 صفحے۔ تقطیع 26x20۔ قیمت درج نہیں۔
دارالمصنفین، اعظم گڑھ (یوپی)۔

آل تیمور کی شان وشوکت، جاہ وجلال سے پڑھے لکھوں بلکہ ان پڑھوں میں بھی کون واقف نہیں؟ دہلی کے تخت پر صدیوں تک انھیں لوگوں نے داد حکمرانی دی ہے، اور سلطنت مغلیہ کے نام کا سکہ گھر گھر چلا دیا------ ان کی سرگزشت رزم سے کتب خانوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ ان کی علمی وادبی داستانِ بزم جامعیت و تفصیل کے ساتھ اس صورت میں اردو میں پہلی بار آئی ہے------ داستان کے فاضلانہ ومحققانہ ہونے کا فیصلہ تو اہل فن ہی کر سکتے ہیں، لیکن اس کے دلکش ہونے سے تو شاید کسی کو بھی اختلاف نہ ہو سکے۔

بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالم گیر، بہادر شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ عالم، بہادر شاہ ان سب نے علم وادب کی کہاں تک اور کن طریقوں سے سرپرستی کی۔ اپنے زمانے میں ادیبوں، طبیبوں، شاعروں، عالموں، صوفیوں اور دوسرے اہل فن کا کیا رنگ رہا۔ بادشاہوں اور اہل کمال سے کیوں کر نبھی، ان سارے سوالات کے جوابات آپ کو اس مجموعہ میں مل جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ کامران، دانیال، پرویز، شہر یار اور شجاع، مراد وغیرہ شہزادوں اور گلبدن بیگم، نور جہاں، جہاں آرا، زیب النساء وغیرہ شہزادیوں کی بھی علم دوستی وادب نوازی پوری طرح روشنی میں آجائے گی--- ہندو شاعروں اور فاضلوں کو جو قدر افزائیاں اور قدر شناسیاں اس سارے دور میں ہوتی رہی ہیں، ان سب کی جھلکیاں بھی انھیں دریچوں سے خوب خوب نظر آئیں گی۔ اور بعض بادشاہوں کی دینداری اور گہری

مذہبیت کے تذکروں سے تو مسلمان پڑھنے والوں کا دل اندر ہی اندر خال ہوا جاتا ہے۔
کھل جانے والی کمی کتاب بھر میں صرف ایک ہی نظر آئی، اور وہ سنہ و تاریخ کے باب میں مصنف کا بخل ہے۔ تاریخی کتاب میں نگاہ سب سے پہلے قدرتاً سنہ ہی کو تلاش کرتی ہے، اور جب اس میں ناکامی ہوتی ہے تو کتاب نویس پر غصہ آنے لگتا ہے!

مصنف باقاعدہ ندوی نہیں لیکن

جمال ہمنشیں درمن اثر کرد

ندوی اعظم کی شاگردی اور دوسرے ندویوں کی طویل ہم نشینی نے شگفتگی زبان و سلاست بیان کے لحاظ سے ان کے قلم کو بالکل ندوی بنا دیا ہے۔ اور دارالمصنفین کے بڑے ہونہار رفیقوں میں ہیں اور اپنے استاد علامہ ندوی کے لیے ایک قابل فخر شاگرد۔ ان صفحات میں وہ محض مورخ ہی نہیں ہیں، بلکہ سخن سنج و ناقد بھی ہیں۔ گو تنقید کو چھوڑ کر کہیں کہیں تقریظ نگاری پر اتر آئے ہیں------- بہادر شاہ ظفر کے کلام کے پیش کرتے وقت تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں نقاد کا قلم نہیں ہے بلکہ بہر مشاعرہ (اور وہ بھی درباری مشاعرہ) داد دینے والی زبان چل رہی ہے!

کتاب میں بہت سے مقامات پر تو فارسی عبارتوں کے ترجمے درج ہیں۔ پھر بھی اصل فارسی بھی بہت جگہ باقی رہ گئی ہے۔ ریویو نگار کتاب پڑھتا جاتا ہے اور سوچتا جاتا ہے کہ اب ان عبارتوں کے سمجھنے والے کتنے رہ گئے ہیں!____ شروع کتاب میں علامہ سلیمان ندوی کے قلم سے دیباچہ گو مختصر ہے، لیکن جامع و حاوی قل و دل کا نمونہ۔

صدق نمبر 39، جلد 14، 29 اپریل 1949

(15) تاریخ زبان اردو

از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، 260 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ،
آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی۔

علوم جدید میں سے ایک خاص علم لسانیات (یا علم اللسان) ہے، جو کہنا چاہیے کہ یورپ ہی میں مدون ہوا ہے اور وہاں بھی ابھی پوری پختگی کو نہیں پہونچا ہے۔ بڑی حد تک نظریاتی ہی ہے۔ اردو فیلالوجی (لسانیات) میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ بہ منزلہ نہ ہونے کے برابر۔ لے دے کے ایک چھوٹی سی کتاب ڈاکٹر زور کی یا قدیم کتابوں میں جستہ جستہ کچھ مقامات محمد حسین آزاد، ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاں یا اگر اور گہری غواصی کیجیے تو کچھ موتی انشاء کی ''دریائے لطافت'' سے ہاتھ آجائیں گے......، ڈاکٹر مسعود حسین تقریباً پہلے شخص ہیں، جنھوں نے ایک مستقل کتاب اوسط ضخامت کی اس فن پر تیار کر دی۔ یہاں مقصود محض اجمالی تعارف ہے، فنی تبصرہ کوئی صاحب فن ہی کر سکتا ہے۔

کتاب چار بابوں میں تقسیم ہے۔ پہلا باب ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ ہے اور دوسرا باب ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں پر۔ تیسرے باب میں ہندوستانی کا ارتقاء جدید عہد میں دکھایا ہے اور اسی میں اردو کی جنم بھومی کی اہمیت بھی آگئی ہے۔ چوتھا باب جو سب سے مفصل ہے تقابلی مطالعہ پر ہے اور اس میں برج بھاشا، پنجابی اور دکنی سے اردو کے تعلقات پر بحث خاصی دیدہ وری کے ساتھ موجود ہے اور آخر میں بڑی مفصل فہرست ماخذ درج ہے، جسے جدید اصطلاح میں ''کتابیات'' کہتے ہیں......۔ کتاب عوام کے لیے نہیں، طلبۂ فن کے لیے لکھی گئی ہے پھر بھی اسلوب بیان کی سلاست کے طفیل ایسی ہے کہ عام پڑھے لکھے بھی اگر پڑھیں، تو بالکل محروم نہیں رہیں گے۔

438

کتاب کئی سال قبل اول بار چھپی تھی اور اب بعد اضافہ ونظر ثانی یہ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے......، مصنف مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں اور یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اپنے شعبہ کا نام بلند کر دیا ہے۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 6، 30 دسمبر 1955

(16) بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد

از مولوی سید رئیس احمد صاحب جعفری ندوی

1360 صفحہ، قیمت 20 روپئے، پتا: کتاب منزل کشمیری باغ لاہور۔

کتاب اس تن و توش کی ہے کہ الف لیلہ و داستان امیر حمزہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد اب ایسی کتابوں کی زیارت شاذ و نادر ہی کہیں ہوتی ہے۔ اکیلی فہرست مضامین ہی نے 40 صفحہ گھیر لیے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ کے زمانے میں بھلا کسے اتنی فرصت کہ اس طول و عرض کی کتاب لکھے اور کسے اتنا اطمینان کہ اسے چھاپے اور کسے اتنی فرصت کہ اسے پڑھے! آفریں مصنف کی ہمت کو۔ آفریں ناشر کے استقلال کو، آفریں پڑھنے والوں کے صبر کو اور اگر اجازت ہو تو اس آفریں کا کچھ تھوڑا سا حصہ تبصرہ نگار بھی اپنے لیے پیشگی مخصوص کر لے!۔ اور کمال یہ ہے کہ مصنف صاحب کوئی تارک الدنیا گوشہ نشین قسم کے آدمی نہیں کہ سب طرف سے یکسوئی حاصل کیے ہوئے اسی ایک کتاب کے لکھنے لکھانے میں لگے رہے ہوں۔ وہ جرنلسٹ (اخبار نویس) ہیں۔ ناولسٹ ہیں اور ایسے کہ ان کے ناول کھٹا کھٹ ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک دارالاشاعت کے منیجر بھی! اس کم فرصتی پر یہ عالم کہ ایک دفتر کا دفتر تیار کر دیا، فرصت ہوتی تو خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔ ایم اسلم صاحب شاید اپنے ہی شہر میں اب دعویٰ یکتائی سے دست بردار ہو گئے ہوں!

کتاب کا نام ہے ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' لیکن کتاب بہادر شاہ پر تو کم ہے اور ان کے عہد پر زیادہ۔ چنانچہ بہادر شاہ کا تذکرہ تو صفحہ 296 پر ختم ہو جاتا ہے اور خیر آگے چل کر کچھ صفحے بہادر شاہ کے مقدمہ کے بھی ملا لیجئے باقی 257 سے عہد بہادر شاہی کے صوفیہ مشائخ، علماء، شعراء، اطباء، ہنرمند اور فن کار، شہدائے غدر، اخبار و عمارات اور دوسرے عنوانات متعلق و غیر متعلق کا سلسلہ جو چھڑتا ہے، تو وہ کتاب کے

خاتمے ہی پر ختم ہوتا ہے بہ قول شخصے ۔

قصۂ زلف مختصر نہ ہوا!

اور کتاب کو مجموعی حیثیت بجائے ایک سوانح عمری یا تاریخ کے ایک تاریخی، سوانحی، ادبی، اخباری کشکول کی دے جاتا ہے۔ زیادہ صحیح طور پر یہ کہیئے کہ ایک مشاق صحافی کے ہاتھوں میں آکر اس مجموعۂ اوراق پر چھاپ اخباریت کی لگ جاتی ہے۔ اور یہ سارا دفتر ایک کتاب سے کہیں زیادہ کسی اخبار کا عظیم الشان و دیو ہیکل سالنامہ نظر آنے لگتا ہے اور کتاب کے ہر باب و فصل پر گمان کسی روزنامہ کے مقالہ افتتاحیہ کا گذرنے لگتا ہے۔ جامعیت اور کاملیت اور ہمہ گیری اس بلا کی کہ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی فہرست مطبوعات اور حالی کے مرثیہ حکیم محمود خاں دہلوی اور اکبر آبادی کے جلوۂ دربار قیصری کی پر بہار نظموں تک کا عکس اس آئینے میں ملاحظہ فرمایئے! کیا کہیے کہ آج حیات نہ ہوئے مولانا شوکت علی مرحوم ورنہ عجب نہیں کہ یہ لحیم و شحیم اور رنگا رنگ کتاب اپنے سارے پھیلاؤ اور پھیراؤ کے ساتھ انھیں کے نام نامی سے معنون ہوتی! بڑا ہی بلیغ اور ہر لحاظ سے پر معنی انتساب (ڈیڈی کیشن) ہوتا۔ اور معنویت کی ایک نئی روح اس سے اس قالبِ کاغذی میں پڑ جاتی۔

بہر حال کتاب تاریخی تخلیق کے اعتبار سے جیسی بھی ہو اپنے ادبی، شعری، انشائی، معلوماتی پہلوؤں سے ہاتھوں ہاتھ لینے اور الماریوں میں سجانے کے قابل ہے۔

'شنید' بہت کچھ ہو چکی اب 'دید' کے شائق ہیں! ایک ہلکی سی جھلک۔ چند منٹ کی نہیں چند سیکنڈ کی ہی سہی، ملاحظہ میں آجائے:۔

''ملکہ وکٹوریہ نے قیصرِ ہند کا خطاب جب اپنے لیے منظور فرمایا تو سارے ہندوستان میں غلغلۂ تہنیت برپا ہو گیا غدر کی تباہیوں سفاکیوں اور سختیوں نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے میں لب کشائی کی ہمت کب باقی چھوڑی تھی۔ لیکن شاعر پردہ پردہ میں وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس دربار کا مشاہدہ کیا اور اپنے تاثرات کی روداد بیان کر دی۔ شاعری کے

اعتبار سے دیکھئے تو

زمین سخن آسماں ہوگئی

الفاظ کی بندش خیالات کا تسلسل، توانائی کی ندرت محاکات واستعارات کی افراط نے ہر شعر کو جانِ سخن بنا دیا ہے۔ بھلا یہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ

تحت میں ان کے بیسیوں ''بندر''

وہ صرف اکبر ہی تھا جس نے الفاظ کے طلسم میں عروس معنی کو اس طرح اسیر کیا کہ نہ کوئی انگشت نمائی کر سکا، نہ گرفت۔ حکایت کے اعتبار سے دیکھیے تو ایک مسلسل داستان ہے جو اپنی پوری رعنائی و برنائی کے ساتھ موجود ہے۔'' (صفحہ 1332)

اس تاریخی جھمیلے میں نہ پڑیے کہ یہ نظم اکبر نے 1903 میں، ایڈورڈ ہفتم کے دربار تاج پوشی کے موقع پر کہی تھی (جیسا کہ خود نظم کے اندر لارڈ کرزن کا نام بھی تصریح کے ساتھ موجود ہے اور ملکہ وکٹوریہ کا جشنِ قیصری تو اس سے ایک پشت قبل 1877 میں ہو چکا تھا۔ یہ بحث بھی جانے دیجیے کہ اس وقت اہلِ ہند کے لب پر مہر آیا انگریزوں کی سختیوں نے لگا دی تھی یا یہ کہ ہندوستانی خود اس وقت تک انگریزی حکومت، انگریزی تمدن، انگریزی معاشرت، انگریزی علوم وفنون کے والہ وشیدا ہو چکے تھے۔ حسنِ بیان ولطفِ زبان کی داد دینے میں آپ ایسے لگیں گے کہ ان خشک واقعاتی بحثوں کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ اندازِ بیان ہر جگہ تاریخی نہ ہو، نہ سہی، لیکن بہر حال کہیں منشیانہ ہے کہیں شاعرانہ، کہیں خطیبانہ اور کہیں صحافیانہ۔ خشک اور عامیانہ کہیں بھی نہیں۔

صدق جدید نمبر 8 جلد 7 مورخہ 25/جنوری 1957

(17) میرے زمانہ کی دہلی: (جلد اول)

از ملا واحدی صاحب، 322 صفحہ، مجلد، قیمت ساڑھے تین روپیہ،
دفتر نظام المشائخ جیکب لائنز، کراچی۔3، (پاکستان)

یہ کہنا چاہیے کہ دہلی مرحوم کا مرثیہ ہے۔ایک خاص الخاص دہلوی کی زبان سے۔واحدی صاحب کی ادبیت کی جان، ان کا اخلاص ہے۔ان کا مقصود یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کبھی دوسروں کو بھی سنانا ہے۔بس یوں سمجھیے کہ جیسے وہ باتیں اپنے آپ سے کرر ہے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ آواز ذرا بلند ہے اور آس پاس والے اسے اتفاق سے سن سنا لیتے ہیں۔ان کی مرثیت ایسی نہیں کہ وہ کبھی چیخ کر روئیں وہ صرف چپکے چپکے آنسو بہانا جانتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ ہلکی سی سسکی بھی بھر لیتے ہیں!

اکبر مرحوم نے ایسے شعر کی تعریف یہی کی تھی، کہ وہ دوسروں کو سننے سنانے کے لیے نہیں، شاعر خود اپنے لیے کہتا ہے۔

نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لیے — نہ اِن کے لیے ہیں نہ اُن کے لیے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز — کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے

کچھ ایسا ہی رنگ واحدی صاحب کی نثر کا ہے۔وہ دوسروں کی مدح وتحسین سے بے نیاز، اپنے ہی اندرونی تقاضوں سے مضطر و مجبور ہو کر قلم اٹھاتے ہیں اور جو کچھ اندر ہوتا ہے اسے باہر لے آتے ہیں۔

دہلی والوں سے ان کی مراد خاص دہلی کے باشندے ہی نہیں، بلکہ باہر کے بھی وہ لوگ مراد ہیں جو ان کے زمانے میں دہلی میں مقیم رہے اور اس طرح موضوع کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا ہے۔مولانا محمد علیؒ کا ذکر ذرا تفصیل سے آ گیا ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ کا اجمالاً۔بعض ناموں کے تذکرہ میں ان کا حافظہ انھیں دھوکا دے گیا ہے۔خصوصاً سید جالب مرحوم کے سلسلے میں ص:313، ص:314 پر لیکن اس سے نفس مضمون پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

صدق جدید، نمبر 45، جلد 8، 10/ اکتوبر 1958

(18) ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک

مرتب مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ایم اے۔

5،6+6 صفحہ، قیمت ....، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، (یوپی)

اور یہ ''ایک ایک جھلک'' ملا کر 23 جھلکیاں ہوگئی ہیں۔ گویا کتاب کا دوسرا نام واضح تر نام ہوسکتا ہے۔ 23 جھلکیاں ہندوستان کے عہد وسطی کی۔ اور یہ معلوم ہے کہ مورخین کی بولی میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے مراد ہوتی ہے، اسلامی ہند، سلطنت مغلیہ سے قبل کا۔ تو اب کتاب کا واضح ترین تعارفی نام ہوسکتا ہے ''عہدِ بابری سے قبل کا اسلامی ہند''۔

یہ ان تین سوا تین صدیوں کی باضابطہ و مسلسل تاریخ نہیں، صرف مختلف تاریخی جھلکیاں ہیں اور عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں:

محمود غزنوی اور اس کے جانشین

البیرونی

محمد غوری اور اس کے جانشین

امیر خسرو

فیروز شاہ تغلق

لودی خاندان

ہندوستانی تہذیب اور اسلام

ان سات سے تنوع پورے 23 کا سمجھ لیجیے

ہر عنوان پر مقالہ عموماً کسی ہندو مورخ کے قلم سے ہے۔ مسلمان مقالہ نگار کل دو ہی نظر آئے، ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اور یہ مقالات عموماً انگریزی میں تھے، صرف دو مقالے فارسی سے لیے گئے ہیں۔ ایک شہاب

الدین خلجی، قطب الدین مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق پر سوجان رائے کی خلاصۃ التواریخ سے اور دوسرا راجہ درگا پرشاد سندیلوی کی تاریخ گلستان ہند سے آخری تغلق اور سادات سلاطین پر۔ یہ صباح الدین صاحب، صاحب بزم صوفیہ و بزم تیموریہ وغیرہ پڑھے لکھوں کے حلقہ میں مورخ کی حیثیت سے اب خود بھی اجنبی نہیں رہے ہیں۔ لیکن اس کتاب کے وہ مصنف کیا معنی۔ صحیح معنی میں مولف بھی نہیں۔ صرف مترجم و مرتب ہیں۔ لیکن اس بہ ظاہر سیدھے اور سہل سے کام میں بھی ثبوت انھوں نے اپنے حسن ترتیب، حسن ذوق، حسن انتخاب کا ایسا دیا ہے کہ ترتیب کے ڈانڈے تالیف سے ملا دیے ہیں اور ترجمہ پر دھوکا تصنیف کا بار بار ہو جاتا ہے۔

ان کے ''بزم'' ناموں کو پڑھ کر توقع قدرۃً یہ ہوتی ہے کہ اس تاریخ میں بھی بزم، رزم پر غالب ہوگئی۔ توقع، اندازہ سے بڑھ کر پوری ہوئی۔ غالب و مغلوب کیا معنی، رزم کا کہنا چاہیے کہ سایہ بھی مشکل ہی سے پڑنے پایا ہے! کتاب قرون وسطی کی تاریخ پر ہے اور اس کے صفحات بجائے خون کے حنا کی سرخی سے لالوں لال ہوں! اب اسے مرتب کی فنی چابک دستی کہہ لیجیے یا کچھ اور حقیقت حال ہے کچھ ایسی ہی۔

انگریزی عہد کے مورخوں میں ایک نامی بزرگ گزرے ہیں سر ہنری ایلیٹ۔ جنھوں نے یہیں کی تاریخ نگاروں کے صفحات سے اقتباسات لے لے کر آٹھ جلدوں میں کتاب تیار کر دی ہے۔ تاریخ ہند مورخین ہند کے قلم سے۔ اور ظالم نے التزام یہ رکھا ہے کہ عہد اسلامی کے تعلق سے چن چن کر وہی تحریریں یکجا کر دی ہیں جو ہندو مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے حق میں تیر و نشتر کا کام دینے والی ہوں۔ صباح الدین صاحب قائل علاج بالمثل کے ہیں۔ چن چن کے وہ ساری تحریریں یکجا کر دی ہیں جو زخم پر ٹھنڈے مرہم کا کام دیں۔ اور دلوں کو توڑنے کی جگہ جوڑتی چلی جائیں! ''این جواب آن غزل'' کا شہرہ آپ نے شاعری کے شیش محل میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ اب تاریخ کے دربار پُر جلال میں اس کا مشاہدہ خود کر لیجیے۔

اور ایک بات تو کہنے سے رہی جاتی ہے۔ مرتب محض ناقل یا مترجم نہیں۔

حاشیے انھوں نے بڑی کثرت سے، بلکہ یوں کہیے کہ متن کتاب کے مساوی الحجم ہیں، اپنی طرف سے بھی اضافہ کیے ہیں۔ اس نے حسن کتاب کو دوبالا کر دیا اور کتاب کی افادیت اور دلچسپی دونوں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ پیش لفظ کی ایک اچھی تحریر ڈاکٹر سید محمود کے قلم سے ہے جو سابق وزیر صوبہ بہار اور سابق وزیر معاملات خارجہ سرکار ہند ہی نہیں تھے، بلکہ خود دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی صدر ہیں ان کی اس حیثیت کا ذکر کتاب میں ضروری تھا۔

کتاب تاریخی اعتبار سے جیسی بھی ہو اور مورخوں کی میزان تنقید میں وزنی یا سبک جیسی بھی ثابت ہو، بہر حال ایک عامی ناظر کی نظر میں تو لطیف بھی ہے اور لذیذ بھی، قابل دید و قابل داد۔

صدق جدید، نمبر 37، جلد 9، 14 / اگست 1959

(19) گزشتہ لکھنؤ

از مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم

440 صفحے قیمت آٹھ روپے پچاس پیسے، مکتبہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی۔20

شرر مرحوم جو بیسیوں کتابیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ان میں بڑی تعداد تو ناولوں کی ہے لیکن اچھی خاصی تعداد میں تاریخ، سیرت و سوانح عمری کی جامع اور پر مغز کتابیں بھی ہیں اور چار پانچ جو ان کی بہترین و مفید ترین کتابیں ہیں ان میں سے ایک گزشتہ لکھنؤ بھی ہے۔ اسے شرر نے اپنے ماہنامہ دلگداز میں ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے قسط وار شروع کیا تھا اور کتاب کی صورت میں ان کی نظرِ ثانی کے بعد ان کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھی اور شکر ہے کہ اب جامعہ والوں کے معیاری ادب کے سلسلۂ انتخاب میں آگئی اور اس کا نیا ایڈیشن مع پیش لفظ ہے۔ تعارف اچھا خاصا مفصل رشید حسن خاں کے قلم سے ہے۔ انتخاب جس طرح کتاب کا ہوا ویسا ہی تعارف نگار کا بھی۔ انھوں نے کتاب کی کسی عبارت میں تو ہاتھ لگایا نہیں۔ البتہ ایک بڑی مفصل فہرست مضامین پچاسوں بلکہ شاید سیکڑوں عنوانات لگا کر شایع کر دی ہے اور تعارف ایسا لکھ دیا ہے جو سپاٹ اور سرسری نہیں بلکہ گہرا اور پر مغز ہے۔ تصنیف ہی نہیں مصنف کے جوہر کو بھی چمکا دینے والا............ خیر تقریظ تو کیا ہوتی لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تنقید برائے تنقید ہی ہو کر رہ جائے اور تعارف نگار کی طرف سے مصنف پر دل کے بخار نکلنے کا ایک سامان بن جائے------ چٹکیاں بھی ہیں گدگدیاں بھی زیادہ نہیں ہیں اور حسب گنجائش چٹکیاں کم ہیں اور حسب ضرورت!

کتاب معلوماتی حیثیت سے تو ایک مخزن کا کام دیتی ہے بعض ٹکڑے بڑی ہی عبرت کے ہیں۔ ایسی معلومات کا ایک نمونہ۔

''واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں بہت سے نئے کبوتر جمع کیے تھے، کہتے ہیں

کہ ریشم پرے کبوتروں کا ایک جوڑا پچیس ہزار کو لیا تھا------ جب انتقال ہوا تو چوبیس ہزار سے زائد کبوتر تھے جن پر سیکڑوں کبوتر باز نوکر تھے۔''

(ص217)

ظاہر ہے کہ یہ شاہ خرچیاں شاہی کے زمانے کی نہیں معزولی بلکہ کہنا چاہیے کہ اسیری کے زمانے کی ہیں------ واجد علی شاہ نے اپنا ملک واپس لینے کے لیے ایک وفد لندن کو بھیجا تھا اور پھر اپنے ہاتھوں بہکانے والوں کے کہے میں آ کر وہ جس طرح خراب و ناکام آیا اس کی داستان دردص 110، 111 پر پڑھنے کے قابل ہے۔ بعض مصارف کی تفصیل بھی اسیری کے زمانے کی شرر صاحب کی زبان سے سنئے:

جانور باز آٹھ سو سے زائد کی تعداد میں ملازم تھے

کبوتر باز تین سو کے قریب ایضاً

ماہی پرور اسّی کے قریب ایضاً

مار پرور 30یا40 ایضاً

دیگر جانوروں کی خوراک میں کچھ کم نو ہزار ماہانہ صرف ہوتے تھے

پہرے کے سپاہی ایک ہزار تھے۔

مکان دار پانسو سے زائد تھے۔

مالی پانسو سے ایضاً

کہار پانسو سے ایضاً

محرر اسّی زائید ایضاً

معزز مصاحبین اور اعلیٰ عہدہ دار 40یا50

صفحہ 117-118

''ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمے تھے۔ باورچی خانہ، آبدار خانہ، بھنڈار خانہ، خس خانہ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مدلوا حقین کے رشتے داروں اور بھائی بندوں کی تھی جنھیں حسب حیثیت تنخواہیں ملتی تھیں۔'' (ص118)

کتاب کے اندر ایک دو نہیں پچاسوں اصطلاحیں (خصوصا سواری، لباس، تفریحات سے متعلق اب نامانوس ہوگئی ہیں خوب ہوتا جوان کے معنی ایک فرہنگ میں دے دیئے جاتے اور مصنف کو جن اہم طبقات پر توجہ کا موقع نہیں ملا مثلاً علماء فرنگی محل یا شیعہ مجتہدین وغیرہ ان کا تذکرہ بڑھا کراب تکملہ کی امید کس سے کی جائے؟'

رشید حسن خاں صاحب کے انداز تحریر کی داد بھی دی جا چکی ہے۔ ان کا توازن، ان کا قلت و دلِ انداز بیان دونوں مثالی ہیں لیکن بشریت آخر کہیں تو اپنا رنگ دکھا ہی جاتی ہے ص 33 کے شروع میں جہاں مباحثۂ گلزار نسیم کے سلسلے میں شرر پر کڑی تنقید ہے انصاف کا تقاضہ ہے کہ ذرا ادھ پنچ پر بھی کچھ لکھ دیا جاتا۔ شرر کی تنقید جو کچھ بھی تھی نسیم کے محض فن پر تھی باقی شرر صاحب کی داڑھی پر۔ جسم کے رنگ پر، قدو قامت پر، وطن پر، یہاں تک کہ عبدالحلیم کے بجائے بوا حلیمن پر تضحیک و تفضیح کی بدعت بازاری زبان میں کس نے روا رکھی ہے۔

ص 59 کے ختم کے قریب ایک عبارت ملتی ہے جس کا مطلب تعارف نگار کے نزدیک خبط ہو گیا ہے، وہ فقرہ یہ ہے:

''جنھوں نے ان سب محلوں سے دور جا کر اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک پیر خاں کی گڑھی کہلاتا ہے۔''

لیکن اس فقرے میں خبط ہو جانے کی بات تو کوئی مل نہ سکی ''متشابہ'' شائد لفظ ''جو مقام'' سے لگا لیکن یہ تو انگریزی ترکیب میں بالکل جائز ہے۔ ''جو'' کا تعلق ''گڑھی'' سے ہے اور انگریزی میں اس موقع پر Which place آتا ہے شرر صاحب باوجود اردو کے ادیب کامل ہونے کے بہت جگہ انگریزی ترکیبیں استعمال کر گئے ہیں۔

ایک اعجوبہ پر نظر ابھی ابھی پڑی شرر صاحب ارمان کو مونث لکھتے تھے اور جمع ارمانیں اسی کتاب میں موجود ہیں،............ ڈھول بھی شرر صاحب کی زبان پر مذکر بھی ہے اور مونث بھی ایک ہی صفحہ پر دونوں استعمال ملتے ہیں۔

صدق جدید نمبر 39 جلد 21 مورخہ 26/ نومبر 1971

صنف ادب (تذکرہ)

(20) انجمن ترقی اردو کی کہانی

از غلام ربانی صاحب

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

موضوع نام سے ظاہر ہے۔ انجمن کی پچھلی تاریخ موجودہ کام اور آئندہ کی تجویزوں کا ایک دلچسپ اور جامع تذکرہ۔ مصنف صاحب کا تعلق دکن کے محکمہ آثار قدیمہ سے ہے لیکن قلم کو ماشاءاللہ قدرت آثار قدیمہ وجدیدہ ''دونوں پر یکساں ہے۔''

صدق نمبر 3 جلد نمبر 6 مورخہ 2 رمئی 1940

(21) ہم اور وہ

خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی

مکتبہ جامعہ دہلی۔

قدیم و جدید کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی، پھر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے۔ مدت سے کہا یہ جا رہا تھا کہ دلی اب دلی والوں سے خالی ہوگئی اور زبان دانی اس خطہ سے رخصت ہوگئی۔ 'ہم اور وہ' نے ثابت کر دیا کہ دلی میں دلی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلی کی زبان اب بھی ماشاالله اسی آن بان سے زندہ قائم و پابند ہے درخشاں و تابندہ ہے۔ مصنف نے ایک اچھوتے طریقے پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے سچی، کھری، سیدھی اور خدا لگتی، اور حسن زبان و بیان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ ہے۔ فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی اور بلاغت قدم قدم پر نثار ہوتی جاتی ہے۔ حسن انشا کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں۔ الله ان کی عمر میں بہت بہت برکت، ان کے قلم کو بہت بہت قوت عطا کرے کہ گلشنِ اردو کو ایسی ہی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں تک باقی رہے گی۔

صدق نمبر 25 جلد نمبر 6 مورخہ 28/ اکتوبر 1940

(22) دلّی کا سنبھالا
از خواجہ محمد شفیع دہلوی
مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے دلّی والوں (کچھ دلّی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں، چلتی پھرتی بولتی چالتی نظر آ رہی ہیں اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ تو ہیں، عالم و فاضل بھی، رند اور اوباش بھی، زاہد و مرتاض بھی اور شوخ و طرار بھی۔ ایک طرف شاہ عبد القادر، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ اسمٰعیل شہید، سرسید، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں تو دوسری طرف فلاں گویّے اور فلاں ستار نواز، اور فلاں بی صاحبہ۔ مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں، اس لئے ایسی فروگزاشتوں کو نظر انداز کیجئے کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے علمِ جہاد حکومت برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا (ص 111)۔ مصنف کا مقصود اپنی زبان دانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دلی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب رہے ہیں کہ گویا امتحان کے پرچے میں سو نمبروں میں پورے سو پا لیئے ہوں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حسن دو الگ الگ چیزیں ہیں یہ ضروری نہیں کہ جو اہلِ قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہوں، وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت پر بھی قادر ہوں، دونوں کا اجتماع اس وقت اردو لکھنے والوں میں تو خال ہی خال نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ان مستثنیٰ مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوبِ بیان کی دلکشی۔ دلکشی نہیں دلبری اس پر قیامت۔ ممکن نہیں کہیں سے کوئی صفحہ کھل جائے اور پھر ختم کئے بغیر آپ کو چھوڑنے کا جی چاہے۔ ایک دو منظروں پر نگاہ اچٹتی ہی سہی ڈالتے چلیئے۔ ''اہلِ دربار مؤدب کھڑے ہو گئے۔ دلی ماتا نے تعظیم دی۔ یہ کون تین بھائی آ رہے ہیں کہ ملاء اعلیٰ طبقات لیے ساتھ ساتھ

ہیں۔نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک،مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز کے مولف،مولانا شاہ رفیع الدین صاحب۔
بھاٹ نے عرض کی
خاموشی درثنائے تو حدثنائے تست!

رفعت علم تالب عرش لینے آئی۔صف علما میں مرتبہ پر لے جا بٹھایا۔

مولوی میاں نذیر حسین صاحب اپنے معتقدوں کے ہمراہ دفاتر احادیث مقدسہ لئے تشریف لائے۔اہلِ دربار نے تعظیم دی،دلی ماتا نے بہ نظرِ عنایت دیکھا اورکہا سر پرنور شہادت پرتو فگن ہے۔ان کا مستقبل بتاؤ۔منجم قدرت نے دلی ماتا کی پیشین گوئی کی شہادت دی۔

علم وتقدس کی اس شہ نشین سے اتر کراب ضلع جگت کے میدان میں آیئے۔
”روز محفل آراستہ ہوتی ہے۔شہر بھر کا تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتا ہے۔اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلے کے لئے آتے ہیں۔استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے،جومنہ میں آتا ہے منہ کی کھاتا ہے۔ظالم ایک نہ ایک فقرہ ایسا چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منہ زور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔جواب نہیں بن پڑتا اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا ہے۔استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے۔دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی ویسے منہ بھی دکھانا۔پھر بھی آنا۔جو ایک دفعہ مقابلے پر آجاتا ہے اس کا پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ دکھائے۔استاد ایسا منہ توڑ دندان شکن فقرہ کہتا ہے کہ منہ پھیر دیتا ہے۔“

زبان وادب کے معیار سے ایسی کتاب مدت کے بعد دیکھنے میں آئی اور عام متفرق معلومات کے لحاظ سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

صدق نمبر 46 جلد نمبر 6، 12/اپریل 1941

(23) تذکرہ اردو مخطوطات حصہ اول

از ڈاکٹر محی الدین زور

دائرہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو دکن کے 275 مخطوطات کا مفصل اور پر معلومات 'تذکرہ' اس عملی جائزہ میں تفسیر وحدیث یا تاریخ سے لے کر کہانیوں تک کے مختلف علوم وفنون آگئے ہیں۔ تذکرہ ہر لحاظ سے دلچسپ اور شائقین علم وادب کے لیے بڑے کام کا ہے۔ ایک خشک موضوع کو اس حد تک دلچسپ اور اس پیمانہ پر وسیع بنادینے کی غالباً یہ پہلی مثال ہے۔

صدق نمبر 2 جلد 10 مورخہ 8 مئی 1944

(24) مادر ہمدرد

از خواجہ حسن نظامی

امیر خسرو اردو لائبریری، دہلی۔

دہلی کے ''ترک ہزار شیوہ'' خواجہ حسن نظامی مدت کے بعد پھر اہل قلم کی بزم کاغذی میں جلوہ نما ہوئے ہیں---------انداز رفتار میں وہی سبک گامی وہی نازک خرامی جو ہمیشہ سے ملتی۔

نام کتاب میں ترکیب توصیفی یعنی اضافی ہے۔ مادر ہمدرد صفت موصوف نہیں مضاف مضاف الیہ ہیں۔ ہمدرد مہربان و مشفق کے معنی میں بس بلکہ اسم اور ذات ہے اور اس سے مراد دہلی کا ایک مشہور و مرحوم روز نامہ نہیں بلکہ شہر کا ایک زندہ اور زندگی بخش دواخانہ ہے!--------- حکیم عبدالحمید صاحب کو مبارک ہو کہ ان کے لق ودق اور ہر اشتہار و تعارف سے بے نیاز کارخانے کو بے کدو کاوش نقیب اور منادی ایسا زبردست ہاتھ میں آ گیا!

کتاب کا موضوع یہ بتایا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ اور روس کا کلچر خود غرضی پر مبنی ہے اس کے مقابلے میں ایشیا اور اسلام کے کلچر میں مادری تربیت کی بڑی اہمیت ہے اور اس میں ہر طرح کا سکون روح و راحت قلب ہے۔ لیکن کتاب کے ورق ورق الٹتے چلے جائیے موضوع کی جھللک دیکھنی بھی نصیب نہ ہوگی بشرطیکہ کتاب کی دلچسپیوں میں گم ہو کر ذہن میں موضوع کی یاد باقی بھی رہ جائے!

کتاب کے اندر بیسیوں نہیں پچاسوں بلکہ سیکڑوں شخصیتوں کا ذکر ہے کسی کا سطر دو سطر میں اور کسی کا کئی کئی صفحوں میں اور پھر اس میں ماضی بھی ہے اور حال بھی، مدح بھی ہے اور قدح بھی، طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔ شخصیتیں بھی ہر درجہ و مرتبہ کی اور ہر ذہنیت و نوعیت کی۔ بادشاہ اور رعایا انگریز اور ہندوستانی، ہندو و مسلمان،

رند وزاہد، امیر وغریب، شاعر اور گوشے میں سے کوئی بھی چھوٹنے نہیں پایا۔ پھر محض شخصیتوں ہی پر بس نہیں بخشیں بھی زمین و آسمان کی۔ ابھی ذکر جمہوریت کا تھا اور موضوع داڑھی کا چھڑ گیا!--------ریویو نگار غریب حیراں کہ اس ساری رنگا رنگی اور بوقلمونی کو سمیٹ کر کتاب کی کون سے صنف قرار دی جائے اور اسے کس فن کے تحت لایا جائے۔

درویشوں میں ایک قسم سیلانیوں کی ہوتی ہے-------- خواجہ صاحب کا قلم بھی ایک آزاد درویش کا قلم ہے لیکن ہر بے ترتیبی ژولیدگی کے مرادف نہیں اور بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی، نری شاعری نہیں واقعہ بیانی بھی ہے ایسے ہی موقعوں کے لیے۔ کتاب دلچسپ شروع سے آخر تک ہے بعض دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ تذکرہ و سوانح عمری کے بجائے کسی افسانہ، پراسرار افسانہ کے صفحے سامنے کھلے ہیں۔ سب سے حیرت انگیز اور مؤثر حصہ بنارس کی ایک طوائف کی سرگزشت ہے صفحہ 53 تا 59۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر صوفی عنایت خاں مرحوم کا تذکرہ صفحہ 137 تا 139۔

صدق نمبر 45 جلد 15 مورخہ 31/ مارچ 1950

(25) ادبی اور قومی تذکرے:

از پنڈت کشن پرشاد کول۔

218 صفحہ، تقطیع 22x18 مجلد مع گرد پوش، قیمت ساڑھے چھ روپیہ،

انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کول صاحب اردو کے پرانے لکھنے والے اور مشاق صاحب قلم ہیں۔ مدت ہوئی ایک اخبار اور ایک رسالہ کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دو تین ناولوں کے مصنف ہیں، وہ رسالوں میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ ان کے 14 مضمونوں کا ہے۔ 1928 سے 1950 تک لکھے ہوؤں کا۔ ان کا اصل موضوع سیاسیات ہے، لیکن وہ ادب کے کوچہ سے بھی نا آشنا نہیں، چنانچہ اس مجموعہ میں بھی 7 مضمون ادبی یا نیم ادبی ہیں۔ اور 7 ایسے ہیں جنھیں سیاسی تو نہیں، لیکن بہرحال قومیات اور قومی شخصیات ہی کے تحت میں رکھا جائے گا۔ ان کی رنگا رنگی کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہو جائے گا:

ہندی اردو یا ہندوستانی۔ دیر و حرم کے قصے۔ اکبر الہ آبادی، لکھنؤ کا ایک لطیفہ۔ گنگا پرشاد ورما اور نیا لکھنؤ۔ راجہ رام موہن رائے اور برہمو سماج۔

کشمیر پنڈتوں میں اس پایہ کے بھی شاعر اور نثار گزر چکے ہیں، جنھیں اگر اردو کے اہل زبان کی فہرست میں رکھ دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم اور برج نرائن چکبست اور ایسے تو متعدد پیدا ہو چکے ہیں، جنھیں فاضل زبان دانوں کی صف میں جگہ بے تکلف دی جا سکتی ہے۔ مثلاً بشن نرائن در، منوہر لال زتشی، برج موہن ناتھ کیفی۔ کول صاحب کا یہ پایہ نہیں۔ وہ ''جرنلسٹ'' پہلے ہیں اور ادیب بعد کو، بلکہ بہت بعد کو، تاہم ان کی خوش ذوقی اور ادب نوازی کی جھلکیاں اس مجموعہ میں جا بجا نمایاں ہیں، اور مضمون لکھنؤ کا ایک لطیفہ میں تو وہ اکبر الہ آبادی سے کہیں بڑھ کر لکھنوی نظر آ رہے ہیں۔

کول صاحب سیاسی اصطلاح میں 'لبرل' پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اپنے مذہبی عقیدوں میں وہ واقعی ''آزاد'' یا آزاد خیال ہیں! دیر و حرم دونوں سے یکساں بیگانے، یا دونوں کے یکساں یگانے اس لیے وہ بڑی آسانی سے ترازو کے ایک پلے میں سرسید کو رکھ سکے ہیں اور دوسرے میں دیانند سرسوتی کو، وہ سیاسیات و ادبیات میں مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود ''سماجیات'' میں مشرقیت ہی کے دلدادہ ہیں۔ اوران کا یہی رنگ اِن صفحات سے چھن چھن کر نکل رہا ہے۔ گاندھی جی اور سرسید دونوں کی یاد میں انھوں نے عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔ لکھنؤ کی ایک ناقابل فراموش ہستی گنگا پرشاد ورما تھے۔ ان بیچارہ کا اب کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ کول صاحب نے اچھا کیا، کہ ان پر ایک اچھا مضمون لکھ کر ان کے نام کی زندگی کا سامان کچھ دن کے لیے اور کر دیا۔ اردو نواز کشمیری پنڈتوں میں ایک خاص درجہ رایٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کا ہوا ہے۔ کول صاحب اپنی حسب حیثیت انھیں کی جانشینی کر رہے ہیں۔

صدق جدید، نمبر 26، جلد 2، 20 مئی 1952

(26) تاریخ انجمن ترقی اردو:

از سید ہاشمی فرید آبادی صاحب

310 صفحہ مجلد قیمت ساڑھے تین روپیہ، انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی!

یہ پندرہ سالہ تاریخ 1903 تا 1953 اس انجمن ترقی اردو کی ہے جو کبھی ''آل انڈیا'' تھی۔ اور اب ''آل پاکستان'' ہے۔ یہ پنجاہ سالہ مفصل روئداد انجمن یوں بھی دل چسپ جاذب توجہ ہی ہوتی، پھر جب کہ کہانی کہنے والا سید ہاشمی فرید آبادی جیسا مشاق داستاں گو ہو!...... کیا اچھا ہوتا کہ سرورق پر کتاب کا دوسرا اور عام فہم نام یوں درج کر دیا جاتا ''انجمن ترقی اردو کی خزاں و بہار کی کہانی، فرید آبادی کی زبانی''

کتاب آٹھ بابوں میں تقسیم ہے۔ باب اول تاسیس انجمن پر ہے جب انجمن کانفرنس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے مولانا شبلی مرحوم اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کے سپرد تھی۔ باب دوم مولوی عبدالحق صاحب کے دور نظامت اور انجمن کی کارکردگی پر ہے۔ باب سوم میں مولوی صاحب کی سرکاری خدمت سے پنشن پانے اور انجمن کے دکن سے دہلی منتقل ہو آنے پر ہے۔ اور اسی ضمن میں ودیا مندر اسکیم وغیرہ کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ باب چہارم انجمن کے ابتدائی دور دہلی پر ہے۔ باب پنجم انجمن کے نو سالہ دور دہلی پر ہے۔ باب ششم خود مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے، ہندوستان کے فسادات اور انجمن کی ہجرت پاکستان پر ہے۔ اور قدرتاً اس باب کا مطالعہ بڑا صبر آزما و دردناک ہے۔ آخر کے دو باب مع ضمیموں کے انجمن کے دور پاکستان پر ہیں- یہ کتاب ساری وہی ہے جو انجمن کے رسالہ اردو کے دو نمبروں (جولائی و اکتوبر 1953) میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

کتاب کے اکثر حصوں کا مطالعہ بڑا ہمت افزا اور ولولہ خیز ہے۔ لیکن اس طرح بعض دوسرے حصہ طبیعت میں افسردگی اور اداسی پیدا کر دینے کے لحاظ سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔

صدق جدید، نمبر 16، جلد 4، 19 مارچ 1954

صنف ادب (تنقید)

(27) تنقیداتِ عبدالحق

مرتبہ تراب علی خاں باز

کاشانۂ باز، بازار گھانسی، حیدر آباد دکن۔

انجمن ترقی اردو کے پرانے اور مشہور سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کے نام سے ادب اردو کے حلقہ میں کون ناواقف ہے۔ موصوف نے اپنی زندگی میں صدہا کتابوں پر تنقیدیں لکھی ہوں گی۔ یہ ان میں سے 24 تنقیدوں کا انتخاب ہے جو رسالہ اردو سے لی گئی ہیں۔ تنقیدیں سب کی سب ادبی و لسانی تصانیف پر ہیں۔ اس لئے ان پر تفصیلی تبصرہ صدق کے حدود سے خارج ہے۔ اجمالاً مصنف کا نام تصنیف کے دلچسپ قابلِ مطالعہ ہونے کی خود ایک ضمانت ہے۔ متعدد تنقیدیں اس مجموعہ میں بصیرت افروز ہیں۔ مثلاً بانگِ درا اور نور اللغات پر اور بعض بہت پر لطف ہیں مثلاً شرح دیوانِ غالب اور زبانِ اردو پر سرسری نظر۔

ادبی حلقوں میں امید ہے کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

صدق نمبر 28 جلد نمبر 1 مورخہ 11 / فروری 1936

(28) خمسہ کیفی

از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

ہندو ادیبوں اور زبان دانوں میں اب پنڈت کیفی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پیشِ نظر رسالہ ان کی دو نظموں اور تین نثروں کا مجموعہ ہے جو سب کے سب زبان ہی سے متعلق ہیں ان میں سے دو مضمون ایک ''اردو ہماری زبان'' دوسرا ''اردو لسانیات'' خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ پہلا وہ لکچر ہے جو کوئی ڈیڑھ دو سال ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہال میں بہ سلسلہ اردو کانفرنس دیا گیا تھا۔ دوسرا وہ توسیعی لکچر ہے جو مصنف نے کئی سال ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں دیا تھا۔ یہ دونوں لکچر خطیبانہ نہیں فاضلانہ انداز کے ہیں اور ان میں بہت سے کام کی باتیں ادب اردو لسانیات اردو کے طلبہ کو مل جائیں گی۔ تیسرا لکچر ''ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات'' کے عنوان سے پٹنہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا وہ بھی اپنے رنگ میں اچھا خاصا ہے۔ کتاب ان لوگوں کے مقابلے میں ایک پورا اور مسکت جواب ہے جو اردو کو مسلمانوں کی مخصوص جائیداد سمجھ رہے ہیں۔ رسالہ کا ایک صفحہ انہیں بتا دیگا کہ ایک پیدائشی اور پشتہائے پشت کا ہندو ''ہندوستانی'' پر نہیں اردو پر ہندی آمیز اردو پر نہیں، اچھی خاصی دقیق اور مغلق، مفرس و معرب، اردو پر کس بے تکلفی سے قادر ہے۔

سرِ ورق پر اگر مصنف کا نام نہ ہو تو یہی پتہ چلنا دشوار ہے کہ عبارت کسی مولوی قسم کے ادیب کی نہیں ہے۔ اردو کی پچھلی تاریخ میں بے شبہ یہ مثال کوئی انوکھی نہیں لیکن نسیم اور سرشار، سرور اور چکبست، نظر اور برق کا دور ختم ہو جانے کے بعد اب ایسی مثالیں تو خال ہی خال نظر آئیں گی۔ ۱۲؍ کی قیمت میں ایسا مجموعہ ہاتھ آ جانا بالکل مفت ہے۔

صدق نمبر 1 جلد نمبر 6 مورخہ 6/ مئی 1940

(29) تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید

مصنفہ پروفیسر براؤن۔ مترجمہ سید وہاج الدین

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

انگریزی میں پروفیسر براؤن کی ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' ایک مشہور و معروف کتاب ہے اور اپنے فن پر معتمد و مستند، یہ اس کی چوتھی اور آخری جلد کا سلیس و شستہ ومحتاط ترجمہ ہے۔ مترجم ایک مشاق مترجم اور مصنف ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے ترجمے کے لئے ان کا انتخاب ہر حیثیت سے اچھا کیا۔

مصنف کی کاوش، وسعت نظر و ذوق تحقیق کا پورا اندازہ اصل کتاب ہی کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے کچھ سرسری موٹا اندازہ فہرست مباحث پر نظر کرنے سے بھی ہو جائے گا کتاب تین مستقل حصوں میں تقسیم ہے موضوع 1500 سے 1924 تک کا زمانہ ہے۔ حصہ اول میں ان چار صدیوں کی ایرانی تاریخ پر اجمالی نظر ہے۔ حصہ دوم ان چار صدیوں کی ایرانی شاعری پر ہے اور حصہ سوم ان چار صدیوں کی فارسی نثر پر۔ ابواب شمار میں دس ہیں اور ہر باب ایک متعین دور پر۔ مباحث کی دلآویزی اور مصنف کا حسنِ بیان دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ مترجم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ترجمہ میں مستقل تصنیف کا انداز پیدا کر دیا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے میں صرف دو لفظ کھٹکے۔ ص 491 پر لیمپ کا ترجمہ لیمپ ہی کیا ہے۔ سیاق کہتا ہے کہ ''چراغ'' بہتر تھا اسی طرح دوسرا لفظ ''معذرت'' ہے ص 313 پر، مترجم نے یہ لفظ Apology کے لیے رکھا ہے حالانکہ یہاں اپالوجی کا صحیح مفہوم تشریح، توضیح یا توجیہ Explanation سے ادا ہوتا ہے۔ انگریزی کے مترجمین اس لفظ کے ترجمے میں بڑی کثرت سے غلطی کر جاتے ہیں۔ خود مصنف کے حواشی کثرت سے ہٹی ہیں مترجم نے اپنی طرف سے بھی جا بجا حاشیہ دیئے ہیں اور ایک جگہ (ص 337) مصنف سے اچھا خاصا اختلاف

بھی کیا ہے۔اس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ انگریزی کتابوں اور مصنفین کے نام اصل انگریزی میں دے دیئے ہیں ان کے بغیر اس میں بڑی غلط فہمیوں کا امکان رہتا۔کتاب مطبوعات کا ایک مخزن ہے اور معلومات محض ادبی نہیں مذہبی اور کسی قدر سیاسی بھی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ معلومات ہر جگہ تمام تر صحیح نہ ہوں مثلاً ص 476 پر مصنف کا یہ بیان کہ اہلِ سنت کے ہاں بابِ اجتہاد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔بہ حیثیت مجموعی اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کی جا سکتی ہے۔فارسی شعر و ادب کے شائقین اور علمی گھرانوں کا کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ رہنا چاہیے۔

ہفتہ وار صدق مورخہ 20/مئی 1940 جلد نمبر 6 پرچہ نمبر 3

(30) محمد حسین آزاد

از جہاں بانو بیگم صاحبہ،

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد۔

آزاد کے سوانح اور کلام، نثر و نظم پر تبصرہ دکن کی ایک خاتون کے قلم سے نکلا ہے۔ اصل مقالہ ایم اے کے امتحان کے لئے تیار کیا گیا تھا، وہی ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ طالب علمانہ کوشش کے معیار سے اچھا خاصا ہے لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے پیش کرنے میں مزید اہتمام کی ضرورت تھی۔ طنز و تعریض اور اپنے پیش روؤں کی تحقیر مصنفہ کے 'عرض حال' سے شروع ہو گئی ہے اور ادب و سوانح کی کتاب جا بجا 'کتاب الجدل' بن کر رہ گئی ہے۔ غلو کی مثالیں بھی کثرت سے ملیں گی۔ استدلالات اور بیانات میں نمایاں خامیاں ہیں مثلاً پہلے تو مولانا شبلی کے ایک خانگی مکتوب سے یہ فقرہ کھود کر نکالا گیا ہے کہ ''آزاد تحقیق کے میدان کا مرد نہیں'' اور پھر اس کی تردید میں سند پیش کی گئی ہے۔ حالی کے مرثیہ آزاد سے (ص 65) یا مثلاً آب حیات کی زبان کی داد دینے کے موقعہ پر حالی، سرسید، نذیر احمد کے علاوہ تقابل و موازنہ میں اکبر کا نام بھی خواہ مخواہ لے آیا گیا ہے۔ ص 73۔ زبان بھی نظر ثانی کے بعد زیادہ بہتر بنائی جا سکتی تھی۔ نو مشق اہل قلم کی ہمت افزائی یقیناً بہت ضروری ہے لیکن اسے بھی حدود مناسب کے اندر رہنا چاہئے۔ مصنفہ میں صلاحیت اچھی ہے امید ہے کہ تجربہ و مشق کی پختگی کے ساتھ خیالات میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

صدق نمبر 11 جلد نمبر 6 مورخہ 23/ جولائی 1940

(31) باقیات بجنوری (مجموعہ مضامین)

از عبدالرحمٰن بجنوری

مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

آج سے 25 سال قبل علی گڑھ کے حلقوں میں عبدالرحمٰن بجنوری کی خاص شہرت تھی۔علی گڑھ کے باہر بھی علمی وادبی حلقے ان سے خاصے روشناس تھے۔اپنے زمانے کے مشہور مضمون نگار تھے۔سنجیدہ اور ٹھوس علمی عنوانات پر شعروادب سے بھی خاص ذوق رکھتے تھے۔دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ انہیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔1918 کی وبائے انفلوئنزا میں عین عالم شباب میں رخصت ہو گئے۔باقیات انہیں کی تحریروں کے مجموعے کا نام ہے۔۔شروع میں ایک مضمون ٹیگور کی کتاب ''گیتا نجلی'' پر اور دوسرا وضع اصطلاحات علمیہ اور تیسرا ''سیر لکھنؤ'' کے عنوان سے ہے۔اس کے بعد ایک عنوان ہے ''داشتہ آید بکار'' اس کے ماتحت مکاتیب ہیں یعنی وہ خطوط جو مرحوم نے برلن اور لندن سے اپنے والد ماجد اور دوسرے عزیزوں دوستوں کو لکھے تھے۔آخیر میں مرحوم کی لکھی ہوئی چند نظمیں بھی ہیں۔

اس مجموعہ متفرقات یا کشکول میں نرم وگرم سب ہی طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں لیکن کام کی باتوں اور مفید اجزاء کا حصہ غالب ہے۔مفید اخلاقی، عقلی، تعلیمی اور تربیت وورزش جسمانی کے اعتبار سے بھی۔طرز تحریر ذرا پرانا ہوگیا کچھ تو اس لیے کہ خود تحریروں کو بھی 25-30 سال عرصہ ہو چکا ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ مرحوم تھے ہی مشرقیت کے زیادہ دلدادہ اس کشکول کے اندر کیا کچھ بھرا ہے اس کا پورا حال تو اصلی کتاب ہی سے معلوم ہوگا۔البتہ ذیل کے اقتباس سے ایک ہلکا اور سرسری اندازہ مرحوم کے طرزِ تحریر اور پروازِ خیال کا ہو ہی جائے گا۔25/ستمبر 1913 کو استنبول سے اپنے والد ماجد کے نام ایک طویل خط میں لکھتے ہیں:

''یہ سب کو معلوم ہے کہ ترک اپنی عیسائی رعایا کے مقابلے میں تعداد میں کم ہیں۔دولت اور تجارت عیسائی رعایا کے ہاتھ میں ہے مگر ان عیسائی اور ترکوں میں ایک فرق ہے جو ایک نگاہ میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ترکوں میں شرافت، جسارت، دیانت، تقوی، غرض انسانیت کا ہر جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ان عیسائیوں کی رزالت، بزدلی، فریب دہی، فسق و فجور کی زندگی بہائم سے کسی درجہ کم نہیں ...... سب سے بڑی خوبی جو ترکوں میں ہے وہ اخوت اسلامی کا وجود ہے۔ قسطنطنیہ ہی دنیا میں میں نے ایک ایسا مقام دیکھا ہے جہاں شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے۔عالی حضور خلیفۃ المسلمین جو مسند رسول اللہ کے جانشین ہیں سادگی اور اخلاق کی مجسم تصویر ہیں۔آپ کی نسبت مشہور ہے کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کو آفندم (میرے آقا) کے بغیر خطاب نہیں فرماتے۔

ترک صدیوں سے مغربیوں کے ہمسایہ ہیں مگر آج تک جس طرح آب کثیف میں پائے نگاہ تر نہیں ہوتے بے لوث ہیں۔اگر غور کیا جائے تو اس سے بڑھ کر قومی عصبیت اوزاسلامی اثر کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔'' ص 167-166۔

کتاب لیتھو میں نہیں ٹائپ میں چھپی ہے۔گرد پوش جلد وغیرہ دیدہ زیب۔شروع میں تعارف کے چند صفحے رشید صاحب کے قلم سے ہیں۔

ہفتہ وار صدق مورخہ 21/اپریل 1941 پرچہ نمبر 47 جلد نمبر 6

(32) بزم اکبر
از مولوی قمر الدین بدایونی
انجمن ترقی اردو دہلی

اکبر جیسے نامور سخن گوئی کی کوئی قابل ذکر سوانح عمری اب تک اردو میں موجود نہیں۔ کلام پر تبصرہ بھی ان کے شایان شان نہیں۔ کلام کا ایک خاصہ بڑا حصہ وفات سے ۲۰ سال گزر جانے پر اب تک غیر مطبوع اور ان کے صاحبزادہ کے پنجہ غصب میں محصور ہے اس صورت میں انجمن ترقی اردو کی یہ کوشش یقیناً قابل داد ہے کہ اس نے کچھ تو اس سلسلہ میں قدم بڑھایا اور ایک کتاب اوسط درجہ کی سہی اکبر کی سیرت وکلام پر شائع تو کرادی۔ بزم اکبر کے مصنف خود بھی شاعر ہیں، سخن فہم ہیں اور حضرت اکبر کے آخر زمانہ کے ملنے والے۔ لیکن تصنیفی تجربہ شاید زیادہ نہیں رکھتے۔ حالات انہوں نے اچھے خاصے جمع کر دیے ہیں۔ کلام پر تبصرہ بھی برا نہیں۔ لیکن اول تو وسعت موضوع کے لحاظ سے کتاب مختصر بہت ہے اور پھر کتاب کی ترتیب اور انتخاب مضامین میں بھی ترقی کی بہت کچھ گنجائش تھی حضرت اکبر معصوم یقیناً نہ تھے لیکن سیرت کی جن کمزوریوں کو نمایاں کرنے کی کوئی شدید قومی یا ملی ضرورت نہ ہو انہیں غیر واضح ہی رہنا چاہیے تھا، اسی طرح حضرت اکبر کے کلام پر تبصرہ کے ضمن میں مصنف کا بار بار اپنے یا اپنے عزیزوں کے کلام کو پیش کرنا یا اپنی اصلاحوں کا ذکر کرنا بھی مذاق سلیم کو بہت گراں ہے۔ مصنف اکبر صاحب کے سامنے بالکل...... تھے۔ لیکن لب ولہجہ جو اختیار کیا ہے وہ بالکل برابر والے معاصرین کا ہے۔ کلام پر گرفتیں جو کی ہیں ان میں سے اکثر خود قابل گرفت ہیں۔ توجہ جتنی مناقب اکبر پر کی ہے اس سے کچھ کم مثالب اکبر پر بھی ہے اور ذیل کے فقرے اور الفاظ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کس عالم میں قلم سے نکل نکل گئے ہیں۔

''خوداس جہل مرکب سے نہ بچ سکتے تھے۔'' 213ے کوئی بات نظم میں ادا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہومرحوم کو کہے جانے کی عادت ہوگئی تھی۔'' 213ے ''زیادہ گوئی کو بکنے کی حدتک پہنچادیتے تھے۔'' 213ے ''یہ شاعری ہے یا ہذیان بوقت بخار'' 215ے ''بے کار مباش کچھ کیا کر، کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر۔'' 215ے ''ک کا گرنا اکبر کی بلا جانے'' 216ے ''طفلانہ نقالی'' 217ے طفلانہ کوششیں 217ے ، ا۔ کاد بندہ عجوبہ اضافتین'' 220ے رکیک وغلیظ اشعار'' 221ے

خدانہ کرے کہ اس خوش تمیزی کی ہوا اردو میں عام ہوجائے اور خدانہ کرے انجمن ترقی اردو جیسی خود دار ادبی مجلس آیندہ ایسے خوش سلیقہ اہل قلم کا قلم آزاد رکھے چھوڑے۔

ان پہلوؤں کے باوجود کتاب فی الجملہ دلچسپ ہے اور اکبر سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لیے قابل مطالعہ

ہفتہ وار صدق پرچہ نمبر 8 جلد 7 23 جون 1941

(33) شرح درد
از خواجہ محمد شفیع دہلوی
نیا محل دہلی

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دور میں پرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے۔ خواجہ میر دردؒ کے اردو کلام کی یہ شرح شرح درد اپنے رنگ میں فرد خود انہیں کے قلم سے ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے، بلاغت قدم چومتی جاتی ہے۔ دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے! جی ہاں کھجور کے درخت سے، ان رسیلی شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لال لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چھکیے گا۔ ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلیے۔

''صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت ہر رگ [1] و ریشہ کام کا۔ پھول پتی کار آمد پھل غذا گٹھلی دوا۔ جڑیں مضبوط [2] بلند و بالا۔ [3] استوار۔ [4] سموم کے تھپیڑوں [5] سے جھک جائے دم کے دم میں پھر سیدھا، مرکز [6] سے جنبش نہیں، اپنی بقا [7] کے لیے کم از کم کا طالب۔ دوسروں کی بقا کے لیے زیادہ سے زیادہ حیات بخش۔ فروعات سے معرّی۔ چوٹی پر ایک گتھا [9] ہوا گلدستہ پھول پھل سب ایک جگہ، یکجہتی اور سلوک کا نمونہ سایہ [10] دور تک پھینکے۔ جگہ کم سے کم گھیرے۔ برگ و بار کی ہر فصل [11] یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلندی دے جائے۔ خود سپرد خاک [12] ہو کھاد بن جائے آنے والوں کے لیے بلند تر مقام کی بنا ہے۔''

بارہ کی اس گنتی میں ماہ ربیع الاول کی بارھویں کی بہار، بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار نئی تشبیب اور نئی گریز۔ مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے

اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پائیے۔

''جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا اسی دیس سے ایک دین چلا۔ کار آمد فطری اصول کا 1 حامل قوی الاساس 2 وسیع النظر 3 راستی و راست بازی کا عامل 4 دب دب کر 5 ابھرنے والا، مرکز 6 سے نہ ہلنے والا، آسانیاں اور فراخیاں 7 بہم پہنچانے والا لیکن تسلیم و رضا کا طلب گار۔ فرقہ بندی 8 سے غیر متاثر وحدت 9 کا پرستار مرکزیت کا دل دادہ اتفاق کا حامی رسم و رواج 10 کی پہنائیوں سے معرّیٰ ہلکا پھلکا دور رس، ترقی کا راستہ 11 دکھانے والا۔ فنا میں 12 بقا کا سبق دینے والا یہ وہ مذہب تھا جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے۔'' 1

زبان کی ان لطافتوں ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اردو کے بارہ پتھر سے باہر ہے۔

صدق نمبر 28 جلد 17 نومبر 1941

(34) نقد و نظر

از پروفیسر حامد حسن قادری

شاہ اینڈ کمپنی، آگرہ

نقد و نظر پر تبصرہ کرنے کے لیے خود بڑے صاحبِ بصیرت ہونے کی ضرورت ہے لیکن سرے سے آنکھ چرا جانا بھی بڑی بے بصری ہے۔

کتاب پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے زیادہ تر ایسے جو پہلے کسی رسالہ میں شایع ہو چکے ہیں لیکن اب اس مجموعے میں قرینہ سے سج کر تو سب نئے معلوم ہوتے ہیں۔ پندرہ میں سے چند عنوانات ملاحظہ ہوں: 1۔ غالب کی شرحیں، 2۔ میاں نظیر اکبر آبادی، 3۔ آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ، 4۔ خمخانہ ریاض، 5۔ زبان کے چند، 6۔ تنقید کے نئے زاویے، 7۔ عروضی غلطیاں۔

تنوع کے سرسری اندازے کے لیے یہ عنوانات کافی ہوں گے۔ اندازہ سرسری اس لیے کہ ادب و انشاء، تنقید، عروض، سخن فہمی کے جتنے عمیق نکتے اور جتنے وسیع مباحث کتاب کے اندر پھیلے ہوئے ملیں گے اس کا پورا اندازہ تو بس کتاب کے مطالعے سے ہی ہوسکتا ہے۔ فہرست مضامین کو نقل کر دینا یا کوئی چھوٹا موٹا تبصرہ بھی اس کے لیے ناکافی ہے------ کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مشرقی طلبۂ فن اور مشرقی عام ناظرین کے لیے۔ قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور ورجل کے ناموں سے نا آشنا ہوں وہ واقف بائرن، شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں اور اپنوں کے لیے لکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مجموعہ کا ایک مضمون 'مطالعہ شاعری' ان کا طبع زاد نہیں بلکہ میتھیو آرنلڈ کا ترجمہ ہے لیکن اس کو بھی اپنا لیا ہے۔ عبارت انگریزی نما اردو نہیں ٹھیٹھ اردو لکھ کر اور اشعار کا اپنی طرف سے جا بجا

اضافہ کر کے ------- البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں۔ انھیں یہ نہیں آتا کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پرشوکت اور مرعوب کن ناموں کا ڈال دیا جائے۔

کتاب اردوخواں طلبہ کے خاص کام کی تو نہیں ہے باقی عام شائقین ادب بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پورالطف ودلچسپی بھی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہت سے درس دینے والے اساتذہ بھی اگر اپنی کسر شان نہ سمجھیں تو اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ تین سو صفحات سے اوپر کتاب کے لیے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے ہر ہر تبصرے، ہر ہر خیال سے دوسروں کو اتفاق ہی ہو۔ شرح درد والے مضمون میں تو خصوصیت کے ساتھ فاضل مبصر کے تبصرے نظر ثانی کے محتاج نظر آئے لیکن بحیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، سموئی ہوئی کتاب فنِ تنقید پر اردو میں عرصے کے بعد دیکھنے میں آئی۔ جب طبیعت دوسرے رنگ کی صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی تنقیدی کتابوں سے اچھی خاصی اکتا چکی تھی۔

دوسری چیز سے قطع نظر ایک بڑا سبق ان صفحات سے یہ مل جاتا ہے کہ تنقید و تبصرہ کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہئے اور شاعروں ادیبوں نقادوں سے اختلاف، شدید اختلاف شریفانہ انداز میں بھی کیا جا سکتا ہے اور تضمین کلام غالب وغیرہ کے ضمن میں جہاں جہاں قادری صاحب نے خود اپنا کلام درج کیا ہے وہاں تو صرف یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرت تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ سخن فہمی کے ساتھ سخن گوئی کی دولت کم ہی جمع ہوتی ہے۔

صدق نمبر 34 جلد 8 مورخہ 4/جنوری 1943

(35) تنقیدی اشارے

از آل احمد سرور صاحب

نذیر اینڈ سنز، علی گڑھ۔

یہ سولہ ادبی عنوانات پر سرور صاحب کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ مضامین کا تنوع چند عنوانات سے ظاہر ہوگا۔

اکبر، اقبال، چکبست، رتن ناتھ سرشار، اودھ پنچ، اردو ناول وغیرہ ان سے اندازہ ہوگا کہ سرور صاحب موجودہ پر بہت کچھ کہہ گئے ہیں دیباچہ میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ وہ پرستار نہ صرف قدیم ادب کے یا نہ صرف جدید ادب کے ہیں بلکہ وہ دونوں کی جانب داری سے الگ ہیں۔ یہ بیان بڑی حد تک صحیح ہے۔ اس پر بھی شاید غیر شعوری طور پر گوشہ چشم ادب جدید ہی کی جانب ہو گیا ہے۔ انداز بیان سلیس و دلچسپ ہے الفاظ اور ترکیبیں کہیں کہیں ایسی آ گئی ہیں جو پرانے ادیبوں کو کھٹکیں گی۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی کتاب اردو ادب کے طلبہ کے مطالعہ میں رہنے کے قابل ہے اور ریڈیائی تقریروں کا جو اصل مقصد ہوتا ہے یعنی تفریح کے ساتھ تعلیم وہ اس مجموعے سے بخوبی پورا ہو جاتا ہے۔

صدق نمبر 9 جلد 9 مورخہ 28/جون 1943

(36) مداوا

از غلام احمد فرقت
یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ

'مداوا'' کے لفظی، معنی علاج یا دوا کے ہیں اور یہ کتاب حقیقتاً ایک ادبی مرض کا علاج ہے۔''ترقی پسندی کا مرض نثر کی مملکت اور نظم کی قلمرو دونوں میں وبا کی سی صورت اختیار کر چکا ہے۔''مداوا'' اسی درد کا مداوا ہے۔ ہومیو پیتھک اصول پر بطور علاج بالمثل فرقت صاحب نے ''ترقی پسند'' شاعر کے خاص خاص اکابر کی مشہور و مطبوعہ نظموں کو نمونہ رکھ کر خود اس رنگ میں بکثرت نظمیں کہہ ڈالی ہیں۔ اور ان میں جنسی بھوک کو خوب نمایاں کر دیا ہے۔ یہ ساری نظمیں اردو میں تعریض PARODY کی بہترین مثالیں ہیں اور فرقت صاحب کی قادر الکلامی کی شاہد عادل۔

فرقت صاحب کی طبع زاد اور بڑی دلچسپ نظموں کے علاوہ اس مجموعہ میں نثر کے مضامین بھی بکثرت ہیں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کے، بعض مشاہیر ادب کے قلم سے ان سے اس عریاں شاعری کی حقیقت خوب عریاں ہو جاتی ہے۔ مضمون نگاروں میں مسعود حسن رضوی، رشید احمد صدیقی، مرزا جعفر علی خاں اثر، خواجہ محمد شفیع دہلوی، سالک (انقلاب والے) نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی، علی عباس حسینی کے نام قابل ذکر ہیں اور مدیر صدق کا پیش لفظ بھی۔ نسبتاً کم معروف شخصیتوں میں صباح الدین عمری کا مضمون قابل مطالعہ ہے۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی نئی ادبی بد مذاقیوں کی اصلاح و تنقید کے سلسلہ میں ایک صحیح اور مفید اقدام ہے۔

صدق نمبر 44 جلد 9 مورخہ 20 مارچ 1944

(37) تنقیدی جائزے

از احتشام حسین صاحب، ایم۔اے،

صفحات، 298، قیمت 12 روپے، ناشر: ادارہ اشاعت حیدرآباد

''ترقی پسند ادب'' کی حمایت و وکالت میں سید احتشام حسین خاصا نام پیدا کر چکے ہیں، تنقیدی جائزے ان کے بارہ مطبوعہ تنقیدی مضامین کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن میں نہ تاریخی ترتیب ہے نہ بہ ظاہر کوئی اور ترتیب۔ اکثر مضامین کا موضوع ترقی پسند ادب اور نئی شاعری ہی کسی نہ کسی عنوان سے ہے۔ احتشام صاحب تنقید و ادب میں مارکسی نقطۂ نظر سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی ہیں، اس لیے ان کے مضامین تنقید کے اسی مخصوص و محدود نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے سمجھنے کے لیے پڑھنے والے کو مارکس و فرائڈ کے خیالات اور اصول تنقید سے واقفیت ہونی چاہیے، ''ان جائزوں'' کی افادیت قدرتاً انھیں حدود کے اندر محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

احتشام صاحب نے ایک سرگرم وکیل کی حیثیت سے ترقی پسند ادب کو دل پسند بنانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے نوجوانوں کے جذبات سے بھی اپیل کی ہے اور بار بار نئے رجحانات کو قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور کہیں کہیں استدلال و منطق کو بھی کام میں لائے ہیں۔ ان کی مارکسیت کا اثر اسلوب تحریر سے بھی نمایاں ہے اور لازمی طور پر ان کی عبارت کچھ خشک سی ہو گئی ہے۔ پڑھنے سے کوئی دیرپا ادبی مسرت بلکہ کوئی فرحت و شگفتگی مشکل ہی سے حاصل ہوئی ہے۔

احتشام صاحب کی تنقیدیں ہر فریقانہ و کسیلانہ تنقید کی طرح توازن و اعتدال کی دولت سے محروم ہیں۔ نئی اور اکثر نامانوس ترکیبوں اور فقروں کی افراط سے بعض اوقات وہ اپنا مافی الضمیر بھی شاید وضاحت سے ظاہر نہیں کر سکے ہیں۔ بعض جگہ یہ دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ احتشام صاحب نظیر اکبرآبادی، میر حسن دہلوی، چکبست لکھنوی

کے شعروادب پر کچھ فرمار ہے ہیں یا کسی علمی انجمن کے سامنے مابعد الطبیعات کے کسی شخصیت پر کوئی مقالہ سنار ہے ہیں۔

بہر حال یہ کتاب ایک خاص قسم کے طرز ادب کی ترجمانی کی سنجیدہ ومخلصانہ کوشش ہے اور جو لوگ ترقی پسند تحریک کو خود اس تحریک کے کسی رئیس وعلمبردار کی زبانی سمجھنا چاہتے ہیں انھیں یقیناً اس کتاب کے مطالعہ سے مدد مل جائے گی۔ کتاب کا بہترین مضمون فانی بدایونی مرحوم پر ہے۔ کاش مصنف کا عام رنگ بیاں یہی ہوتا!۔

صدق جدید، جلد 10، نمبر 44، 19/ مارچ 1945

(38) لکھنؤ کا دبستان شاعری

از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کے پیش کرنے پر مقالہ نگار کو مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور بالکل بجا ملی۔ ڈگری بارہا اس سے پست تر مقالوں پر مل گئی ہے۔

یہ مقالہ اس عام سطح سے کہیں بہتر و بلند تر اور کہیں بڑھ کر فاضلانہ و نادرانہ ہے علم و فن کی ترقی کے معنی ہی یہ سمجھے گئے ہیں کہ تنقید و تبصرہ میں تنوع اور جزئیات تک کی تدقیق بڑھتی جائے اور اس کی بہترین مثال یہ کتاب ہے ___ نام مقالہ کا اور در حقیقت ایک ضخیم کتاب طویل و عریض ہونے کے ساتھ ہی ایک حد تک عمیق بھی۔

''لکھنویت'' کا نام ہر پڑھے لکھے کے کان میں پڑ چکا ہے اور لکھنوی شاعری بھی سب کی زبان پر ہے۔ لیکن یہ سوال اگر کر دیا جائے کہ لکھنویت ہے کیا شئے ہے؟ اور لکھنوی شاعری آخر کن چیزوں میں غیر لکھنوی شاعری سے الگ ہے؟ تو اچھے اچھوں سے جواب نہ بن پڑے ابواللیث صاحب کی کتاب انہی سوالات کا بڑا مفصل جواب ہے اور ضمنی سوالات (کچھ متعلق اور کچھ غیر متعلق بھی) بہت سے اپنی طرف سے پیدا کر کے ان کے جوابات کی بھی کوشش کرتے گئے ہیں اور ساتھ ہی لکھنوی شاعری کے عیب و ہنر کا جائزہ بھی اپنے معیار و مذاق کے ماتحت لیتے گئے ہیں۔ شروع میں اودھ کی مختصر تاریخ اور لکھنؤ کے مذہب و معاشرت پر ایک نظر ناگزیر تھی۔ اس کے بعد شاعری اور شاعروں دونوں پر تبصرہ شروع ہوا ہے اور کہیں کہیں نوبت بال کی کھال نکالنے کی آ گئی ہے۔ خان آرزو اور سودا میر حسن و میر تقی میر سے لے کر یہ سلسلہ حسرت موہانی اثر لکھنوی اور آرزو لکھنوی پر ختم ہوا ہے۔

اتنے طویل وضخیم مقالہ میں رطب دیابس دونوں کا ملنا اور کلام کے ایک حصہ کا حشو ہونا بعض عبارتوں کا بے ضرورت ہونا ذرا بھی خلاف توقع نہیں۔ بعض الفاظ کی صحت واستعمال بھی نظر ثانی کا محتاج ہے مثلاً وجوہات رسومات، ماتمیانہ وغیرہ اگرچہ چنانچہ کی تکرار کہیں کہیں سلاست بیان میں مخل ہوگئی ہے۔ کہیں کہیں فقروں کی ترتیب میں انگریزیت کا اثر بھی نمایاں ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی لکھنؤ کی بزم سخن کاظم حسین محشر مرزا رسوا اور معیار پارٹی کے نقیب ابر کے بغیر کچھ سونی سونی سی نظر آتی ہے۔

نقد کلام سے بھی اتفاق رائے ہر جگہ ممکن نہیں۔ سن اور ذوق میں مزید پختگی کے بعد مصنف کو انشاء اللہ خود ہی ترمیم واصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ تاہم بحیثیت مجموعی مصنف سلمہ اللہ مذاق سلیم اور توازن سے اب بھی اچھے خاصے بہرہ ور ہیں۔ اور محسن کاکوروی جلیل اور حسرت موہانی پر ان کا تبصرہ ان کے حسن ذوق کی بین دلیل ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ لذت عشق کو نواب مرزا شوق کی مثنوی قرار دیا ہے اور شوق قدوائی کی لاجواب مثنوی ترانہ شوق پر تبصرہ بہت ہی سرسری کیا ہے۔ افسوس ہے کہ کتابت وطباعت کی غلطیاں کثرت سے موجود ہیں اور ایک عجیب پر لطف سانحہ ہے کہ خود مصنف کو بھی جابجا ماخذوں سے اغلاط طبع سے دھوکا ہوگیا ہے مثلاً ص 415 پر شوق قدوائی کا سال ولادت 1882 ایک خفیف شبہ کے ساتھ نقل کر دینا!

فی الجملہ کتاب خوب ہے اس کے روشن پہلوؤں کا پلہ اس کے کمزور پہلوؤں سے کہیں بھاری ہے۔ علی گڑھ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اردو ادب کی یہ اچھی سنجیدہ گراں قدر خدمت کرادی۔ کتاب کے آئندہ ایڈیشن یقین ہے کہ اس سے کہیں زیادہ نکھرے ہوئے نکلیں گے۔

صدق نمبر 50 جلد 10 مورخہ 30 اپریل 1945

(39) مرزا غالب کی شاعری

از مرزا محمد عسکری صاحب

صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔

مرزا صاحب کا ایک فاضلانہ مقالہ جو 1925 میں مسلم اکاڈمی، لکھنؤ میں پڑھا گیا تھا۔ بیس سال بعد اب کتابی صورت میں شایع ہوا ہے۔ بظاہر صرف ایک مقالہ ہے لیکن اس کے اندر غالب اور متعلقات غالب پر بہت کچھ آ گیا ہے۔ غالب کا ماحول، غالب کی شاعری کا نشو ونما، غالب کا نسب، غالب کا مذہب یہ سب مباحث اس میں سموئے ہوئے ملیں گے خصوصاً غالب کے مذہب پر گفتگو بسط و تفصیل سے ہے۔ مقالہ شیدائیانِ غالب کے کام کی چیز ہے اور اس کا بہترین تر مختصر حصہ وہ ہے جس میں اشعار غالب کی شرح وترجمانی کی گئی ہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل لکھنوی اصلاً اسی میدان کے مرد ہیں۔

صفحہ 3 پر فی الذہن الشاعر میں ذہن سے قبل ''ال'' زائد چھپ گیا ہے۔

صدق نمبر 33 جلد 11 مورخہ 4/ستمبر 1945

(40) میخانۂ ریاض
از تسنیم مینائی
دارالاشاعت اردو، حیدرآباد

ریاض خیرآبادی اس دور کے ایک خوش گوشاعر ہوئے ہیں۔ شاعر کے علاوہ انشاپرداز بھی۔ یہ ان کے حالات اور کلام پر ایک دلچسپ تبصرہ ان کے استادزادہ یعنی امیر مینائی کے پوتے تسنیم مینائی کے قلم سے ہے۔ اصل کتاب 65 صفحوں پر ختم ہوگئی ہے باقی حصہ انتخاب کلام کے لیے وقف ہے کسی تبصرہ وتشریح کے بغیر۔

تسنیم اچھے لکھنے والے ہیں ان کے بعض مضامین ان کی ادبیت وحسن انشاء کے شاہد عادل ہیں۔ ریاض کی نثر ونظم پر لکھنے کا انھیں حق حاصل تھا لیکن کتاب اس معیار کی نہیں جس کی ان سے توقع تھی---- اچھے مصنف ہونے کے لئے محض ذہانت و زباں دانی کافی نہیں۔ خاصی محنت اور وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کا حال یہ ہے کہ فہرستِ مضامین تک دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی اور مصنف نے اپنا تعارف اپنے قلم سے کرانے کے بجائے (صفحہ 18-19 کی عبارت اس مقصود کے لیے کافی نہیں) یہ خدمت ناشر غریب کے سر ڈال دی ہے۔ نیاز وغیرہ کی تحریروں کے لمبے لمبے اقتباسات درج ہیں اور بعض دفعہ مصنف کی رائے کو دوسروں کی رایوں سے ممتاز کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ پھر اس سارے حصہ میں اکثر اشعار کو بلاضرورت جلی قلم سے لکھنے کی روش نے ایک طرف تو کتاب کو نمائشی ضخامت دے دی ہے اور دوسری طرف مطالعہ کتاب کی روانی میں سہولت نہیں دشواری پیدا کردی ہے---- نتیجہ یہ ہے کہ مصنف کے حسن بیان کے باوجود کتاب اتنی دلچسپ نہیں رہی جتنی موضوع اور مصنف کی شخصیت دونوں کے لحاظ سے ہونی چاہیے تھی۔ صفحہ ۹۳ کے وسط میں لفظ ''متلاشی'' مصنف کے سنبھلے ہوئے قلم کے شایان شان نہیں۔ خدا کرے آئندہ ایڈیشن میں ہونہار مصنف کو زیادہ توجہ اور صرف وقت کا موقع مل جائے۔

صدق نمبر 33 جلد 11 مورخہ 4 ستمبر 1945

(41) ن۔م۔راشد
از حیات اللہ انصاری
ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ۔

ن م راشد اس زمانے کے ایک انوکھے اور نرالے شاعر ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ''نئے ادب''، ''نئی شاعری'' اور ''ترقی پسندی'' کے بے تکان ترجمان۔ ان کی شاعری پر بے شمار تنقیدیں نکل چکی ہیں اور اان کی ایک نظم ''انتقام'' تو شہرت یا رسوائی کے غیر معمولی حدود طے کر چکی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انھیں کے حلقے کا کوئی ذرا مذاق سلیم رکھنے والا قلم ہاتھ میں لے اور اس ''نئی شاعری'' کو جو آدابِ فن اور صحت زبان سے یکساں بے پرواہے اور اپنی عریانیوں کے لحاظ سے جرأت اور جان صاحب کو کہیں پیچھے چھوڑ آئی ہے کی قلعی کھول دے ----- قدرت نے یہ ضرورت حیات اللہ انصاری کے ہاتھ سے پوری کرا دی۔

یہ ناقد صاحب خود بھی خاصے مغرب زدہ ہیں۔ کتاب کا نام بھی انگریز کینڈے پر ہے اور کتاب کے اندر لفظ و عبارت کی عریانیاں بھی کچھ کم نہیں۔ پھر بھی لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ جہاں تک کتاب کے تنقیدی حصہ کا تعلق ہے وہ بہت خوب ہے۔ ناقد صاحب بہر حال لکھنؤ کے ہیں ذوقِ سلیم سے بہرہ مند ہیں اور اپنے دور کی ادبیات پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ادبی اور معنوی حیثیتوں سے چٹکیاں خوب خوب لی ہیں اور گرفتیں کس کس کر کی ہیں۔ آخر میں کلام شاعر کے دیباچہ نویس کرشن چندر کے دیباچہ پر بھی ویسی ہی بڑی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ بہر حال کتاب طلبۂ ادب کے کام کی ہے اور ہر اس شخص کے لیے قابلِ مطالعہ ہے جو راشد کا کلام پڑھ چکا ہے۔

ناقد میں صلاحیتیں بہت اچھی ہیں اگر وہ ان کا استعمال بھی ہمیشہ صحیح ہی کرتے رہیں۔

صدق نمبر 22 جلد 12 مورخہ 19/ جولائی 1946

(42) ادبی تبصرے

از بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

دانش محل، لکھنؤ۔

جس کی عمر خود ادبی تبصروں میں گزر چکی ہے اس کے تبصروں پر تبصرہ کرنا کسی بڑے مبصر ہی کا کام ہوسکتا ہے، ایسے ویسے نظر باز کا یہاں گزر نہیں ------- دانش محل والے دانش کے ساتھ بینش کے پتلے بھی۔ خوب سوجھ گئی کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو اکٹھا کر کے ایک مالا میں پرو دیا جائے۔

یہ تبصرے تعداد میں پندرہ ہیں اور زیر تبصرہ کتابوں میں نثر کے حدیقے اور گلستاں بھی ہیں اور نظم کے گلدستے و بوستاں بھی۔ اور جن شخصیتوں کی جھلکیوں سے یہ بزم ادب آراستہ کی گئی ہے ان میں ثقافت اور سنجیدگی کے ایسے ایسے بھاری بھرکم نمائندے بھی ہیں جیسے مولانا حالی، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی اور رنگینی اور نسائیت کے ایسے ہلکے پھلکے نمونے بھی جیسے واجد علی شاہ اور جان صاحب لکھنوی! ------ بیچ بیچ میں چلتے پھرتے مہدی گورکھپوری کے ادبِ لطیف اور ن۔م۔راشد کی ترقی پسندی کے۔

کتاب شروع ہوتی ہے جوش ملیح آبادی کا ''روح ادب'' پر تبصرہ سے اور ختم ہوتی ہے انھیں جوش صاحب کے ''آیات ونغمات'' کے تبصرے پر! گویا ہائے بسم اللہ بھی جوش اور تائے تمت بھی جوش! اچھا ہوا کہ جوش صاحب کی نومشقی اور پختہ کاری دونوں کے مرقع ایک ہی مجموعے میں آ گئے! --------۔

ڈاکٹر صاحب باتیں بڑے پتے کی کہہ جاتے ہیں اور کہیں کہیں بڑے مزے کی بھی۔ زبان میں بہت لوچ نہ سہی، نظر میں گہرائی تو ہے اور چاہے آپ ہر جگہ ان کی رائے کا ساتھ نہ دے سکیں لیکن یہ تو بہر حال مانی ہوئی بات ہے کہ وہ جو کچھ بھی

کہنا چاہتے ہیں صفائی، بے تکلفی اور صحت زبان کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ لکھنوی ٹھسے اور دہلوی چونچلے کے ساتھ نہیں بڑے مردانہ دھڑلے سے کہہ گزرتے ہیں اور پڑھنے والا جب کتاب بند کرتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ پڑھنے میں جو وقت لگا وہ ضائع نہیں ہونے پایا۔ کھویا کچھ نہیں اور سیکھ لیا بہت کچھ۔

البتہ ناشر صاحب اتنے سستے نہیں چھوٹ سکتے اور ایک ہی دہرے جرم کے مجرم ہیں۔ پہلا غضب یہ کیا کہ کسی مضمون پر تاریخ تک نہ ڈالی۔ کچھ نہیں پتہ چل سکتا کہ کون تبصرہ کب لکھا گیا اور پہلے اور آخری تبصرے کے درمیان زمانہ کا فاصلہ کتنا ہے۔ تبصرہ نگار اپنی ذاتی واقفیت سے لکھتا ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم 15 سال کی مدت حائل ہے۔ پہلا تبصرہ 1930 یا 1931 کا ہے اور آخری تبصرہ 1945 یا 1946 کا---------اس پندرہ سال کی مشاقی نے تو مولوی عبدالحق صاحب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہوگا۔ اور پھر دوسرا غضب یہ کہ کسی تبصرے کے مآخذ کا حوالہ کہیں بھی نہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ تبصرے کب نکلے، کس رسالہ میں نکلے، یہاں بھی ذاتی واقفیت کی بنا پر عرض ہے کہ تبصرے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں نکلتے رہے ہیں۔

جو ناشر کب اور کہاں کے اہم ترین سوالات کی طرف سے اتنا بے پرواہ ہو اس سے اس کی شکایت ہی کیا کہ کتاب پر دیباچہ یا مقدمہ کو ایک سطر میں نہیں اردو کے مشہور مقدمہ نویس (مقدمات کی کثرت قریب تھا کہ مقدمہ نویس کو مقدمہ باز میں تبدیل کر دے) کی کتب بغیر کسی مقدمہ کے۔

صدق نمبر 43 جلد 13 مورخہ 12/ مارچ 1947

(43) ناول کی تاریخ

از سید علی عباس حسینی

انڈین بک ڈپو، لکھنؤ۔

ناول تو اردو میں بہتیرے لکھے جا چکے، اچھے بھی، برے بھی اور دونوں کے بین بین بھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی خود ان ولایتی کہانیوں کی بھی کہانی کہہ ڈالتا اور سر راہے ان کے اچھے برے پر بھی ایک نظر کر جاتا------ حسینی اس کام کے لیے اٹھے اور خیالی قصے لکھتے لکھتے اب کے انھوں نے ایک واقعاتی سرگزشت لکھ ڈالی۔

پیش لفظ یا سرنامہ آپ سرسری اچٹتی نظر کے حوالے سے کرنا چاہیں گے۔ جب بھی 'کرشمہ' آپ کا دامن دل کھینچے بغیر نہ رہے گا اور عجب نہیں جو آپ دل ہی دل میں بول اٹھیں کہ اتنی مدت کے بعد یہ دوسرا محمد حسین آزاد کون پیدا ہو رہا ہے!

کتاب بہ یک وقت تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی۔ پہلا باب قدرتاً ابتداء و ارتقا پر ہے اور اس میں انسانی دماغ کے ارتقاء کے ساتھ ڈارون، مارکس، فرائڈ کے اثرات تک متعدد ذیلی عنوانات پر گفتگو آ گئی ہے۔ دوسرا باب ناول کی تعریف، ناول کے اقسام، ناول کے عناصر ترکیبی پر ہے اور شاعر و ناول نویس کے فرق کو بھی بتاتا جاتا ہے۔ تیسرا باب بڑا مفصل و مطول انگریزی زبان کے ناولوں پر ہے۔ قدرتاً اس باب کو پھیلا ہوا ہونا ہی چاہئے تھا۔ چوتھا باب اردو کے ابتدائی قصہ نویسوں پر ہے اور نذیر احمد کو لیتا ہوا حالی اور رشاد پر ختم ہوتا ہے۔ پانچواں باب سرشار کی نذر ہے اور چھٹے میں شرر اور محمد علی طبیب آ گئے ہیں، ساتویں باب میں سجاد حسین، عباس حسین ہوش، مرزا رسوا راشد الخیری ہیں اور آٹھواں پریم چند کے لیے وقف ہے۔ نویں باب میں مرزا محمد سعید، فیاض علی نیاز فتح پوری، شوکت تھانوی وغیرہ کے جانے پہچانے چہرے نظر آتے ہیں اور دسویں میں متفرق تقریریں ہیں۔

تاریخ کے بیان میں مصنف اچھے خاصے کامیاب ہو گئے ہیں اور انگریزی کے بھلے برے جتنے بھی قابلِ ذکر ناول نویس ہیں سب کا ذکر کر ڈالا ہے۔ اگر چہ اتنی وسعت فیاضی کے بعد ایم اسلم اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کا مستقل عنوان سے ذکر نہ ہونا طبیعت کو بہت کھلتا ہے۔ اسی طرح اچھے لکھنے والوں مرزا محمد سعید، شوکت تھانوی، نیاز فتح پوری کی محفل میں راجہ محمد حسین اصغر کا اجنبی چہرہ بھی دل کو کھٹکا۔ اسی وقت دریافت ہوگئی یعنی ان کا حسینی صاحب کا 'عزیز شاگرد' ہونا۔ صفحہ 394۔ مروت بھی آخر مشرقیت بلکہ بشریت ہی کا جز ہے! گو یہ گرانی بھی معاً ہلکی ہو جاتی ہے جب حسینی صاحب کا تعارفی نوٹ اس کتاب کے متعلق پڑھ لیا جاتا ہے۔

تنقیدی پہلو قدرتاً نازک تر تھا اور اس میں مصنف سے ہر جگہ اتفاق رائے دشوار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت جگہ وہ ناول نویس کی سیرت کشی بڑے جامع و مانع لفظوں میں اور بڑے دلکش انداز میں کر گئے ہیں مثلاً شوکت تھانوی کے متعلق کیا خوب کہہ گئے ہیں۔ ''وہ نہ گریجویٹ ہیں نہ مولوی فاضل، نہ مفکر ہیں نہ فلسفی، وہ صرف بلا کے ذہین اور صحیح معنوں میں حیوان ظریف ہیں۔ ان کے ناول فلاں اور فلاں اسی ظرافت و ذہانت کا نتیجہ ہیں جو ان کو مبداء فیاض سے ملی ہے۔

ان کے ناولوں کے پلاٹ سیدھے سادے اور مختصر ہوتے ہیں لیکن ان کی ظرافت انھیں غیر پیچیدہ پلاٹوں کے بیان میں ایسے ایسے گوشے نکال دیتی ہے کہ مجموعی اثر کے لحاظ سے وہ گلدستہ پنج بن جاتے ہیں، ان کی زبان ہلکی پھلکی نکھری ستھری ہوتی ہے۔ صفحہ 401،102۔

لیکن یہ توازن ہر جگہ قائم نہیں رہتا کہیں کہیں وہ معمولی تصنیفی شائستگی کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی تنقید کے ڈانڈے تضحیک سے بھی گزر کر سب وشتم سے مل مل جاتے ہیں۔ مولانا شرر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کو کوئی پرانا بغض ہے۔ وہ تنقید ادبی کے پردہ میں انتقام لینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ چند فقرے جا بجا سے ملاحظہ ہوں۔ ''اس میں شک نہیں کہ مولانا کے کام کی مقدار

بہت ہے اور بقول پروفیسر فراق گورکھپوری وہ مٹی کا پہاڑ سہی لیکن آپ کو اسے ٹھٹھک کر دیکھنا ضرور پڑے گا۔ صفحہ 272۔ ''زندۂ جاوید شخصیتوں کو مردۂ ابد کر کے پیش کرنا مولانا کی خصوصیت ہے۔ صفحہ 276۔ ''کیا اندازِ تکلم ہے کیا طرزِ تحریر ہے کس قدر بامحل الفاظ صرف کیے گئے ہیں زبان قلم تعریف سے قاصر ہے۔ صفحہ 277۔ مولانا کے نام نہاد ناولوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے جاہلوں کے اعتقاد کی ضرورت ہے۔ صفحہ 282۔

کچھ اسی قسم کی آوازہ کشی محمد علی طبیب پر بھی صفحہ 294 اور نذیر احمد غریب بھی اس ترقی پسندانہ نازک افگنی کے شکار اچھے خاصے ہوئے ہیں۔

حسینی صاحب زبان سلیس شستہ و دلچسپ تو لکھتے ہی ہیں بڑی بات یہ ہے کہ صحیح بھی لکھتے ہیں لیکن آخر بشر ہیں کہیں کہیں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ صفحہ 381 پر ''دونوں کافی ضخیم ہیں'' ''وکیل صاحب نے کافی پڑھا ہے'' یہ دونوں فقرے اس کی مثال ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بھی جا بجا تکلیف دہ ہیں۔ مثلاً صفحہ 367 پر مرزا محمد سعید کا سال تصنیف 1909 درج ہے اور صفحہ 372 پر ان کی ناول ''یاسمین'' کو 1908 کی تصنیف اس کے تین برس بعد بتایا گیا ہے۔

غرض یہ کہ اگر تضحیک و شتم کے حصوں کو خارج کر دیا جائے تو کتاب ادبی حلقوں کے لیے اچھی خاصی قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ مصنف ترقی پسند تو نہیں ہیں مگر ترقی پسندوں کی جانب ان کا گوشہ چشم کچھ غیر مخفی سا ہے۔ نائیوں کی برات میں سب ہی ٹھاکر کے مصداق شاید ہر ترقی پسند جس کا ایک آدھ افسانہ بھی چھپ گیا ہے اس کا حق دار ہو گیا ہے کہ ناول نویسوں کے اس مستقل تذکرے میں جگہ پائے۔

صدق نمبر 37 جلد 14 مورخہ 16/ اپریل 1949

(44) نیا ادب

از پنڈت کشن پرشاد کول

انجمن ترقی اردو، کراچی۔

کول صاحب خاصے پرانے اور مشاق لکھنے والے ہیں۔ متعدد ناولوں کے مصنف اور ایک آدھ رسالہ اور اخبار کے ایڈیٹر بھی لیکن ان کا کوئی تنقیدی اور مبصرانہ کارنامہ اب تک ایسا نہ تھا کہ اس کی بنا پر انجمن ترقی اردو جیسی اردو کی ٹکسالی مجلس ان کے تنقیدی مقالوں کو اپنی طرف سے شایع کرتی۔ اس لیے ان کے نام سے انجمن کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب پر اول نظر میں ذرا حیرت ہوئی لیکن کتاب کو پڑھ کہ وہ حیرت باقی نہیں رہی-------انجمن نے کتاب کے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی۔

کتاب ''نیا ادب'' سے متعلق چند متفرق مضمونوں کا مجموعہ ہے ان میں سے بعض پہلے چھپ بھی چکے تھے۔ پہلے باب میں قدرتاً نئے ادب کا تعارف ہے پھر نئے ادب کی افسانہ نگاری پر عام اور اجمالی تبصرہ ہے۔ ایسا تبصرہ جس کا سب سے زیادہ نمایاں عنصر اس کی صاف گوئی ہے۔ پھر نئے ادب کے سات مشہور و مقبول افسانہ نگاروں کو الگ الگ لے کر نام بہ نام ان کی فن کاری پر تبصرہ ہے ان سات میں سے چھ پر جچی تلی اور بڑی حد تک صحیح رائے زنی کی ہے۔ پہلے مغرب کے نقالوں کی اس خوبی پر خام تبصرہ ملاحظہ ہو۔

> ''مغرب کا اثر قبول کرنا ایک بات ہے اور مغرب کی نقالی بالکل دوسری بات۔ کون نہیں جانتا کہ شرر کا طرز افسانہ نگاری سر والٹر اسکاٹ کے آرٹ کا مرہونِ منت ہے۔ غالباً سرشار نے جب فسانۂ آزاد لکھا تھا تو تھیکرے اور ڈکسن کی افسانہ نگاری ان کے

سامنے تھی۔ لیکن شرر اور سرشار نے جو اثر والٹر اسکاٹ، تھیکرے یا ڈکسن سے قبول کیا تھا وہ ان کا جز دماغ ہو گیا تھا۔ مگر زبان اپنی تھی کیریکٹر اپنے تھے جس سوسائٹی کی تصویر کھینچتے اس کے رگ و ریشہ سے واقف تھے۔ نصف صدی ہونے آئی ان کا آرٹ آج تک مقبول اور زندہ ہے---- آپ کی یہ کیفیت کہ نہ خیال وہ مضمون آپ کا نہ کیریکٹر آپ کے حتیٰ کہ زبان بھی آپ کی نہیں اور جو کچھ ترجمہ کرتے ہیں اس کا سلیقہ نہیں۔ پراوسٹ اور لارنس کے بار بار چبائے ہوئے لقموں کو نگلتے ہیں ہضم نہیں کر سکتے ہیں، باہر نکال دیتے ہیں اور ایسی صورت میں کہ دیکھ کر کراہت آتی ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ آپ نقالی کرتے ہیں تو برا مانتے ہیں۔ پراوسٹ لارنس چیخوف دستروسکی یا زولا کو منھ چڑھانے سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ اپنی پونجی بھی ہونی چاہیے۔ صفحہ 58 اور 59۔

اتنے صاف گو نقاد سے سابقہ نقالوں کو شاید پہلی ہی بار پڑا ہو۔ اپندر ناتھ اشک کا عکس اس آئینہ میں یوں آیا ہے:-----

> ''زبان کھچڑی ہے وہی انگریزی فقروں کے بھونڈے ترجمے۔ ترجمے اور اس سے زیادہ بھونڈی ظرافت ادبیت اور حسن کاری تو آپ کے ہاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔''

اور راجندر سنگھ بیدی کی تصویر اس مرقع میں۔

> ''اسلوب میں نہ سادگی ہے نہ شوخی بے ساختگی شگفتگی اور پاکیزگی تو خیر بڑی چیز ہے ان کے ہاں کہاں سے آجائے گی۔ نئی اور بھونڈی اختراعوں کو ادبیت سے تعبیر کرتے ہیں اور نفسیاتی تجزیہ کے روگ کو حسن کاری سے۔''

کرشن چندر پرلے دے اس سے بھی زیادہ ہے اور عزیز احمد صاحب کو بھی ان کا حصہ رسدی پہنچا دینے میں کوئی بخل نہیں رکھا ہے۔ بچے ہوئے صرف دو ہیں پریم چند اور علی عباس حسینی اور بے شک ان دونوں کے قلم کی شرافت ان کا درجہ ان کے ساتھیوں سے بہت بلند کئے ہوئے بھی ہے۔ مصنف کو لغزش صرف ایک ہستی کے باب میں ہوئی ہے اور وہ ہستی عصمت چغتائی کی ہے۔ مصنف عجب نہیں جو اپنی CHIVALY (مردانگی) اس میں سمجھے ہوں کہ عورت ذات کے مقابلے میں ہمدردی زیادہ سے زیادہ رکھی جائے اور پردہ پوشی کر کے اس کے ہر عیب کو ہنر کی صورت میں پیش کیا جائے۔

چوتھا اور آخری باب نئی شاعری پر ہے اور اس میدان میں نقاد کی صمصام بے نیام اپنی کاٹ اس طرح دکھا رہی ہے-------- جوش ملیح آبادی کو بالکل بجا طور پر مصنف نے ان بے قافیہ کی شاعری کرنے والوں کی صف سے اس طرح باہر رکھا ہے جس طرح اس سے پیشتر وہ پریم چند کو ترقی پسندوں کی صف سے باہر رکھ چکے تھے۔

صدق نمبر 10 جلد 16 مورخہ 7/جولائی 1950

(45) چھان بین

از نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

دانش محل، لکھنؤ۔

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر اس وقت لکھنؤ کے ممتاز شاعر اور ادیبوں میں ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے 15 ادبی و تنقیدی مضمونوں کا ہے۔ پہلا مضمون چکبست کی شاعری پر ہے، دو مضمون اقبال پر ہیں اور بڑی مسرت اس کی ہے کہ لکھنوی مبصر کے قلم سے اقبال کی مدح اور واہ واہ میں ہیں۔ ایک مضمون اصغر گونڈوی کے دیوان نشاط روح پر مدحیہ تبصرہ ہے۔ دو چار مضمون مناظرانہ قسم کے ہیں اور آخر کے تین مضمونوں میں فراق صاحب کی خبر لی گئی ہے------ یہ خبر لی گئی ہے طنز یہ نہیں تعلّی اور خود ستائی شاعری کے مذہب میں جائز ہیں لیکن اس کے حدود وہاں بھی مقرر ہیں۔ ان حدوں کو توڑنے پھوڑنے والے بلکہ بار بار توڑ پھینکنے والے کو سزا کچھ تو ملنی ہی تھی اور ضرورت تھی کہ اس بت پندار پر ضرب لگانے والا کوئی بت شکن پیدا ہو۔

جناب اثر چکبست کی شاعری کے قائل ہی نہیں یہ کہیے کہ اس پر مٹے ہوئے ہیں۔ بعض دفعہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں چشم مروت تو نکتہ سنجی پر غالب نہیں آ گئی ہے؟------ جو مضمون کسی کی وفات کے معاً بعد یا اس کی برسی کے موقع پر لکھے جاتے ہیں (یا بالعموم لکھوائے جاتے ہیں) ان میں اکثر شدت تاثیر سے نادانستہ ہی سہی غلو یا مبالغہ ہو جاتا ہے اور یہی حال ان مضمونوں کا بھی ہے جو کسی کی رد یا جواب میں حالت اشتعال میں لکھے گئے ہیں۔ ایسے سارے مقالوں پر اگر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد نظر ثانی کر لی جاتی تو شاید اعتدال توازن اور سنجیدگی کی شان زیادہ نمایاں ہو جاتی اور برش قلم والے گرما گرم فقرے از خود حذف ہو جاتے۔

اثر صاحب ماشاءاللہ خود اہل زبان ہیں پھر صاحب علم و صاحب مطالعہ اس

پر عزیز جیسے محقق استاد کے شاگرد۔ خوب خوب داد نکتہ سنجی دی ہے۔ خصوصاً اقبال اور غالب کے بعض اشعار کی شرح وتوضیح میں۔ کتاب کے یہ حصے ادب اردو کے طلبہ کے بڑے کام کے ہیں------ البتہ ادبی مناظروں میں کہیں کہیں سامنے کی بات کچھ نظر سے اوجھل سی رہ گئی ہے اور اس کے بجائے بڑے بڑے طویل مباحثے شروع ہو گئے ہیں۔ مثلاً دہلی کے ایک صاحب نے لکھ دیا تھا۔ ''اہل لکھنؤ عورت کو رنڈی کہتے ہیں باقی تمام ہندوستان کے شرفاء اس لفظ کو عورت سے منسوب کرنا عیب لگانا خیال کرتے ہیں اور پنجاب کے ایک صاحب نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ اثر صاحب لکھنوی ہونے کی حیثیت سے قدرتاً اسے لکھنؤ کے ناموس پر حملہ سمجھے اور ورق کے ورق اس کے جواب کے نظر کر دیے۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی اور صاف یہ تھی کہ قدیم اردو میں دہلی لکھنؤ ہر جگہ رنڈی کا لفظ بیسوا کے محدود ومخصوص معنی میں تھا ہی نہیں بلکہ عورت کے مرادف اور اسی کا وسیع مفہوم رکھتا تھا۔ (الفاظ رانڈ اور رنڈوا اسی مادہ سے ماخوذ اب تک اسی وسعت مفہوم کی یادگار ہیں)۔ نور اللغات میں لفظ رنڈی کے معنی نمبر اول پر عورت ہی کے درج ہیں اور پھر ''کسبی'' نمبر دوم پر ہے۔ جلال کے سرمایۂ زبان اردو میں بھی رنڈی کے معنی عورت عموماً اور زن بازاری خصوصاً درج ہیں اور انفس النفائس مطبوعہ 1854 جو اردو کے قدیم ترین کتب لغت میں سے ہے رنڈی کا فارسی مرادف ''زن'' اور عربی مرادف صرف 'امراۃ' ہے۔ ادب کا ہر متعلم جانتا ہے کہ زبان میں ایسے تغیرات شاذ نہیں عام ہیں۔ لفظ 'خاوند' پہلے خداوند کا مرادف تھا اب محدود ہو کر صرف شوہر کے معنی میں رہ گیا ہے۔ لفظ 'آشنا' پہلے مطلق دوست کے معنی میں تھا اب ناجائز جنسی تعلق رکھنے والے کے معنی میں محدود ہو گیا ہے۔ اس طرح کی بیسیوں نہیں پچاسوں مثالیں تلاش سے مل جائیں گی۔ لفظ رنڈی بھی انھیں میں سے ہے۔

مقالوں کی ترتیب معلوم نہیں کس ضابطہ کے تحت رکھی گئی ہے اگر ترتیب سند وار ہے تو ہر مقالہ کے ساتھ اس کا سنہ تحریر لکھ دینا بہتر ہوتا۔ علیٰ ہذا جن رسالوں میں یہ نکل چکے ہیں ان کی تصریح بھی ضروری تھی۔

لکھنؤ اور لکھنویت کا مداح اثر صاحب سے بڑھ کر کون ہوگا لیکن اثر صاحب اندھی تقلید اور مدح سرائی سے کوسوں دور ہیں صفحہ 138 و صفحہ 139 پر قدیم لکھنوی رنگ کی کمزوریوں کو انھوں نے فراخ دلی سے تسلیم کیا ہے اسی طرح ان کا اقبال، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی وغیرہ کے کلام کی دل کھول کر داد دینا ان کی انصاف پسندی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

بھول چوک لازمہ بشریت ہے فارسی لفظ نمونہ پر عربی مصدر کی تنوین (نموناً صفحہ 46) اسی بشریت کی ایک مثال ہے۔

کتاب اب بھی زبان وادب کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ آئندہ ایڈیشن اگر بہتر ترتیب اور مصنف کی نظر ثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد نکلے تو مفید تر ہو جائے گا۔

صدق نمبر 11 جلد 21 مورخہ 21/ جولائی 1950

(46) دلّی کا دبستان شاعری

ازڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

انجمن ترقی اردو، کراچی۔

وصل کی رات کوئی بڑھا نا دیکھے!

شاعر نے مصرعہ جس موقع کے لیے کہا ظاہر ہے لیکن ہمارے ہاں ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقانہ مقالہ نویسی کا جو معیار قایم ہو گیا ہے اس سے بھی مصرعہ کا تعلق کچھ بہت دور کا نہیں۔ طوالت، درازنفسی، بات میں بات پیدا کرنا کچھ ان مقالوں کا شعار خصوصی سا ہو گیا ہے۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری تو 26x20 تقطیع کے چھ سو صفحات سے اوپر میں چھپی تھی یہ دلّی کا دبستان شاعری اس سے تو بہت کم صفحات کی ہے پھر بھی اچھی خاصی طویل ہے---------- یہ مقالہ نویس حضرات شاید حجم بڑھانے کے خیال میں سے بلاضرورت دوسرے ادیبوں کی رائیں نقل کرتے اور پھر خواہ مخواہ اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں اور پھر جو بات ایک فقرہ میں سیدھے اور سادہ طور پر کہی جاسکتی ہے اسے پیچ دار بنا کر اور گھوم گھما کر ایک صفحہ میں ادا کرنا کوئی بڑا ہنر سمجھتے ہیں۔

ہاشمی صاحب کی دبستان اس عام مشترک عیب سے تو خالی نہیں لیکن اور حیثیتوں سے بہت غنیمت بلکہ بعض حیثیتوں سے غنیمت ہی نہیں قابلِ قدر ہے۔ کتاب سات بابوں میں تقسیم ہے۔ پہلا باب صفحہ 22 تک دہلی کے سیاسی اور معاشی حالات پر ہے اس میں 1707 (دور بہادر شاہ اول) سے ختم 1857 دور بہادر شاہ ثانی تک کی گویا تمدنی تاریخ قائم ہے۔ یہ پس منظر قائم کرنے کے بعد دو بابوں میں بیان دہلی میں شعر و شاعری کا چرچا صفحہ 36 اور دہلی میں شاعری کا موضوع اور معیار صفحہ 51 پر ہے ان حصوں میں کہنا چاہیے کہ دہلی کا ادبی و شاعرانہ ماحول آ گیا ہے۔ چوتھے باب دہلی میں شاعری تا صفحہ 105 میں دہلی کی شاعری کے مختلف دور قائم کیے گئے

ہیں اور پانچویں باب دہلی شعراء تا صفحہ 272 میں دہلی کے مشہور شاعروں کے تذکرے اوران کے کلام پر تبصرے ہیں۔ چھٹا باب دہلویت کیا ہے تا352 کتاب کا اہم ترین باب اور گویا مغز کتاب ہے۔ سوال جو مصنف نے عنوان میں کیا تھا اس کا مختصر جواب بھی یہیں خود مصنف کی زبان سے سن لیجیے۔ ’’دہلویت میرے نزدیک خاص افتادِ ذہنی یا مزاج شعری کا نام ہے جس کا ظہور مخصوص تمدنی وتہذیبی اثرات کی وجہ سے ہوا۔ دہلی کا شاعر غم روزگار کا ستایا ہوا اور غم عشق کا مارا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک آ گئی ہے۔ سیاسی حالات نے اسے بنایا۔ تصوف کی میراث نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔ اس نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف سے کھولیں۔ اس کے سطحی پہلو نے عشق پرستی کو عام کیا مگر اچھے شعراء نے اس میں اندر ڈوب کر عشق حقیقی کے منازل طے کیے۔‘‘ صفحہ ب-ج۔

ساتواں باب دہلی کی زبان اور شاعروں کی عہد بہ عہد اصلاح زبان پر ہے اوراس ضمن میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے اختلافات، نحو ولغت ومحاورہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب اس میں شبہ نہیں بڑی محنت اور بڑے ہی وسیع مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ البتہ معاصرین یا بعض قریبی متقدمین کی رایوں سے تعرض بلا ضرورت ہے یہ تعرض کبھی تو تائید کے لیے ہوتا ہے اور اکثر تردید کے لیے۔ یہ مرض تحقیقی مقالوں میں عام ہے۔ غنیمت ہے کہ اس کتاب میں ایسی بھرتی کی عبارتیں نسبتاً کم ہیں۔ ہاشمی صاحب کی اپنی رائیں عموماً جچی تلی اور ذوق سلیم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں لیکن یہ بار بار فراق گورکھپوری کا نام لانا ذرا کھل گیا----- جیسے فراق صاحب بھی کوئی امام فن اور محققین سخن سنج حسرت موہانی یا نظم طباطبائی یا برجموہن ناتھ کیفی کی ٹکر کے ہیں۔

ہاشمی صاحب زبان عموماً صحیح اور صاف لکھتے ہیں کہیں کہیں چوک بھی گئے ہیں مثلاً:

(1) ''دہلی والوں نے اسے اپنی اصلی طبیعت کے مطابق نہیں پایا'' صفحہ 68 موقع ''نہ پایا تھا'' کا تھا۔

(2) ''مومن معاملہ بندی اختیار کیے ہوئے ہیں اور غالب مختلف بہروپ بھر رہے ہیں کہیں رند ہیں کہیں ولی۔'' صفحہ 98۔ بہروپ بھرنا محل ذم پر آتا ہے اور سیاق مصنف یہ مقصود ذرا بھی نہیں بتلا رہا ہے۔

(3) ''بادشاہ کو بھی وہی رنگ پسند تھا اس نے اس لیے ذوق کو ملک الشعراء کا خطاب دے رکھا تھا۔'' صفحہ 94۔ دے رکھا تھا اس پر لکھنویت سے کہیں زیادہ پنجابیت کا ترجمان ہے۔

(4) ''ان کا گلزار کہیں کہیں رنگین تو ہے لیکن خوشبو کہیں نہیں'' صفحہ 95۔ خوشبو اس معنی میں فارسی میں بیشک آتا ہے اور اب اردو والوں نے صفت کے لیے خوشبودار گڑھ لیا ہے اور خوشبو کو بو اور بدبو کی طرح اسمیت کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

کتاب عرق ریزی کے ساتھ نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی بڑی خوش ذوقی کے ساتھ بھی لکھی گئی ہے۔ اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے خوب کیا جو اسے اپنی فہرست مطبوعات میں جگہ دے دی۔ اس کا شمار انجمن کی قابلِ قدر کتابوں میں رہے گا۔ لیکن انجمن کے عملہ نے طبع کتاب کی نگرانی میں اپنی بے توجہی کا ثبوت تکلیف دہ حد تک دیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی سرورق پر لفظ قیمت درج کر کے آگے جگہ دونوں صفحوں پر سادہ چھوڑ دی۔ اسی طرح فہرست ابواب کے نیچے بجز ابتدائی تین بابوں کے اور کسی باب کے صفحے درج ہی نہیں کیے۔ پڑھنے والے کی طبیعت کا جھنجھلانا ایسے موقع پر بالکل قدرتی ہے۔

صدق نمبر 15 جلد 16 مورخہ 18 / اگست 1950

(47) ایم اسلم اور اس کا عہد:
از خواجہ بدر السلام صاحب فروغی،

232 صفحے، مصور و مجلد مع گرد پوش، قیمت چار روپے، دار البلاغ اقبال روڈ، لاہور (پاکستان)

کتاب لکھنا لکھانا تو مصنف کا کام ہوتا ہے۔ اور ناشر کا کام صرف اس کا چھاپ دینا شایع کرنا ہوتا ہے۔ یہاں یہ کتاب لکھی ہوئی ایک ناشر کی ہے اور ہے کس پر؟ ایک مصنف پر! - مصنف یہاں بجائے مصنف کے موضوع تصنیف! اور ناشر اپنی چھپنے والی کتاب کے آپ مصنف! - مصنف غریب کو اپنی کتاب کا ناشر تو اضطراراً کبھی کبھی بن جانا ہی پڑتا ہے۔ لیکن ناشر کے ارادۃً مصنف بننے کی مثال اردو میں شاید پہلی ہی ہے؟ - ایک قلمی بدعت، ایک ادبی عجوبہ، جدید بھی اور لذیذ بھی!

ایم اسلم صاحب پنجاب کے ایک کہنہ مشق اہل قلم اور مقبول ناول نگار ہیں۔ اور اب معلوم ہوا کہ خوش نصیب بھی ہیں۔ کتاب ان کے ''آرٹ'' پر ان کے کمال فن پر۔ معاصرین کے قلم سے نکلے ہوئے 14، 15 مضمونوں کا مجموعہ ہے - اتنے معاصرین کی شہادت کس کے نصیب میں آتی ہے، بجز گنے چنے خوش نصیبوں کے؟

خوش قسمتی قابل رشک ہی ہے۔ مصنف سے کام نکل جانے کے بعد اتنے خوشگوار تعلقات اردو کے کس پبلشر نے قایم رکھے ہیں۔ دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں سے بحث نہیں۔ سوال اپنے ملک اور اپنی زبان کا ہے۔ اپنے ہاں ناشر صاحبان کی طرف سے یہ خاطر داریاں اور مدح سرائیاں ''اگریمنٹ'' پر دستخط ہو جانے کے بعد کس مصنف کے حصہ میں آئی ہیں؟ - خوش قسمت ہی نہیں، قابل رشک ایم اسلم!

فروغی صاحب کے مصرع طرح پر طبع آزمائی کرنے والوں میں بعض خوب جانے پہچانے ہوئے چہرے بھی ہیں! ڈاکٹر زور (حیدر آبادی) ڈاکٹر ابو اللیث

صدیقی (علیگ) رئیس احمد جعفری ندوی، شاہد احمد دہلوی (ساقی والے) جاوید اقبال، اشرف صبوحی دہلوی۔ وقس علی ہٰذا۔ بعض کے مصرعے بحر طویل میں بھی جا پڑے ہیں۔ بیت الغزل آخر کے وہ راز و نیاز ہیں جو ناشر اور مصنف مادح و ممدوح کے درمیان ہوئے ہیں۔ ایک طرف سے سوال دوسری طرف سے جواب: اخلاص باہمی کے مرقعے!

شروع میں ''دو لفظ'' مدیر صدق کے قلم سے ہیں۔ انھیں مطالعۂ کتاب سے پہلے یہیں ملاحظہ فرمالیجیے:

''ایم اسلم صاحب بہت لکھتے ہیں۔

جلد لکھتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوب لکھتے ہیں۔

ان کا ''قلم'' حقیقت رقم ہے۔

ان کی ''زبان'' شرافتِ ترجمان ہے۔

ان کا دماغ ''سلجھا ہوا اور فہمِ سلیم کا نقیب ہے۔

ان کا ''قلب'' ایمان سوز اور تڑپ کا سرمایہ دار ہے۔

انھوں نے ناول اور افسانہ کو ایک عبادت بنادیا۔

وہ وقت کے بہت سے شیطانوں کے حق میں ایک مجسم لاحول ہیں۔

وہ اقبالؒ کے صحبت یافتہ اور شاگرد ہیں اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اس صحبت اور شاگردی کا حق ادا کردیا۔''

صدق جدید، نمبر 25، جلد 1، 18/ مئی 1951

(48) انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب:
ازنواب مرزا جعفر علی خاں اثر
148 صفحہ، قیمت دو روپیہ آٹھ آنے، مجلد، پتا: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

کتاب دراصل ایک ادبی مناظر کی روداد ہے۔ایک فریق ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (استاد انگریزی لکھنؤ یونیورسٹی) اور نیاز صاحب ایڈیٹر ''نگار'' اور دوسری طرف جناب اثر لکھنوی، اصل مضامین 'نگار' میں چھپ چکے ہیں۔اب یہ جواب الجواب اثر صاحب نے الگ کتاب کی صورت میں شایع کردیا ہے۔اور اس میں اپنے دو مقالے اور اضافہ کردیے ہیں۔ایک ''میر انیس کے ایک مرثیہ کا تجزیہ اور اس کے محاسن'' (ص:95-126) کے عنوان سے اور دوسرا مرزا دبیر کے ایک مرثیہ کی تشریح وتنقید (ص:127-148)- فاروقی صاحب نے حملہ آور کی حیثیت سے قدم بڑھایا ہے، اثر صاحب نے دفاع میں گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ٹکر بہر صورت زبردست ہے۔

کتاب پر تبصرہ اور اثر صاحب اور فاروقی صاحب کے درمیان محاکمہ ہے ذرا مشکل، ایک غیر شیعی کے لیے! فاروقی صاحب کی ''فاروقیت'' سے دھوکا نہ ہو۔ ولائے اہل بیت میں ان کا بھی وہی عقیدہ ہے جو اثر صاحب کا ہے- مرثیہ ایک صنف شاعری کی سہی، پھر بھی اس کا تعلق ادب سے کہیں زیادہ مذہب سے چلا آرہا ہے اور میر انیس کے کلام کے ساتھ تو مذہبی عقیدت کچھ ایسی وابستہ ہوگئی ہے کہ اس پر خالص ادبی تنقید عجب نہیں جو خود ایک ''بے ادبی'' قرار پاجائے! میر انیس امام باڑہ میں! میر انیس مجلس عزا کے منبر پر، ان میر انیس سے یقیناً بالکل مختلف ہوں گے جو کالج کے کلاس روم میں ادبی اسپتال کے آپریشن ٹیبل پر پہنچادیے جائیں!- ہمارے اہل سنت میں بھی اگر کوئی منچلا، سنائی اور عطار اور مغربی اور شمس تبریز اور سلطان ابوسعید اور خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ جیلانی کے کلام کا خالص ادبی ولسانی تجزیہ کرنے

لگے تو خوش عقیدہ جماعت میں سے کون اس کا روادار ہو سکے گا؟

میر انیس کے باکمال شاعر ہونے میں شبہ نہ فاروقی صاحب کو ہے نہ اثر صاحب کو، سوال صرف یہ ہے کہ کاملین فن میں انیس کا درجہ کیا ہے! یہیں سے مداح محض اور ناقد کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ بحث نازک ہے اور اس کا فیصلہ کتاب کے تبصرہ نگار کے ذمہ ہے بھی نہیں خوش ہونے کی بات یہ ہے کہ نقد شعر و ادب کے بہت سے گر اثر صاحب کی زبان سے بیان ہو گئے ہیں۔ اثر صاحب ماشاء اللہ اہل زبان ہیں اور پھر ایک پرانے منجھے ہوئے شاعر۔ خوب خوب نکتے انھوں نے پیدا کیے ہیں اور خوب خوب داد سخن سنجی دی ہے۔ گو جا بجا لہجہ میں مناظرہ کی تلخیاں سخن فہمی و نکتہ رسی کی مٹھاس پر غالب آ گئی ہیں۔ جمال کی تابش کے جلو میں جلال کی تپش بھی!

شکر کے ساتھ ساتھ ایک شکایت بھی سن لیجیے۔ انیس لکھنوی اور اردو کے مایۂ ناز کے کلام کی جانچ پرتال کے لیے بات بات پر حوالہ ارسطو اور اس کے شارحین و مترجمین کا، ہلٹن کا اور کارلائل کا بوجر کا اور ہڈسن کا! - اپنے دسترخوان کی خوشبودار بریانی اور مزعفر کے ہوتے ہوئے للچائی ہوئی نظریں ''صاحب'' کے میز کی ابلی ہوئی ترکاری اور بساہندی مچھلی پر!

چوں کوے دوست ہست بہ صحرا چہ حاجت ست!

سطروں کی سطریں وہ گب کی گرامر آف گریک لٹریچر سے اس بے تکلفی سے نقل کرتے چلے گئے ہیں کہ جیسے اس میں انھیں کوئی توہین بھی لکھنوی خودداری اور مشرقی خود اکتفائی کی محسوس نہیں ہوئی ہے! مانا کہ اس کی ابتدا فاروقی صاحب کی طرف سے ہوئی لیکن کیا ضرور تھا کہ بدعت کے مقابلہ میں جوابی بدعت بھی جاری رکھی جاتی!

گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا!

اثر صاحب کے جوش بیان کو دیکھ کر کہیں کہیں بلکہ اکثر یہ اثر پڑتا ہے کہ انیس کے حق میں وہ ہمہ داد اور ہمہ تحسین ہیں۔ یہاں تک کہ اس مصرعہ کی داد میں انھوں نے مدح و تحسین کے موتی بکھیر دیے ہیں۔ ع

گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر! (ص:102)

لفظ ''مہیا'' بے شک آمادہ و مستعد کے معنی میں ہی آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ محل استعمال شاید آج پہلی ہی بار دیکھنے میں آیا۔ لیکن ایک جگہ اثر صاحب نکتہ چینی کا بھی فرض ادا کر گئے ہیں۔ ص:112 پر وہ پورا بند نقل کر کے جس میں یہ مصرعہ بھی ہے

تیغ و سپر میں ہے شہ مرداں کی چال ڈھال

اس پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

انیس کے زمانہ میں صنعت مراعاۃ النظیر کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ انیس بھی اس بلا سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چوتھے مصرعہ میں تیغ و سپر کی رعایت سے چال ڈھال لائے۔ اور بس اسی گورکھ دھندے میں الجھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ'' الخ

لیکن خود بھی ماشاء اللہ زندہ دل ہیں۔ اس مثال سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ خود اس صنعت لطیف سے کورے ہیں۔ ص: 70 پر ایک بڑی لمبی بحث لفظ PURGATIVE (جلاب) کے سلسلہ میں شروع ہوئی ہے۔ ص:73 پر پہنچتے پہنچتے یہ فقرہ ان کے قلم سے نکل آتا ہے۔

''ارے صاحب اسی طرح PURGATIVE! تنقید کی ضرورت ہوتی ہے۔ خطابت میں یہ عمل عمل کے بغیر ہو جاتا ہے۔''

''جلاب'' کے ضلع میں ''عمل''! خوب اور بہت خوب!

کتاب بہ حیثیت مجموعی ادب اردو کے ہر طالب علم کے کام کی ہے۔ مبتدیوں کے لیے بھی اور منتہیوں کے لیے بھی۔ دلچسپ اور پُر بصیرت۔ کتاب کے شروع میں فہرست مضامین درج کرنا ضروری تھی۔

صدق جدید، نمبر 29، جلد 1، 15 جون 1951

(49) ذکر غالب:

از مالک رام صاحب ایم اے۔

232 صفحہ، قیمت......، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی۔

پنجاب کے مالک رام صاحب غالبیات کے ماہروں میں ہیں اور غالب شناسی کے ایک ممتاز مالک۔ ذکر غالب ان کے قلم سے عرصہ ہوا نکل کر چھپ چکی تھی۔ اور اب یہ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے۔ پوری نظر ثانی اور معقول اضافہ کے بعد کتاب قابل قدر پہلے بھی تھی اور اب تو اور زیادہ جامع و متوازن ہو کر نکلی ہے۔ تین حصوں میں تقسیم ہے۔

پہلا باب:	سوانح حیات	(ص:9-114)
دوسرا باب:	تصنیفات	(ص:110-156)
تیسرا باب:	عادات واخلاق	(ص:157-230)

اور ان کے اندر غالب کی ذاتی زندگی و شخصی حالات کمالات فن، سیرت، کردار، تینوں پر اچھے خاصے اور مستند معلومات جمع ہو گئے ہیں۔

عنوانات ہر ہر باب میں کثرت سے ہیں ضرورت تھی کہ ان سب کو فہرست مضامین میں درج کیا جاتا۔ اس نوعیت کی کتابوں میں فہرست کا اتنا غیر ضروری اختصار اور بے محل اجمال طبیعت کو بہت کھل جاتا ہے۔

کتاب غالبیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ البتہ جی یہ چاہتا تھا کہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب بھی اچھا خاصہ اس میں موجود ہوتا - ایک کمی اور محسوس ہوئی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم (والی رامپور) شاگرد غالب کے نام سے جو دیوان چھپا ہے اس میں غزلوں کا رنگ استاد کے رنگ سے اس غیر معمولی حد تک ملتا جلتا ہوا ہے کہ بعض بعض شعروں پر تو وجدان کو یقین بھی نہیں آتا کہ وہ بجز غالب کے کسی اور کے

ہو سکتے ہیں۔اس مسئلہ پر ذکر غالب کے صفحات میں روشنی پڑنی ضروری تھی۔

کتاب ہر غالب دوست و غالب پسند پڑھے لکھے کے مطالعہ میں آنے کے قابل ہے۔کتابت کی غلطیوں کی کثرت افسوسناک حد تک ہے۔شروع میں غالب کی وہ تصویر درج ہے جو اب تک زیادہ شایع نہیں ہوئی ہے۔اور اس میں غالب زیادہ بوڑھے نہیں صرف ادھیڑ عمر کے معلوم ہوتے ہیں۔ایک چھوٹا سا دیباچہ بھی ڈاکٹر عابد حسین کے قلم سے ہے۔

صدق جدید، نمبر 29، جلد 1، 15 جون 1951

(50) ناول کیا ہے:

ازڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم،اے۔پی ایچ ڈی،استادانگریزی،لکھنؤ یونیورسٹی،
ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ایم اے،پی،ایچ،ڈی۔استاداردولکھنؤ یونیورسٹی،
200 صفحہ، قیمت دوروپیہ چارآنے،دانش محل،امین الدولہ پارک،لکھنؤ۔

رونے اور گانے کی طرح ناول لکھنا بھی کسے نہیں آتا،لیکن جب رونا اور گانا بھی مستقل فن قرار پاچکے ہیں اوران کی فنی باریکیوں پر دفتر کے دفتر تیار ہونے لگے،تو ناول غریب کیوں کتاب سازوں کی زد میں آنے سے بچتا اور کب تک بچار ہتا! ناول کیا ہے! کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔''ناول کے عناصر''اور ناول کی اہمیت سے لے کر''ناول کا مستقبل'' تک 10 بابوں میں اپنے قایم کیے ہوئے سوال کا جواب دو استادوں نے مل کر دیا ہے۔ایک استاد انگریزی کے ایک استاد اردو کے۔دونوں ایم، اے اور ڈاکٹریٹ حاصل کیے ہوئے۔خیال یہ ہوتا ہے کہ ان سے بہتر لکھنے والے اس موضوع پر اور کون دستیاب ہوں گے۔قلم کی معنویت کے باوجود تصنیف کے اندر وحدت قایم ہے اور''بوقلمونی'' کے بجائے یک رنگی بجائے خود ایک دلیل مصنفین کی خوش قلمی کی ہے۔

کتاب اپنے خاص حدود کے اندر اچھی ہی کہی جانے کے قابل ہے۔بڑی معلومات سے اور اہم فنی جزئیات سے لبریز بلکہ لبالب۔لیکن خود وہ''خاص حدود'' کیا ہیں؟ وہ حدود وہی ہیں جو فرنگستان کے حدود اربعہ میں ہیں۔ہمارے فاروقی اور ہاشمی کا معیار ناول نویسی تمام تر بس وہی ہے جو فرنگیوں کا ہے! اس میں کوئی مضایقہ نہ تھا اگر یہ دونوں صاحب اردو خوانوں کی سہولت کے لیے ایک کتاب یورپ کے ناول نویسوں کی''ٹکنیک'' پر لکھ دیتے جس طرح یوروپین شاعری پر، یوروپین معاشرت پر، یوروپین اخلاق پر تعارفی کتابیں بے تکلف لکھی جاسکتی ہیں۔لیکن اس کتاب کی

حیثیت محض ''سبق بیانیہ'' کی نہیں، سطور بین السطور دونوں کے لحاظ سے یہ تو ایک قصیدہ ہے۔ مدحیہ ناول نویسان فرنگ کے حق میں اور ہجویہ بدنصیب ناول نویسان اردو کے لیے! ہاتھ میں پیمانہ تمام تر ولایتی ہے۔ اس سے نذیر و سرشار، شرر و راشد الخیری ایک ایک کو ناپا گیا اور نتیجہ میں فیل کیا گیا ہے! ۔ٹھیک ایسا ہی جیسے کوئی غالب کی شاعری کو فرنگی شاعری کے معیار سے جانچے اور غالب کے فیل ہونے کا اعلان کرے!

کتاب ناولوں اور ناول نویسوں پر ہے۔ ناولانہ دلچسپی سے خود بالکل تہی دامن کیسے رہ سکتی تھی

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد!

طلبہ فن کے لیے یقیناً کام کی بھی بہت سی باتیں اس میں مل جاتی ہیں پھر بھی بعض جگہ جزئیات اور تفصیلات کے ایسے الجھاوے شروع ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن اکتانے لگتا اور طوالت بیانی سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔ ''صبر آزما خطابت'' (ص:165) صرف کٹر ''وہابیت'' والے نذیر احمد ہی کا حصہ نہ تھی وہی ''صبر آزما طوالت'' معلوم ہوتا ہے کچھ شیوا بیان نقادان ادب کے حصہ میں بھی آ گئی ہے۔

''شوکت آرا'' آج پہلی بار معلوم ہوا کہ ''نذر سجاد خاتون'' کی تصنیف ہے! (ص:116) شرر غریب جن کی عمر عزیز کا بہترین حصہ یورپ اور اسلام کی تاریخ ہی کے مطالعہ کی نذر رہا، اور جن کے قلم نے تاریخ کے خشک موضوع میں نئے سرے سے جان ڈال دی ان کی نسبت مصنفین کا باین علم و دانش یہ رائے زنی کرنا کہ

''بے جان کردار نگاری کے علاوہ انھوں نے تاریخ کے ماخذوں میں بھی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ صرف دلچسپی پیش نظر رکھی ہے وہ بھی سطحی اور سستے قسم کی'' (ص:173) اور ان کے ''نام نہاد، تاریخی ناولوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے جاہلوں کے سے اعتقاد کی ضرورت ہے (ایضاً)

خود ان نقادوں کے مبلغ علم تاریخ کی طرف سے اچھی خاصی بدگمانی پیدا کر دیتا ہے۔

مصنفین کی زبان عموماً صاف و صحیح ہے۔ لیکن لفظوں، فقروں، ترکیبوں سب پر جا بجا اثر انگریزیت کا ہے اور کہیں کہیں تو ترجمہ پَن نمایاں ہوگیا ہے۔ مثلاً ''سستے'' قسم کی دلچسپی (ص: 173) یہ ''سستے'' اردو کے لیے بالکل نامانوس ہے۔ انگریزی Cheap کو ایسے موقع پر اردو میں ''عامیانہ'' سے ادا کرتے ہیں۔

فہرست مضامین شروع میں ضرور درج ہے۔ لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ صفحوں کے نمبر سرے سے غائب! کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا باب کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم!

صدق جدید، نمبر 31، جلد 1، 29 جون 1951

(51) کلاسکی ادب

از خواجہ احمد فاروقی صاحب،

252 صفحہ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

یہ علاوہ مقدمہ کے 15 تنقیدی مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں:
(1) جنگ آزادی میں اردو کا حصہ۔ (2) ذکر میر: خودنوشت کی حیثیت سے۔
(3) غالب اور آرزوہ۔ (4) مومن دہلوی۔ (5) ریاض کی شگفتہ نگاری۔
(6) حسرت موہانی۔

مصنف کا شمار تو شاید ''ترقی پسند'' ناقدوں کی صف میں ہوتا ہے لیکن چند عنوانات جو بطور نمونہ درج ہوئے، خود ظاہر کرتے ہیں کہ مصنف کی ''ترقی پسندی'' کچھ ''ٹکسال باہر'' ہی ہے۔ بھلا جو میر تقی میر اور غالب اور آزردہ کو اب تک یاد کیے جائے اسے معیاری ''ترقی پسند'' کیسے مان لیا جائے؟ اور پھر شروع سے آخر تک نہ فرائڈ پرستی نہ شہوانی نظریوں کی دلالی---ایسے ''رجعت پسند'' کے نام پر بے دھڑک کس طرح ''ترقی پسند کی چٹ چپکا دی جائے!

مصنف ''قدیم و جدید'' اور ''مشرق و مغرب'' دونوں سے اچھے خاصے بہرہ مند ہیں، اور ان کی ہمہ گیری ان کی تنقیدوں میں جھلکی پڑتی ہے ان کے اس مجموعہ میں دو چار مضمون اپنے بصیرت افروز ہونے کی بناء پر ضرور قابل ملاحظہ ہیں:

(1) مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے غیر مطبوعہ خطوط۔

(2) جنگ آزادی میں اردو کا حصہ۔

(3) واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط۔

(4) ریاض کی شگفتہ نگاری۔

ناقد کی رائے جیسی بھی ہوں۔ بہرحال ان کا قلم شرافت رقم ہے اور ان کی

شریفانہ روش کی شہادتیں ہر صفحہ میں مل جاتی ہیں...... یہ نعمت ''طوفان بے تمیزی'' کے اس دور میں کچھ کم اور ہلکی نہیں۔

ان کی زبان عام طور پر صاف، رواں اور سلیس ہے۔ بلکہ کہیں کہیں انشا پردازانہ بھی۔ تاہم ان کے قلم پر انگریزیت کا بھی رنگ ہے۔ جو جا بجا پھوٹ نکلتا ہے ص 64 پر لفظ زہرناک، نظر پڑا۔ بہتر ہوتا اگر اس مفہوم کو ''زہریلی'' یا ''زہرآلود'' سے ادا کیا جاتا۔ کیفیات کے ساتھ تو لاحقہ ناک۔ بلا تامل لگایا جا سکتا ہے (مثلاً دردناک، شرمناک) علیٰ ہذا اسماء فعلیہ کے ساتھ (مثلاً خطرناک) باقی مستقل اسماء کے ساتھ اس کا جواز ذرا محل نظر ہے اور خود کتاب کا عنوان ''کلاسکی'' ادب بھی سرے سے درگزر کیے جانے کے قابل نہیں...... آخر میں ایک مخلصانہ ہمدردانہ مشورہ۔ اندرونی سرورق پر مصنف کا سال پیدائش 1917 میں دیا ہوا ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر 36 سال کی ہوتی ہے جو تصنیفی دنیا میں تو عمر ہی نہیں سمجھی جائے گی۔ انھیں اپنے مجموعوں کو ابھی چھپوانے کی کیا جلدی ہے۔ دس بیس برس کی مزید مشاقی، اور خیال و زبان دونوں میں مزید پختگی کے بعد انھیں اپنی تحریریں لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے خود نظر ثانی کے قابل نظر آئیں گی۔ اور وہ وقت ان مجموعوں کو از سر نو چھاپنے کا ہوگا۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 4، یکم جنوری 1953

(53) شرح دیوان غالب:

ازنظم طباطبائی لکھنوی،

368 صفحہ، مجلد، قیمت ساڑھے تین روپیہ، (1) انوار بک ڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ (ہند) (2) مبارک بک ڈپو۔ بندر روڈ۔ قریب ڈینسو ہال کراچی 2 (پاکستان)

دیوان غالب (اردو) کی شرحیں بڑی اور چھوٹی اب تک اللہ کو علم ہے کتنی نکل چکی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک قدیم ترین اور مشہور ترین شرح مولوی سید علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم (لکھنوی ثم حیدرآبادی) کی ہے اس کا یہ نیا ایڈیشن (غالبا مدرسی ضرورت سے) اب نکلا ہے...... نظم طباطبائی اپنے زمانہ میں ایک ممتاز ادیب اور نکتہ رس سخن سنج ہوئے ہیں۔ ''نقاد'' کا لفظ اس وقت تک ٹکسال سے باہر تھا۔ اس کا چلن تو اب ہوا ہے۔

نظم شاعر بھی اچھے خاصہ تھے، شرح میں خوب خوب داد سخن سنجی دی ہے۔ اور کہیں کہیں داد سخنوری بھی۔ فن عروض و قافیہ کے بھی ماہر تھے۔ کتاب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرح کی کشکول شعر و ادب سامنے ہے۔ کہیں ذوق غالب کے سہروں پر محاکمہ ہو رہا ہے۔ کہیں ناسخ و آتش کے معرکے بیان ہو رہے ہیں۔ کہیں فلاں قاعدۂ عروضی اور فلاں نکتہ، بلاغت کا افادہ ہو رہا ہے۔ اور کہیں شارح صاحب خود استاد بنے ہوئے شاعر کے کلام پر اصلاح کرتے جا رہے ہیں! ..... ''اصلاح''؟ جی ہاں اصلاح۔ اور ایسے منظر نادر بھی نہیں۔ 194 پر شاعر کے مصرعہ

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پر شارح کو جو جوش آیا ہے۔ تو پہلے تو پورے دو صفحہ نثر عاری کے لکھ ڈالے، اور اس کے بعد جو پیش مصرعہ لگانے شروع کیے، تو ایک دو نہیں 180 مصرعہ اپنی طرف سے لگا کر دکھا دیے! دو ایک نمونہ کے طور پر سن لیجیے۔

(1) پردہ اٹھا کے ہم نے تمہیں دیکھ تو لیا۔ ہر چند ا لخ
(2) قاضی کے گھر سے شیشۂ صہبا نکال لائے۔ ہر چند ا لخ
(3) لے لیں بلائیں سبزۂ خط نگار کی ہر چند ا لخ
(4) چوری سے بوسۂ خط رخسار لے لیا۔ ہر چند ا لخ"

قلم کا لفظ آتے ہی شارح کا ذہن شراب کی قلم، مہندی کی قلم، رخسار کی قلم وغیرہ ساری بوقلمونیوں کی طرف منتقل ہو گیا، اور اس نے ہر ہر ضلع کو نظم کر ڈالا!...... قلم اس پر بھی نہ رکا، تو لکھنؤ کے کسی مشاعرہ کے مصرعہ طرح ''اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھینچوائی نہیں'' کو لے کر اس پر اپنے 21 مصرعہ نقل کر کے اپنے زور قلم کا تماشا دکھا دیا!

غالب ایک تو دہلوی، اور پھر دہلویوں میں مخصوص خودداری اور منفرد رنگ سخن کے مالک لیکن کہیں کہیں بہرحال بولی لکھنؤ والوں کی بھی بول گئے ہیں جیسے:

پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

ایسے موقعوں پر شارح نے تو جیسے پالا مار لیا ہے۔ ''خسرو'' اور اس سے متصل ''شیریں''...... یہ موقع تو اللہ دے اور بندہ لے کا تھا۔ لیکن شارح صرف اشارہ کر کے گزر جاتے ہیں۔

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

اس کی شرح شارح کے اصل الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

''کسی کی مصیبت پر جوش محبت میں کہتے ہیں'' ہے ہے میں اس کے پاؤں پڑوں'' اور یہ بڑے محاورہ کا لفظ ہے۔ اور التجا کے لیے ''تو پاؤں پڑنا'' مشہور بات ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب ''ہیہات'' کا لفظ ضلع کا بول گئے ہیں۔ مگر کیا کرتے۔ مصرعہ میں ایک رکن کم پڑتا تھا (140)

لیکن کہیں کہیں حضرت شارح کی نظر بھی چوک ہی گئی ہے۔ مثلاً ص 245 پر ایک مصرعہ ہے۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی

یہ مصرعہ اس نوٹ سے خالی ہے، کہ ''نسیم'' کے لیے ''ہوا'' خواہی کیا خوب!

غرض کتاب بہ حیثیت مجموعی غالب فہمی ہی کی کلید نہیں، بلکہ کم وبیش اردو شعروادب کے معلم کے کام کی ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیجیے کہ امتدادِ زمانہ کا قانون شعر کی طرح شرح شعر پر بھی عامل ہے۔ اور جناب ''نظم'' کی ''نثر'' میں اب وہ تازگی باقی نہیں، جس کی تلاش قدرۃً ہر پڑھنے والے کو ہوتی ہے۔ بلکہ جا بجا سے فرسودہ ہوگئی ہے۔

شروع میں فہرست مضامین کی قسم کی کسی چیز کا سرے سے نہ ہونا ناشر صاحب کی وضعداری کا چاہے ثبوت ہو لیکن مستعدی وحسن توجہ کا تو کوئی اچھا ثبوت نہیں۔

صدق جدید، نمبر 21، جلد 4، 23 اپریل 1954

(53) تحقیقی مطالعے:

از ڈاکٹر نذیر احمد، ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

160 صفحہ قیمت دو روپیہ، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

موجودہ تحقیقی متعلموں (ریسرچ اسکالرز) میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر نذیر احمد ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور اپنے متوازن انداز بیان اور سنجیدہ دل ودماغ کے لیے ممتاز ہیں۔ یہ رسالہ ان کے چھ مختلف مقالوں کا مجموعہ ہے۔ اور ان سب کے کام کا ہے، جو فارسی زبان وشعر سے متعلق تحقیقی مطالعہ چاہتے ہیں۔ عنوانات اس قسم کے ہیں:

(1) غالب اور ظہوری۔

(2) کتاب نورس کے مخطوطات۔

(3) گلزار ابراہیم وخوان خلیل۔

چھ میں سے پانچ مقالے معارف وارددو ادب میں نکل چکے ہیں آخری جو معدن الشفائے سکندر شاہی پر ہے۔ اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ رسالہ کی زبان بھی صاف و سلیس ہے۔ البتہ نوعیت مضامین کے لحاظ سے رسالہ عام ناظرین کی دل چسپی کا نہیں لیکن طلبۂ فن کے کام کا ہے۔

صدق جدید، نمبر 21، جلد 4، 23 اپریل 1954

(54) تنقیدی اصول اور نظریے:

ازحامد اللہ افسر صاحب ایم اے،

206 صفحہ مجلد، مع گرد پوش قیمت دو روپیہ آٹھ آنے، انوار بک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔
مبارک بک ڈپو بندر روڈ۔ مقابل ڈینسو ہال کراچی 2 (پاکستان)

دوسرے علوم و فنون کی طرح ''تنقید'' پر بھی اب اردو میں کتابوں کی کمی نہیں۔ جسے دیکھیے اردو میں ذوق سلیم کے بغیر انگریزی کی دو چار کتابوں کو الٹ پلٹ اور انھیں کی اصطلاحات کو بغیر سمجھے اور ہضم کیے اردو میں نقل کر کے بس اردو میں تنقیدی مقالہ اور کتاب لکھ ڈالنے کو تیار! اس افراتفری سے اردو ادب کو نقصان جیسا کچھ پہنچا، ظاہر ہے کھیپ کی کھیپ کتابوں کی ایسے خامکاروں کے قلم سے نکلنے لگی جو ''سیکھنے'' سے قبل سکھانے کے مدعی ہو بیٹھے اور جنھیں خود صحیح اردو نویسی کا سلیقہ نہ آیا۔ وہ دوسروں کے لیے ادب آموز بن گئے! --- بازار کی دکانیں ایسی کتابوں سے پٹی پڑی ہوئی ہیں۔

مدت کے بعد ایک سلجھی سلجھائی کتاب فن سے متعلق نظر آئی۔ مختصر ہے لیکن مجمل نہیں۔ اور مہمل تو یقیناً نہیں۔ ضروری اور طالب علموں کی تقریباً سب ہی باتیں اس میں آگئی ہیں۔ 12 بابوں کے اندر ادب اور فنون لطیفہ کا تعلق اور یونان، ہندوستان یورپ میں فن تنقید کا نشو و نما شاعری، مصوری، بت تراشی کا باہمی تعلق۔ پھر اردو پر اصول تنقید کا انطباق اور قصیدہ و مثنوی وغیرہ پر اسی معیار سے تبصرہ سب کچھ آگیا ہے۔ انگریزیت کا اثر اس میں بھی جا بجا نمایاں ہے۔ پھر بھی وقت کی دوسری کتابوں سے بہت کم اور جتنا ہے غنیمت ہے۔

کتاب نقد الادب کے نام سے پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں علاوہ نام کی تبدیلی اور دوسری ترمیموں اور اضافوں کے آخر میں ایک مستقل باب ''نیا ادب'' کے عنوان سے شامل ہوا ہے وہ مصنف کے حسن ذوق کا آئینہ دار اور

سب کے پڑھنے کے قابل ہے۔اس ''نئے ادب'' کا خلاصہ افسر صاحب کی نظر میں تین چیزیں ہیں۔ روسی ادب کی نقالی، جذبات کی صداقت کا فقدان، اور عریان نگاری۔

صدق جدید،نمبر 24،جلد 4،14 مئی 1954

(55) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ:

از سید مسعود حسن صاحب رضوی، سابق صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی
98 صفحہ مجلد مع گرد پوش قیمت ڈیڑھ روپیہ، کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔

آب حیات، محمد حسین آزاد کا شاہکار ادب اردو کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ موضوع اردو شاعری کی تاریخ اور اردو شاعروں کا تذکرہ ہے کتاب کا ادبی پایہ ہمیشہ سے مسلم رہا ہے۔ تاریخی پہلو اس کے برعکس شروع ہی سے زیر بحث چلا آرہا ہے۔ بشری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے کس بشر کی کتاب خالی ہوسکتی ہے، اور پھر تاریخ تو موضوع ہی ایسا ہے کہ اس کے ہر ہر بیان سے متعلق متضاد نظریے اور دو نقطۂ نظر ناگزیر سے ہیں- آب حیات بھی مدت سے ناقدوں، مبصروں اور ادبی تاریخ نگاروں کی ہدف بنی ہوئی ہے، فلاں دعوا بے بنیاد فلاں بیان غلط، فلاں عبارت مبالغہ آمیز، فلاں بات خلاف تحقیق وقس علی ہذا۔ اور یہ کہنے والے بھی سب ایسے ہی ویسے ماوشما نہیں بابائے اردو عبدالحق اور صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے بالغ نظر ناقدین بھی اس جماعت میں شامل ہیں۔

تنقید تنقید کی حد تک رہتی، تو مضائقہ نہ تھا۔ غلو نے جلد ہی تنقید کو تنقیص میں بدل دیا۔ اور ایک مصیبت یہ بھی آپڑی کہ آزاد شیعہ تھے اور ان کے نکتہ چیں اتفاق سے عموماً اہل سنت بہر حال ''ردعمل'' لازمی تھا۔ افراط اور تفریط کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ ادھر سے جواب ودفاع کی بھی پلٹنیں آراستہ ہوکر نکلنے لگیں۔ اور مثالب کے جوڑ پر مناقب کے علم بلند ہونے لگے...... پیش نظر رسالہ اسی نصرت وحمایت کی کوششوں کا ایک بلند و بلیغ نمونہ ہے۔

سید مسعود حسن صاحب رضوی کا نام ادب اردو کے طلبہ کے لیے غیر معروف یا نامانوس نہیں۔ اس دشت کے پرانے سیاح۔ اس میدان کے نامی شہسوار ہیں۔ بات

عموماً مدلل کہنے کے عادی ہیں۔ انداز بیاں دل نشیں ہے۔ اور جہاں تک رنگ انشا کا تعلق ہے خود بھی آزاد کی جانشینی کا حق کسی حد تک ادا کر رہے ہیں --- ان کی یہ تراوش قلم ''درمدح استاذ'' کا ایک دل چسپ نقشہ ہے چلتے ہوئے اعتراضوں کو ایک ایک کر کے سمیٹا ہے۔ اور پھر اپنے معلومات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا ہے۔ موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے رسالہ قابل دید ہے۔

شکایت صرف ایک ہے۔ ممدوح کی حمایت میں جو چاہتے لکھتے یہاں تک کہ یہ لکھ جانے میں بھی مضائقہ نہیں کہ:

''جس نے آب حیات'' کی سی پر از معلومات اور زندہ جاوید کتاب دی۔ اس کی ساری محنتوں پر بے دردانہ تنقید اور بے بنیاد الزامات سے پانی پھیر دینا احسان فراموشی کی انتہا ہے۔'' (81)

لیکن اس کے مابعد کا فقرہ، نظر ثانی کے وقت مصنف خود غور فرمالیں کہ ان کی متانت تحریر سے کہاں تک میل کھاتا ہے۔

''آزاد کے بے درد معترضوں میں زیادہ تر جہل مرکب میں گرفتار ہیں مگر کچھ تعصب کے شکار اور کچھ حسد کے مریض بھی ہیں۔'' (81)

صدق جدید، نمبر 42، جلد 4، 14 مئی 1954

(56) ادبی تنقید:

از ڈاکٹر محمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی،
272 صفحہ مجلد مع گردپوش قیمت ساڑھے تین روپیہ، ادارہ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ (پاکستان) میں مبارک بک ڈپو بندرروڈ کراچی 2

یا تو ابھی چند روز کی بات ہے کہ اردو میں تنقیدی کتابوں کا قحط تھا اور بجز حالی کے ''مقدمہ'' اور محمد حسین آزاد کی آب حیات اور بہت بعد کو شبلی کے موازنہ شعر العجم کے کسی اور کتاب کی طرف اشارہ کرنا مشکل ہی تھا۔ اور یا اب دیکھتے ہی دیکھتے تنقید کے موضوع پر رطب و یابس ہر قسم کی کتابیں اس کثرت سے نکل پڑیں۔ یا ابل پڑی ہیں کہ اب طبیعت اس سے اکتا چلی ہے، پہلے جس درجہ کی تفریط تھی اب اسی کے مقابل افراط سی شروع ہوگئی ہے اور افسوس اس کا ہے کہ اس دفتر کا 90 بلکہ 95 فی صدی محض انگریزی کتابوں کا چربہ ہے۔۔۔ غذا ہضم ہو کر اور خون صالح میں تبدیل ہو کر جزو بدن بنی ہوئی نہیں بلکہ اس کے برعکس ایسی غیر منہضم حالت میں، کہ اس کا تصور بھی ہر لطیف طبیعت میں متلی اور غشیاں پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔

ادبی تنقید محمد حسن صاحب کے 20 تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے سب 1949 سے 1954 تک پانچ سال کے اندر لکھے ہوئے۔ ان میں سے چند تمام تر خشک ہیں، محض ''اصول'' تنقید پر، مارکسی نقطۂ نظر کی طرف جھکے ہوئے البتہ چند میں ان نظریات کا انطباق ہے اردو کی بعض معروف ادبی شخصیتوں یا کتابوں پر، مثلاً پریم چند کا ورثہ، مرزا رسوا کی شخصیت، اندر سبھا (امانت) اقبال اور نیا ہندوستان وغیرہ۔۔۔ ترقی پسند، ادب کے ساتھ ان کا تعلق خاطر جس درجہ گہرا اور ہمدردانہ ہے، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ''اردو افسانہ'' کے عنوان سے جوان کا مقالہ 27، 28 صفحہ کا ہے۔ اس میں شاید ایسے ہر لکھنے والے اور لکھنے والی کا تذکرہ کر ڈالا ہے جس نے اپنی عمر میں کبھی الٹی سیدھی چند سطریں بھی ترقی پسندوں کے لب و لہجہ میں افسانہ کے نام سے لکھ دی ہیں! تاہم ان کے

ذوق سلیم کا اندازہ ان چند مقالوں سے ہوسکتا ہے۔ جو انھوں نے اردو کے ''کلاسکی'' (یہ اصطلاح انھیں کی ہے) ادب اور ادب والوں پر لکھے ہیں۔

1857 کے بعد لکھنؤ کا اردو ادب ''لکھنؤ میں اردو ادب'' یہ دونوں مضمون اچھے ہیں۔ اگر چہ دوسرے مضمون میں جائزہ نثر سے کہیں زیادہ نظم کا لیا گیا ہے۔ اور منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ کو جو کاکوری کے شیخ زادوں میں تھے۔ ہر جگہ مرزا سجاد حسین لکھا ہے اندر سبھا (امانت) اور رواسوخت پر بھی مضمون اچھے خاصہ ہیں سب سے زیادہ جاندار مضمون ''مرزا رسوا کی شخصیت'' پر ہے۔ گو اس میں بھی کئی واقعات مزید تحقیق کے محتاج رہ گئے ہیں۔ مثلاً جن صاحب نے مرزا صاحب کی بی اے کی سند کو اپنا لیا تھا (162) ان کا نام محمد تقی نہیں محمد زکی تھا، محمد تقی ان کے والد کا نام تھا، جو مرزا صاحب کے والد کے ہم نام تھے۔ اردو املا میں تو بہت فرق ہے لیکن انگریزی حروف میں Hadi کو Zaki بنا دینا کچھ ایسا دشوار نہیں--- روایت یہ سننے میں آئی تھی، کہ مقدمہ جب عدالت میں گیا تو مرزا صاحب نے قصداً کچھ ایسی گول مول شہادت دی جس سے وہ صاف بچ گئے۔

160 پر مہاراجہ صاحب محمود آباد اور مرزا صاحب سے ملاقات کی جو صورت درج ہے۔ اس کی بھی بعض جزئیات تصحیح طلب ہیں اسی طرح (160 پر) اس ملاقات کو دور الحکم کے ساتھ جو ہم زمان بتایا ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ الحکم بند ہوئے مدت دراز ہو چکی تھی۔

کتاب کا لب ولہجہ شروع سے آخر تک سنجیدہ شریفانہ ہے اور یہ اس دور ترقی پسندی میں معمولی بات نہیں ہے ...... زبان واصطلاحات کی بھرمار سے جا بجا خشک بلکہ ذرا مغلق ہوگئی ہے اور جہاں یہ بات نہیں۔ وہاں سلیس ورواں ہے۔

زبان پر اثر انگیزیت کا ناگزیر تھا اور کہیں کہیں ہندیت بھی غالب آگئی ہے چناں چہ ایسے فقرہ وہ بار بار لکھ گئے ہیں جن پر ترجمہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔

''اے حمید اس رجحان کی سب سے اہم دریافت ہیں''۔ (115)

''ہمارے ادب میں کافی نام کما چکے ہیں''۔ (134)

''ان کی شاعری فکر نہیں روایت کی شاعری ہوتی'' (167)

''جبروت'' ان کی زبان پر مؤنث ہے۔(167) اور انگریزی لفظ ''بوہمین'' اور ہندی شبد ''آدرش'' کو بار بار انھوں نے اردو میں کھپانا چاہا ہے۔ اس طرح لفظ ''کافی'' وہ اس قسم کے موقعوں پر کثرت سے لے آئے ہیں:

''ہماری زندگی کی یہ اصطلاح کافی مبہم بھی ہے اور کافی ہمہ گیر بھی''126

اردو میں فصیح ''گہن'' ہے اس کے بجائے وہ ''گرہن'' ہر جگہ لائے ہیں اور اصول کی جمع الجمع ''اصولوں'' لے آنے میں بھی انھیں تامل نہیں ہوا ہے--- اس قسم کی خامیاں اور فروگزاشتیں اگر جا بجا نہ ہوتیں تو اس ہونہار اور اچھی صلاحیت رکھنے والے نقاد کا شمار ادیبوں کے صف میں بے تکلف کیا جا سکتا تھا۔

ایک مصیبت ہمارے اکثر نوعمر ''نقادوں'' کے لیے یہ ہے کہ وہ ادیب بننے سے پیشتر ہی نقاد بن جانا چاہتے ہیں۔ یورپ میں یہ معیار ہو یا نہ ہو ہمارے ہاں تو نقادی کا حق تو صرف اسی کو پہنچتا تھا جس کی ادیبانہ حیثیت پہلے مسلم ہو چکی ہو--- تنقید کا فن بے شک یورپ سے ہی آیا ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ معقول اور نامعقول سارے ہی جزئیات میں تقلید فرنگیوں کے اصول کی آنکھ بند کر کے کی جائے۔

ایک آخری مشورہ اور نقاد کا جو معیار ہمارے یہاں ہے اس میں شرط اولین نقاد کی ''پختہ مذاقی وسخن فہمی ہے'' نہ کہ وسعت معلومات کتابی اور ذوق سلیم کی پختگی ایسی شی ہے جس کا تعلق بڑی حد تک سن و تجربہ سے ہے ذوق سلیم کی پختگی کی دولت عموماً 40،45 سن کے بعد ہی نصیب میں آتی ہے مصنف نے جو یہ تنقیدی رائے زنی 25،30 سال کی عمر میں کر دی ہے، اسے جب وہ آج سے 15، 20 سال بعد پڑھیں گے عجب نہیں کہ اس کے بیشتر حصہ پر نظر ثانی کی ضرورت وہ خود ہی دوسروں سے زیادہ محسوس کریں گے۔ حضرت اکبر نے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد ہی فرمایا ہے۔

تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہم سن کر نہیں سکتیں

طبیب حاذق بھی وہی ہوتا ہے جس کا تجربہ بہت وسیع ہو وہ نہیں جو اونچی سے اونچی طبی ڈگری لے کر ابھی کالج سے نکلا ہے۔

صدق جدید، نمبر 45، جلد 4، 22، اکتوبر 1954

(57) ادب اور نظریہ

از آل احمد سرور صاحب۔ ایم اے،

296 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔ انوار بک ڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ۔ مبارک بک ڈپو، بندر روڈ کراچی 2، (پاکستان)

سرور صاحب کا نام اب اردو خوانوں کے لیے نیا نہیں۔ ان کے تنقیدی مجموعہ ایک نہیں کئی ایک۔ اس کے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تازہ مجموعہ ان کے 13 مضامین کا ہے جن میں سے اکثر کسی رسالہ میں پہلے بھی نکل چکے ہیں۔ گو یہاں اس کی کوئی تصریح درج نہیں۔ کہ کہاں اور کب نکلے ہیں۔ فروگذاشت بالکل ہلکی اور غیر اہم نہیں۔

تبصرہ نگار ان تیرہ میں سے صرف چند مضامین کا مطالعہ کر سکا۔ اور اس کی رائے جو کچھ بھی ہے وہ انھیں چند تک محدود ہے۔ سرور ''ترقی پسند'' ہیں۔ لیکن اپنی جماعت کے عام افراد سے یقیناً ممتاز، ان کی نظر گو گہری نہ ہو۔ پھر بھی بالکل سطحی اور عامیانہ بھی نہیں۔ اور بڑی بات یہ کہ ان کا لب و لہجہ شائستہ شستہ و شریفانہ ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بایں ترقی پسندی وہ پرانے اور ''زوال آمادہ و زوال یافتہ جاگیر داری دور'' کے ادیبوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور ان کی صحبتیں اٹھائے ہوئے ہیں۔

انکے عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں:

اردو غزل میر سے اقبال تک۔ اقبال کی عظمت۔ رشید احمد صدیقی، جوش کا سرور و خروش۔ ادب اور نظریہ۔

''ادب اور نظریہ'' دراصل عنوان ایک مقالہ کا ہے۔ مگر مصنف کو ایسا پسند آیا کہ یہی نام کتاب کا بھی رکھ دیا۔ تبصرہ نگار اپنی کم مائیگی کو کیا کرے۔ جی میں آیا کہ لکھنؤ کے اہل زبان کے کسی مجمع میں یہ فقرہ پیش کیجیے اور پوچھیے کہ آپ اس سے کیا سمجھے؟

عجب نہیں جو کانوں پر ہاتھ رکھ سب اپنی لاعلمی کا اعتراف کر گزریں۔ ہاں کوئی صاحب انگریزی داں اور جید انگریزی داں ہوئے، وہ ممکن ہے اپنی انگریزی دانی کے زور سے فقرہ کا مطلب سمجھ لیں۔ تو یہ کرامت اپنی انگریزی دانی کی ہوئی ورنہ خالص اردو والے تو چاہے وہ اپنے وقت کے سرشار اور اپنے زمانہ کے مرزا رسوا ہی کیوں نہ ہوں سوال سن سائل کا منہ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ ''نظریہ'' اہل لغت کے نزدیک ترجمہ ہے انگریزی لفظ ''تھیوری'' کا۔ مصنف نے (روایت سے ہٹ کر) طبع زاد و مجتہدانہ ترجمہ فرمایا ہے IDEOLOGY کا۔

انگریزیت سرایت کیے ہوئے ہے۔ کتاب بھر میں۔ عنوانات، ترکیبیں، الفاظ، عبارتیں۔ سب اسی زمین کے گل بوٹے ہیں۔ خیر گزری کہ کہنگی کے مارے ہوئے یونیورسٹیوں کے بعض اور سینیر استاد مثلاً رشید احمد صدیقی اور سید مسعود حسن رضوی اس جدت کا ساتھ نہ دے سکے۔ ورنہ شاید نظریہ یہ قائم کرنا پڑتا۔ کہ یونیورسٹیوں تک پہنچتے پہنچتے اردو غریب کی ارتقائی شکل یہی ہو جاتی ہے۔

ص: 141 پر ''اسپورٹس مین شپ'' کا ترجمہ ''کھلاڑی کے آداب'' نظر آیا۔ اردو میں ایک تو ''اسپورٹ'' کے لیے کھیل کود'' آتا نہیں، مردانہ کھیل سپاہیانہ کھیل یا ورزشی کھیل آتا ہے۔ اور پھر انگریزی میں جس مفہوم کو ''اسپورٹس مین شپ'' ادا کرتا ہے اس کے لیے اردو میں چلے ہوئے الفاظ ''مردانگی'' یا ''شرافت'' یا ''سپاہیانہ آن'' یا ''سپاہیانہ بانکپن'' ہیں۔

اسی طرح ص: 17 پر مصحفی کے ایک مشہور شعر کا مصرعۂ اول یوں لکھا ہے:

واں چشمِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا

شاعر نے ''چشم'' کے بجائے غالباً ''لعل'' کہا تھا۔

ص: 225 پر ایک عنوان ہے ''روایت اور تجربے اردو شاعری میں'' اور مضمون کی پہلی سطر ہے۔

''روایت اچھی چیز ہوتی ہے۔ روایت پرستی بُری ہے''

کیا اچھا ہوتا اگر ''روایت'' اس معنی میں سرور صاحب خام قلم انگریزی مترجمین کے لیے چھوڑے رکھتے اور عنوان صرف ''تقلید اور جدت'' قائم کرتے۔ اور پہلی سطر یوں لکھتے ''تقلید اچھی چیز ہے۔ تقلید جامد بری ہے''

مجموعہ میں ایک معرکہ کا مضمون محمد امین زبیری صاحب کی کتاب ''ضیائے حیات'' (سوانح ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم) پر مفصل تبصرہ ہے۔ مخالفانہ ہونے کے باوجود معتدل ومتوازن ہے، مخاصمانہ و معاندانہ نہیں ہونے پایا ہے۔ ایک اور مضمون رشید احمد صدیقی پر ہے۔ یہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

سرور نے اقبالؒ پر اچھا خاصہ لکھا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی وہ اقبال کے نکتہ چینوں میں نہیں، ان کے مداحوں میں ہیں۔ اس پر بھی ایک بنیادی غلطی نے صحیح اقبال فہمی سے شاید محروم ہی رکھا ہے۔ ادب کی تقسیمیں ان کے خیال میں دو ہیں۔ ایک جدید دوسرے قدیم، اور انھیں دشواری یہ پیش آ رہی ہے کہ وہ کلام اقبال کو ان دو میں سے کس صف میں جگہ دیں۔ حالاں کہ یہ قدیم وجدید کی حد بندی ہی محض سطحی اور تمام تر ثانوی درجہ کی ہے اور اقبال کا دل و دماغ تو اس سے بالکل ہی ناآشنا ہے۔ ادب کی حقیقی اور بنیادی تقسیم صرف اسلامی اور جاہلی ہے۔ باقی اور جتنی بھی تقسیمیں ہیں سب انھیں دو کے ماتحت اور انھیں کے ضمن و تبع میں۔ اقبال ایک کھلے ہوئے اسلامی شاعر ہیں اور اسلامی شاعری کو تنگ اور محدود اور تنقید سمجھنا بجائے خود ایک عبرت انگیز خوش فہمی ہے، اسے وہ بار ہا صراحت کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور جب تک اس حقیقت کو کھلے دل سے نہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ اقبال فہمی کی ساری کوششیں ہر ذہانت اور ہر فصاحت بلاغت، خطابت کے باوجود (نذیر احمدی زبان میں) ٹامک ٹوئیں مارنے سے ہرگز آگے نہ بڑھ سکیں گی۔ اقبال اور اکبر دونوں کے سمجھنے کے لیے یہی ایک کلید ہے۔

صدق جدید، نمبر 6، جلد 5، 7 جنوری 1955

(58) اردو تنقید کی تاریخ

از مسیح الزماں صاحب۔ لکچرار الہ آباد یونیورسٹی،

340 صفحہ، قیمت تین روپیہ، مجلد مع گرد پوش، خیابان 110، سبزی منڈی۔ الہ آباد 3۔

تنقید، اصول تنقید، تاریخ/تنقید، نقد تنقید پر اردو میں کتابوں کی وہ بھرمار شروع ہوئی ہے کہ کثرت تعبیر نے سارا خواب ہی پریشان کردیا۔ یارلوگ (بہ زبان امانت) خدا معلوم کب سے اس ''تقدیر'' پر ''ادھار'' کھائے بیٹھے تھے؟۔ کثرت سے یہ کتابیں صرف دماغی بدہضمی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ اپنے ہاں کی چیزوں میں بغیر کوئی روک و امتیاز حاصل کیے...... مغربی کتابوں میں جو کچھ پڑھا پڑھایا، بس اس کو معیار قرار دے کر اپنے ہاں کے شاہکاروں کو اسی پیمانہ سے ناپا، تولا، دیکھا جانے لگتا ہے۔

اس اندھیر نگری میں ایک ہلکی سی روشنی کی کرن کا کام یہ کتاب دے رہی ہے۔ صحیح ہے کہ کتاب تنقید پر نہیں، تاریخ تنقید پر ہے۔ لیکن دماغی مرعوبیت تو وہ بلا ہے کہ موضوع کچھ بھی ہو، اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ کتاب اول سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ اور موجودہ فضا میں یہ داد کچھ تھوڑی نہیں۔ پہلا باب اپنے ہاں کے یعنی عربی و فارسی اصول نقد پر ہے۔ اس میں حوالہ جابجا نہ صرف نظامی عروضی کی چہار مقالہ اور وطواط کی حدائق السحر نی دقائق الشعر وغیرہ کے آتے ہیں۔ بلکہ ابن رشیق کی کتاب العمدۃ اور قدامہ بن جعفر کی نقد الشعر اور اس کی شرح کے بھی۔ اس سے پڑھنے والے پر قدرۃً یہ اثر پڑتا ہے کہ ہمارے بزرگ بھی فن کے دقائق و نکات سے ناآشنائے محض نہ تھے۔

اب اصل تاریخ شروع ہوتی ہے اور مصنف نے صحیح تاریخی ترتیب کے ساتھ اس جلد میں اس کے چار دور قائم کیے، پہلے دور میں فائز آبرو، شاہ حاتم، سودا وغیرہ کو لیا ہے۔ دوسرا باب میر و مصحفی کے تذکروں پر شامل ہے۔ تیسرے باب کے

تحتانی عنوانات ابراہیم، لطف، انشاء، رنگین، ناسخ وغیرہم ہیں۔ چوتھے باب کا عنوان ''غدر کے بعد کا پرانا اسکول'' ہے اور اس میں غالب، سرسید، نادر، نساخ، منیر، نسخ وغیرہ کی جلوہ گری ہے۔ یہ جلد تقریباً 1880 پر ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد دو جلدیں اور ہوں گی۔

• دیباچہ میں تصریح ہے کہ کتاب دس سال میں تیار ہوئی ہے، بے شک ایسا ہی وقت لگا ہوگا۔ کتاب کے سارے حصہ یکساں ہموار نہیں۔ مصنف کا شمار اب بھی بڑے کہنہ مشقوں میں نہیں۔ دس سال قبل تو وہ یقیناً نوخیز ہی ہوں گے۔ نو مشقی اور مشاقی دونوں کی جھلک کتاب کے اندر موجود ہے۔ شروع میں مصنف نے شکریہ کے ساتھ 13 شخصیتوں کی فہرست دی ہے۔ ان زندہ ماخذوں میں سرفہرست نام لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ہے۔ اور یہ بالکل بجا ہے۔ جا بجا سطروں کی سطریں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کی املا کی ہوئی ہیں۔ مسیح الزماں صاحب ہیں ہر طرح ہونہار، اور بڑی اچھی ادبی صلاحیتیں رکھنے والے، عجب نہیں کہ کچھ روز میں اپنے استاد محترم کے بالکل ہم رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔ جس سنجیدگی اور توازن کا ثبوت انھوں نے اب بھی دیا ہے وہ قابل داد اور مستحق حوصلہ افزائی ہے۔

ایک خاص چیز جس پر تبصرہ نگار کی نظر پڑی تھی، اس کا رفع دخل مصنف نے خود ہی دیباچہ میں یہ لکھ کر کر دیا:

''ہاں دو نام ایسے ضرور ہیں جن کا کتاب میں نہ ہونا مجھے کھٹکتا ہے، ایک شیفتہ دوسرے صہبائی۔''

صدق جدید، نمبر 1، جلد 5، 4 فروری 1955

(59) اردو کی نثری داستانیں

از ڈاکٹر گیان چند جین۔ایم اے، ڈی فل،

10+606 صفحہ، قیمت ساڑھے نو روپیہ، انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی (پاکستان)

ڈاکٹر گیان چند جین جو حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو کے صدر تھے (اور ممکن ہے کہ اب بھی ہوں) الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ وہیں انھوں نے ایک مقالہ "شمالی ہند میں اردو کے نثری قصوں کا ارتقا، ابتداء سے 1870 تک ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا۔ اس پر انھیں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی اور اب اسی مقالہ کو ترمیم عنوان کے ساتھ انھوں نے ایک ضخیم کتاب کے قالب میں پیش کیا ہے۔ شائع کرنے والی ہندوستان نہیں پاکستان کی انجمن ترقی اردو ہے۔

"مقالہ" جتنا ضخیم ہے، کتاب کی شکل ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے، صفحات کی تعداد 606 ہے! مقالہ کتنا عمیق اور فاضلانہ ہے، اس کا اندازہ کسی سرسری تعارف و تبصرہ سے نہیں، اصل کتاب ہی کے مطالعہ سے ہوگا۔ اردو ادب کے موضوع پر خدا معلوم کتنے مقالے اب تک مختلف یونیورسٹیوں کے سامنے پیش ہو چکے اور ان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی مرحمت ہو چکی ہیں۔ لیکن نظر کی جس وسعت اور جس عمق کا اظہار اس مقالہ سے ہو رہا ہے اور تحقیق و تنقید کا جو معیار (بغیر دوسروں سے الجھے ہوئے یا معاصرین اور پیش رووں کی تحقیر و تنقیص کیے ہوئے) اس مقالہ نے پیش کیا ہے اور جس صحیح فاضلانہ انداز کے ساتھ (بغیر اپنی خودی کو اچھالے ہوئے اور بلا شائبہ پندار تفوق) مقالہ نویس نے مختلف بحثوں کو پیش کیا ہے۔ ان سب کے لحاظ سے مقالہ اپنی نظیر آپ ہے۔

اس صفحہ کے دیباچہ و مقدمہ اور 58 صفحہ کے تین مفصل ضمیموں کو چھوڑ کر نفس کتاب سات بابوں میں تقسیم ہے:

(1) قصوں کا آغاز اور ارتقا: یہ گویا تمہیدی اور تاریخی باب ہے۔ اس کے تحت میں مصر، بابل، عرب، ایران، ہند، قدیم وغیرہا۔ سب کہیں کی داستانوں کا پس منظر آ گیا۔

(2) تاریخ۔ مصنف، ماخذ، نسخے اس میں کلیلہ و دمنہ سے لے کر الف لیلہ و آرائش محفل، فسانہ عجائب وغیرہ سے ہوتے ہوئے بوستان خیال تک ساری داستانوں کی داستان تاریخی تحقیق کے ساتھ آ گئی ہے۔

(3) داستان کی خصوصیات۔ اس میں پلاٹ کردار نگاری زبان و بیان وغیرہ کا تجزیہ وتذکرہ آ گیا ہے۔

(4) طویل داستانیں۔ اس کے تحت میں داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال پر مفصل بحث ہے۔

(5) مختصر داستانیں۔ اس میں اسی قسم کی بحث باغ و بہار، فسانہ عجائب، مذہب عشق وغیرہ پر ہے۔

(6) کہانیوں کے مجموعے۔ مسلسل لمبا افسانہ اور چیز ہے اور مختلف کہانیوں کا مجموعہ اور۔ اس لیے اس باب کا موضوع بحث کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ وغیرہا ہیں۔

(7) داستانوں کی ترقی و زوال کے اسباب۔ یہ باب نسبۃً مختصر ہے۔ اس میں اردو داستانوں کا مقام ادب میں متعین کیا گیا ہے اور ان کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کو روشنی میں لایا گیا ہے۔

کون پھول بغیر کانٹے کے ہوتا ہے۔ کتاب میں کسر صرف اس کی رہ گئی ہے کہ اس کی زبان کی صحت و شستگی پر پوری توجہ صرف نہ فرمائی گئی۔ اور اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں اس میں بار بار جگہ پا گئی ہیں۔ ''وجوہات'' ص:342۔ ''ذکاوت الحس'' ص: 242، ''درمیان اشاعت'' ص: 526، بجائے ''زیر اشاعت''۔ ''شر سے حقارت'' ص:246، ''بجائے شر سے نفرت'' کے، ''دوسرے زور میدان میں آچکے تھے'' ص:535، بجائے ''دوسری قوتیں میدان میں آچکی تھیں'' کے، وغیرہا۔ کہیں

کہیں چھاپے کی غلطیاں بھی غضب کی ہیں۔ مثلاً ''شراب پینے'' کے بجائے ''شراب دینے'' ص: 243۔ مصنف کا قلم عموماً بڑا متین، مہذب، متوازن اور باادب ہے۔ لیکن کہیں پھسل بھی گیا ہے۔ مثلاً سرشار کے لیے ''بجائے سرشار ہنسوڑ کے سرشار مسخرہ'' ص: 535۔

بہر حال انجمن ترقی اردو پاکستان قابل مبارک باد ہے کہ ہندوستان کی یہ قابل قدر کتاب شائع اس کے ہاں سے ہوئی۔ اور ہندوستان کے موجودہ اردو دشمنی کے ماحول میں حسرت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ زبان کے مستند اور معیاری ہونے کے لحاظ سے بلکہ اہل زبان میں شمار ہونے کے قابل جس طرح فسانۂ آزاد کا مصنف سرشار ایک ہندو تھا۔ اسی طرح افسانوی تاریخ وتحقیق پر ایک مستند و معیاری کتاب بھی ایک ہندو ہی کے قلم سے نکلی۔

صدق جدید، نمبر 19، جلد 5، 3/اپریل 1955

(60) ذوق ادب اور شعور

از احتشام حسین صاحب،

255 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ، ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ۔

احتشام حسین صاحب استاد اردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو پر عرصہ دراز سے لکھتے لکھتے اب ماشاء اللہ خود اردو لکھنے لگے ہیں۔ ''اردو لکھنے اور ''اردو پر'' لکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ڈیوہرسٹ بیلی ریمز، گریرسن اردو پر خوب لکھ گئے ہیں۔ خود اردو لکھنے کو ان سے کہا جاتا تو قلعی کھل کر رہتی۔

یہ مجموعہ ان کے 16 مختلف مضامین کا ہے۔ گو یہ نہیں کھلتا کہ یہ مضمون اول اول کب اور کہاں لکھے گئے تھے۔ یہ تک بھی نہیں کھلتا کہ مجموعہ میں ریڈیو کے لیے تیار کیے ہوئے نشریے کون ہیں اور رسالوں کے لیے لکھے ہوئے مقالے کون۔ یہ ابہام بڑا افسوس ناک ہے۔ ادبی پہلو سے بھی اور دیانت کے اعتبار سے بھی۔

پہلا مضمون ''میں کیوں لکھتا ہوں'' خاصہ دلچسپ ہے اور اب احتشام صاحب میں اتنی جرات آ گئی ہے کہ دو مشہور یورپین کتابوں کا ذکر کر کے جو تقریباً اسی موضوع پر ہیں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے ان کتابوں کا مطالعہ اس امید میں کیا کہ شاید روشنی کی کوئی کرن نظر آ جائے۔ کوئی اشارہ ایسا مل جائے جو آسودگی بخش اور نظر افروز ہو لیکن مجھے اس اعتراف میں شرم نہیں محسوس ہوتی کہ دونوں کتابوں میں مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملا جو ان کے ناموں نے پیدا کیے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا بہت تھوڑا حصہ میری سمجھ میں آیا۔ اکثر مقامات کا تو یہ حال ہے کہ سوال از آسمان و جواب از ریسمان کی طرف ذہن جاتا ہے اور مسائل کے حل کی کوشش انشا پردازی کی کوشش سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتی''۔ ص:11

جو شخص اس اظہار خیال پر قادر ہو گیا، وہ بے شک مغربیوں کے محض ترجمہ یا ترجمانی کی منزل سے نکل گیا۔ اور اب ایک خود دار اور آزاد اہل قلم ہو گیا۔

اردو ناول اور سماجی شعور میں بھی انھوں نے بڑے انصاف، توازن اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ یہ نہیں کہ اپنے بعض ہم عصر ناقدوں کی طرح نذیر احمد اور شرر کے نام پر لاحول پڑھتے، لعنت بھیجتے آگے بڑھ گئے ہوں۔ اپنی بڑائی اس میں نہیں کہ بڑوں کی تحقیر بے دھڑک کی جاتی رہے۔

جوش ملیح آبادی کی شخصیت پر انکا مضمون جتنا پر لطف ہے اسی قدر پر معنی بھی۔ ذیل کے ٹکڑے سے لطف اٹھانے میں آپ بھی شرکت فرمائیں:

''ان کی گفتگو بھولے پن اور دیوانہ بکار خویش ہشیار دونوں کیفیات سے بھری ہوئی ہوتی ہے اس لیے دو چار ملاقاتوں میں انھیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلد بازی مفید نہ ہوگی۔ ان میں ضد اور فراخ دلی دونوں ہیں اس لیے ان سے گفتگو کرنے میں بے صبر ہونا ان کے نہاں خانۂ دل تک نہ پہنچا سکے گا۔ بعض باتیں وہ بڑی آسانی سے مان لیں گے۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں زرا بھی جھجھک نہیں ہوگی۔ اور بعض اوقات بہت سیدھی سی بات پر گھنٹوں اڑے رہیں گے، یہاں تک کہ جو انھیں نہیں جانتا بڑی الجھن میں مبتلا ہو جائے گا۔'' ص:237

بعض اور عنوانات یہ ہیں:

''ادب اور تہذیب''، ''ادب میں جنسی جذبہ''، ''غالب کے غیر مطبوعہ خط''، ''زبان اور رسم خط''، ''اردو تنقید کا ارتقاء''۔

آخر میں صرف ایک مخلصانہ گزارش مصنف سے ہے۔ اردو محاورہ اور روزمرہ پر قابو زرا مشکل ہی سے آتا ہے۔ حروف صلہ میں ''میں'' اور ''پر'' کے درمیان فرق نہ کرنا یا ''نہیں'' اور ''نہ'' کو ہر جگہ مترادف سمجھ لینا، پڑھنے میں بڑی بے لطفی پیدا کر دینا ہے۔ جیسے لذیذ لقمہ کے چبانے میں کوئی کنکری دانت کے نیچے آ جائے! سرشار اور رسوا کے ناولوں کو اگر ذرا زیادہ غور سے پڑھ لیا جائے اور حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کے ہدایات پر اگر نظر جمالی جائے تو عبارت میں موثی اور دلکشی کہیں زیادہ پیدا ہو سکتی ہے۔

صدق جدید، نمبر 32، جلد 5، 8 جولائی 1955

(61) لکھنؤ کی زبان

ازمحمد باقر شمس صاحب لکھنوی،

360 صفحہ، قیمت تین روپیہ، منیجر دار التصنیف، 30، سی، رضویہ کالونی، ناظم آباد، کراچی (پاکستان)۔

کتاب کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کی زبان پر مفصل تبصرہ ہوگا یا کم سے کم اس کے ماضی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کتاب در اصل ایک لمبا مضمون ہی ہے، جو لکھنو سے نکلنے والے ایک اخبار کے جواب میں اور وہ بھی آج نہیں 1938 میں لکھا گیا تھا اور مضمون میں عموماً نہ وہ گہرائی ہے اور نہ جامعیت، جو ایک اچھی کتاب کے خصوصیات سمجھے گئے ہیں اور 1948 میں کچھ برائے نام سی نظر ثانی بھی اس پر ہوگئی ہے۔ پھر بھی کتاب کے اندر بہت کچھ ہے اور کتاب جیسی کہ وہ ہے، فی الجملہ قابل داد ہی کہی جائے گی۔

اصل کتاب 202 صفحہ تک آئی ہے، اور مختصر دیباچہ ومقدمہ کے بعد چار بابوں میں تقسیم ہے۔ پہلا باب اس بیان میں ہے کہ لکھنؤ کی زبان ٹکسالی ہے، اور اردو کے لیے لکھنؤ معیار کا کام دے سکتا ہے اور اسی باب میں لکھنؤ کی ادبی خدمات کو گنایا اور تصنیفی خزانہ کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے باب میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ ہے۔ دہلی والوں پر تنقیدیں اور ناسخ کے کارناموں کا بیان، تیسرے باب میں شاعروں کی دہلی سے لکھنؤ منتقلی کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں لکھنؤ کی زبان پر اعتراضات کے جوابات ہیں۔ ص:212 سے ضمیمہ شروع ہوا ہے، جو آخر کتاب تک چلا گیا ہے۔ اس میں کسی جونپوری مضمون نگار کے اعتراضات کے جوابات ہیں۔ اس میں لکھنؤ کا ٹکراؤ کچھ ہلکا سا جونپور سے ہوگیا ہے اور جا بجا بحثیں بالکل مقامی اور شخصی قسم کی آگئیں ہیں۔

کتاب کچھ زیادہ مرتب و منضبط صورت میں نہیں، بے ربطی کہیں کہیں نمایاں ہے، شیعی تمدن (کلچر) کی جھلکیاں بھی غیر مخفی ہیں اور جا بجا غیر لکھنوی افراد پر گرفتیں بھی بے ضرورت اور سختی کے ساتھ کردی گئی ہیں...... سیماب اکبرآبادی، مجروح پانی پتی، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور یہاں تک کہ میر تقی میر بھی اس زد میں آ گئے ہیں...... لیکن بایں ہمہ کتاب میں بہت سے ادبی نکتے اور کام کی باتیں بکھری ہوئی مل جاتی ہیں اور کتاب بہ حیثیت مجموعی ادیبوں، شاعروں اور طلبۂ زبان سب کے کام کی ہے۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 6، 30 دسمبر 1955

(62) نئے اور پرانے چراغ

از آل احمد سرور صاحب،

408 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ، ادارۂ فروغ اردو، امین آباد پارک لکھنؤ۔

مبارک بک ڈپو بندر روڈ، متصل ڈینسو ہال، کراچی 2، (پاکستان)۔

سرور صاحب پہلے ترقی پسند ہیں۔ اور پھر تنقید نگار۔ یہ ان کے 16 تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر ماہناموں میں پہلے نکل چکے ہیں اور خود یہ مجموعہ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ تیسرا ایڈیشن ہے جو کچھ ردو بدل کے بعد حال میں نکلا ہے۔

سولہ میں سے چند عنوان یہ ہیں:

اقبال اور ابلیس، اقبال اور اس کے نکتہ چین، غالب، جدید غزل گو شعراء، اکبر اور سر سید، نیا ادبی شعور، رشید احمد صدیقی کی شخصیت ...... مضامین کے تنوع اور گیرائی کا اندازہ اتنے سے ہو گیا ہوگا۔

سرور کی مشرقی تربیت انھیں بہت سنبھالے ہوئے ہے۔ پھر بھی ان کی تنقیدوں کا اصل مایۂ خمیر مغربی ہی نقادوں کے اصول و فروع ہیں قدرۃً وہ اپنی نقادی میں مشرقی سے کہیں زیادہ مغربی ہیں۔ اور مسلمان سے کہیں زیادہ ''آزاد خیال'' مضمون اقبال و ابلیس میں یہ رنگ اتنا چوکھا ہو گیا ہے کہ وہ صفحہ کے صفحہ بے تکلف اور اپنے ادبی ضمیر کی خلش کے بغیر انگریزی عبارتوں سے بھرتے چلے گئے ہیں! ابلیس سے متعلق بھی ان کا تصور و تخیل تمام تر ملٹنی ہے۔ حالاں کہ ابلیس ایک تمام تر اسلامی اصطلاح ہے۔ یہاں ملٹن یا گوئٹے کے شیطان کو دلیل راہ بتانا، یا بائبل سے سند لانا نہ معقولیت ہے نہ منقولیت بلکہ خاص ترقی پسندی ہی ہے!

سرور صاحب ذہین ہیں۔ شریف ہیں، وسیع النظر ہیں، مہذب و شائستہ ہیں، لیکن اسے کیا کیجیے کہ جس مکتب و فکر کے علمبردار ہیں اس کی وفاداری سے کسی حال

میں بھی چوکنا جانتے ہی نہیں۔ان کی ''ترقی پسندی'' ہزار پردوں میں بھی چھپائے نہیں چھپتی اور مذہب بیزاری چوں کہ صحیح یا غلط ترقی پسندی کا ایک جزو لاینفک بن چکی ہے اس لیے وہ کسی مذہبی شخصیت پر جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کی تراوش فکر مدح سے زیادہ قدح پر اتر آتی ہے۔حقیقت پسندی تعصب میں تبدیل ہو جاتی ہے اور داد کی شیرینی پر لامحالہ بیداد کی تلخیاں غالب آ جاتی ہیں۔......اقبال بہ ظاہر ان کے معتوب نہیں، ممدوح بلکہ خصوصی ہیں لیکن ان کی اقبال شناسی و اقبال فہمی کا اندازہ کرنا ہو،تو ذرا ان کے آئینہ میں اقبال کے چہرہ پر ایک سرسری اچنتی سی نظر کرتے چلیے:۔

''اقبال واقعی جتنا جدید فلسفہ سے واقف تھے اتنا جدید سائنس اور جدید سوسائٹی سے واقف نہیں تھے......وہ اپنی بڑھی ہوئی مذہبیت کی وجہ سے بعض اوقات سطحی مذہبیت کی حمایت میں مذہب کی انقلابی روح کو نظر انداز کر جاتے تھے......وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے تھے اور بعض اوقات صبح کاذب کو صبح صادق سمجھ لیتے تھے......بہت سی باتوں میں وہ گفتار کے غازی تھے۔کردار کے غازی نہ تھے۔گفتار میں بھی سب پہلوؤں پر ان کی نظر نہ ہوتی تھی۔وہ پہلے شاعر تھے اور پھر فلسفی اور ان کا کمال یہ تھا کہ آخری عمر تک انکی ذہنی نشو ونما جاری رہی اور وہ آگے بڑھتے رہے۔''(ص:113-114)۔

مدح و قدح کے اس عجیب آمیزہ میں ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے کہ داد کا جزو کتنا ہے اور بیداد کا کتنا اور مدح جتنی ہے بھی وہ کتنی سطحی، کتنی اتھلی اور ہجو ملیح سے کتنی قریب!

اور خیر یہ تو اقبال تھے جن سے مصالحت و مفاہمت کی کچھ نہ کچھ راہ پھر بھی ترقی پسندی نکال ہی لیتی ہے۔اس کی اصل زد پر تو حضرت اکبر ہیں۔ان کا نام آتے ہی ہجو وذم کی شمشیر آبدار غلاف سے پوری کی پوری باہر نکل آتی ہے۔

''ان کی نظر بلند نہ تھی۔ان کا قلب وسیع نہ تھا۔ان کی معلومات صحیح نہ تھیں اور وہ اوچھے ہتھیار استعمال کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے......اکبر دراصل ان لوگوں میں سے تھے، جو مذہب کو میراث کی طرح قبول کرتے ہیں۔بلکہ ہر میراث کو مذہب

سمجھتے ہیں۔ وہ جوانی میں رند تھے اور بڑھاپے میں صوفی، دونوں کا نشہ تیز تھا، مگر دونوں کا تعلق جذبات سے زیادہ تھا عقل سے کم......ان کا مذہب بھی دراصل خالص اسلام نہیں۔ مشرقیت معلوم ہوتا ہے......اکبر باوجود نیک نیت ہونے کے تنگ نظر ضرور تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ رند تھے مگر اپنی وضع قطع انھیں بہت عزیز تھی''۔ (ص:223-225)

گویا اکبر نے شاعری نہیں کی۔ اور نہ کوئی بات حکمت و معرفت کی فرمائی ہے بلکہ عمر بھر جھک ماری ہے اور نقاد صاحب جو یہ کھل کر نہیں فرماتے تو یہ عین ان کی مروت اور عالی ظرفی ہے!

سرور صاحب اکبر اور اقبال دونوں سے کہیں زیادہ قائل سجاد انصاری اور ان کے ''آرٹ'' کے ہیں۔ آج کے ناظرین حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کون بزرگ تھے؟ بزرگ نہیں آج سے 30، 35 سال قبل ایک خورد تھے۔ بڑے ہونہار، بڑے ذہین لیکن قبل اس کے کہ کیا بہ اعتبار خیالات کسی اعتبار سے بھی پختگی کو پہنچیں۔ عین جوانی میں شادی سے پیش تر ہی دق میں مبتلا ہوکر مہینوں اس کے شدید ترین آلام و مصائب جھیل کر اور مرض الموت میں اپنی بیجا شوخ نگاری سے توبہ کر کے وفات پا گئے۔ اس وقت تو ان کا ادبی کارنامہ کل یہ تھا کہ برنرڈ شا، اور اس سے بھی بڑھ کر برطانیہ کے فحش نویس آسکر وائلڈ کا چربا خوب اتارنے لگے تھے۔ سرور صاحب ان پر بے طرح مہربان ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کے پردہ مین اپنی مشن کی تبلیغ کا موقع خوب ہاتھ آجاتا ہے۔

''سجاد کو زاہد خشک کی زندگی میں خلوت نشینی اور عمل نیک کی خشکی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ان کا خیال ہے کہ زہد خشک کچھ انسان نما حیوانات ہی پر کھلتا ہے۔'' (ص:150)

''سجاد کا وار صرف فلسفی، صوفی اور زاہد خشک ہی پر نہیں وہ مذہب و اخلاق پر بھی چوٹیں کرتے ہیں'' (ص:151)

''سجاد انصاری...... ہر چیز پر ایک دلچسپ انداز سے تبصرہ کرتے ہیں۔ اس تبصرہ کی زد سے مذہب و اخلاق بھی نہیں بچتے'' (ص:161)

اور یہی راز نگاہ سرور میں ان کی مقبولیت کا ہے۔

جن ملفوظات عالیہ پر نقاد صاحب کو وجد آ گیا ہے ذرا ان کا بھی نمونہ ملاحظہ ہو:

''روز جزا کا ہیرو شیطان ہے۔ وہ حسن معاصی کی شریعت کا پیمبر اور خدا کا محرم راز ہے۔ (ص:153)

مجھے عقبیٰ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ اس کا منتظر ضرور ہوں۔ میں قرۃ العین کے قاتلوں کا حشر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' (ص:158)

''فرشتہ کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے'' (ص:151)

''شیطان کی انتہا یہ ہے کہ فرشتہ ہو جائے'' (ص:152)

خدا نے ابتدا میں صرف دو فرشتوں کو پیدا کیا تھا...... جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنت مضمر ہیں۔ سلسلۂ ارتقاء سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا'' (ص:152)

اس کم سواد تبصرہ نگار کو تو یہ فقرے اگر شاہکار معلوم ہوتے ہیں تو صرف صنعت اہمال یا بے مغزی کے۔ نقاد صاحب بڑا احسان وکرم اردو والوں پر کریں اگر ایک عام فہم شرح ان دقائق وحقائق کی شائع فرما دیتے کہ فرشتہ شیطان کا چولا اور شیطان فرشتہ کا چولا کس عجیب وغریب طریقہ سے اختیار کر سکتا ہے۔ شیطان روز جزا کا ہیرو کس طرح بن جاتا ہے۔ معاصی میں حسن کس ترکیب سے پیدا ہو جاتا ہے۔ شیطان کو خدا کے محرم راز ہونے کا منصب کس طرح حاصل ہو جاتا ہے۔ ملکوتیت میں عناصر شیطنت کیوں کر دخیل ہو جاتے ہیں اور قرۃ العین کی تعلیم میں وہ کیا بات تھی جو اس کے قاتلوں کا حشر دیکھنے کے لیے روز جزا قابل انتظار ہو جاتا ہے۔ یہ گزارش ان سے تعریضاً نہیں استفادۃً ہے۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی اس تلخ حقیقت کو واضح کر کے رہتی ہے کہ ترقی پسندوں میں جو سب سے اونچے اور چوٹی کے لوگ ہیں وہ بھی اقبال، اکبر کے نام لیواؤں سے کتنا دماغی بعد، کتنی ذہنی بیگانگی رکھتے ہیں۔

صدق جدید، نمبر 14، جلد 6، 2 مارچ 1956

(63) اردو زبان اور ادب

از ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب

198 صفحات۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

کتاب مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب ایم اے ڈی لٹ کے قلم سے ہے لیکن بہ ظاہر کتاب سے زیادہ مجموعہ مضامین معلوم ہوتی ہے۔ ایسے مضامین جو زبان وادب کے مختلف عنوانات پر مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں لیکن دیباچہ یا پیش لفظ کی قسم کی کوئی چیز اس الجھن کو صاف کرنے کے لیے موجود نہیں ___ بہر حال مضامین کے تنوع کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہوگا۔

تخلیق شعرا، غزل کا فن، جوش ملیح آبادی، اصغر گونڈوی، ہندی پنگل کی مبادیات، اردو مردانہ زبان ہے۔

مصنف اردو سے زیادہ لسانیات کے ماہر ہیں اور اس لیے قدرتاً ان کے وہی خیالات زیادہ قابل اعتنا ہیں جو لسانیات سے متعلق ہیں۔ اقبال، جوش، اصغر، غالب و میر کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے انھوں نے خاصا گہرا کیا ہے لیکن مناسبت انھیں سخن فہمی سے زیادہ فلسفۂ شعر سے معلوم ہوتی ہے اور وہ شعر سے لطف اٹھانے سے زیادہ قائل شعر کے تجزیہ و تحلیل نفسی کے ہیں۔

اقبال ان کے ایک حد تک محبوب شاعر ہیں لیکن بس ایک حد ہی تک اس کے آگے نہیں۔ انھیں اقبال کے ہاں تضاد نمایاں نظر آتا ہے اور اسی تضاد کی ایک مثال انھوں نے اقبال کے ان دو مصرعوں سے بہم پہنچائی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

حالانکہ یہاں نہ تضاد ہے نہ کوئی منتشر خیالی۔ یہ تو صرف ترقی فکر یا ارتقاء

شعور ہے۔ اقبال جب تک تقلیداً صرف ہندی تھے مصرعہ اول کی محدودیت ان پر طاری رہی جب آگے بڑھ کر وسعت فکر ونظر کی دولت انہیں حاصل ہوگئی تو قدرتاً مصرعہ ثانی کی ہمہ گیری کا زمزمہ ان کی زبان پر آیا۔ تضاد اگر یہی ہے تو دنیا کا ہر بوڑھا آدمی اپنی جوانی سے، ہر جوان اپنے بچپن سے، ہر منتہی اپنے دور ابتدائی سے، ہر فاضل اپنی طالب علمی سے متضاد ہوتا ہے۔ اقبال کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ کے بڑے طویل حوالے صفحہ 60 تا 63 کا محل بھی اس شعری وادبی مطالعہ میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اقبال کی شاعری میں مذہبیت کا جزو مصنف کے خیال میں محمود نہیں نامحمود ہے اور یہی چیز انھیں اصغر سے بھی اگر بیزار نہیں تو بیگانہ ضرور رکھے ہوئے ہے۔

> "زمانہ تیزی سے کروٹیں لے رہا تھا اس لیے اصغر کا اجتماعی شعور "خطاب بر مسلم" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شاعری میں یہ فرقہ پرستی اقبال کی پھیلائی ہوئی ہے۔ اس میں کبھی کبھی اصغر اور جگر جیسے غزل گو بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔" (صفحہ 109)

خدا معلوم اس وبا کا اطلاق صرف ملی شاعری تک محدود رہے گا یا وطنی شاعری پر بھی کبھی ہوگا؟

ہندوستان کی کھڑی بولی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے کیوں یہ لکھ دیا کہ اس کا نام کھڑی بولی اس لیے رکھا گیا کہ یہ بولی سخت تھی اور کانوں کو اتنی میٹھی نہیں معلوم ہوتی تھی اس پر مصنف کا حاشیہ ہے کھڑی کا مفہوم مولوی صاحب نے شاید کڑی لیا ہے کیونکہ سخت اور کڑا ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ تنقید کچھ زیادہ وزنی نظر نہیں آئی جب کہ آگے چل کر مصنف نے خود ہی کوئی امتیاز کھڑے کڑے میں قائم نہیں رہنے دیا ہے۔

کتاب مغربیت کے رنگ میں ڈوب کر لکھی گئی ہے اس لیے لامحالہ خیالات و تصورات میں ہی نہیں لب ولہجہ، زبان واسلوب بھی مشرقی رنگ کے نقادوں، سخن فہموں اور ادیبوں سے الگ ہے۔ الگ ہونے سے اس کا قابل ہجو یا لائق اعتراض ہونا لازم بھی آتا البتہ اس کا نامانوس ہونا تو ایک حد تک بالکل طبعی ہے۔

لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں مصنف نے عموماً صحت کا بالکل اہتمام رکھا ہے لیکن یہ التزام ہر جگہ قائم نہیں رہ سکا۔ اصول کی جگہ اصولوں اور علاوہ بجز کے معنی میں تبصرہ نگار کو بار بار کھٹکے ___ کتاب کے مضامین غور و فکر سے لکھے گئے ہیں اور کتاب کی حیثیت تفریحی نہیں علمی ہے۔

صدق جدید نمبر 29 جلد 7 مورخہ 21/جون 1950

(64) تذکرۂ نادر

مرتبہ سید مسعود حسن صاحب رضوی،

ادیب، ایم اے۔ ۱۱۰ صفحہ، قیمت دو روپے چار آنے، کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔

مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ نادر بنارسی (متوفی 1295ھ-1878ء) اگر ایک طرف غالب وشیفتہ کے معاصر ہوئے ہیں، تو دوسری طرف انھوں نے امیر، داغ کا بھی زمانہ پایا ہے۔ خود بھی ایک صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں اور صاحب تصانیف اہل قلم، ان کے ایک منظوم مجموعہ کا نام ہے۔ دیوان طرب، جس میں انھوں نے پانچ سو سے اوپر شاعروں کی غزلیں دے کر ان پر خمسے تیار کیے ہیں۔ یہ کتاب اگر چہ چھپی ہوئی ہے لیکن اب اس کا شمار گمنام ونادر ہی کتابوں میں ہے اور اس کے نسخے خاص ہی خاص کتب خانوں کی زینت ہوں، تو ہوں، ورنہ عام طور سے تو کہیں دکھائی نہیں دیے۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی جو ''ادیب'' نام ہی کے نہیں کام کے بھی ہیں۔ انھوں نے یہ کیا ہے کہ اس ضخیم مجموعہ سے ان 521 شاعروں کے حالات سب الگ کر لیے ہیں اور ہر شاعر کی غزل سے پانچ پانچ شعر بھی لے لیے ہیں اور اس طرح ایک نئی اور مستقل کتاب گویا ''خلق'' کردی ہے! - تصنیف کی جگہ ''تخلیق'' جو ایک نیا لفظ کچھ روز سے دیکھنے میں آرہا ہے اسے تو ''ترقی پسندوں'' ہی کے لیے چھوڑیے، باقی ترتیب وتہذیب کے اس اچھوتے نمونے کے لیے ''خلق کرنے'' سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملتا- مرتب صاحب یوں بھی اپنے ذوق کی شگفتگی و سنجیدگی کے ساتھ اپنی ادبی جدت وندرت کا ثبوت مدت سے دیتے چلے آرہے ہیں۔

تذکرۂ نادر اسم بامسمیٰ تذکرۂ ''نادر'' ہی ہے۔ ان 521 شاعروں میں مشہور شاعر تو کہنا چاہیے کہ سب ہی آگئے ہیں، غیر معروف وگمنام بھی نامعلوم کتنے آگئے ہیں اور متعدد ایسے شاعروں کی غزلیں بھی دیکھنے میں آگئی ہیں جو کسی اور صنف شاعری

میں جیسے بھی مشہور ہوں، بہ حیثیت غزل گو کے اب تک غیر معروف ہی تھے۔ مثلاً میر انیس یا مرزا دبیر، شعر پانچ ہی پانچ سہی، بہر حال ان ''پنجتنی'' شاعروں کے تغزل کا کچھ ہلکا سا جلوہ تو دکھا ہی دیتے ہیں۔ پانچ کی مناسبت سے یہ بھی یاد کر لیجیے، کہ اصل کتاب یعنی دیوان طرب میں مصنف کے خمسے ہی خمسے ہیں۔

ایک بات یہ بھی سن لینے کی ہے کہ کتاب میں جن ہندو شاعروں کا کلام درج کیا گیا ہے اُن کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، یعنی کوئی 75 ہوگی۔ آخر میں ایک بڑی مفصل فہرست اسماء ہے اور شروع میں 10، 12 صفحہ ایک خوبصورت سا مقدمہ ہے۔ حشو و زوائد سے پاک اور ہر طرح گٹھا ہوا، مجمل۔

صدق جدید، نمبر 41، جلد 9، 11 ستمبر 1959

(65) تشبیہات رومی

از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم،

ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،

مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ناظم ادارہ ثقافت اسلامی پاکستان نے دوسرے علمی کام جس نوعیت اور مرتبے کیے لیے ہوں، کلام رومیؒ کی خدمت اچھی خاصی کر گئے اور حکمت رومی کے بعد یہ دوسری قابل قدر کتاب ہے جو ان کے قلم سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ 6 صفحہ کے مقدمہ کے بعد جو تشبیہ و تمثیل کی حقیقت پر ہے اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے اور مثنوی کے چھ دفتروں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک باب وقف ہے۔ اور اس طرح جتنے بھی مسئلے مولانا نے تشبیہ و تمثیل کے ذریعہ سے بتائے ہیں کہنا چاہیے کہ ان کے بیش تر حصہ کا عطر یا مغز اس کتاب میں آ گیا ہے۔ خلیفہ صاحب پہلے ہر مسئلہ کا بیان اپنی سلیس عبارت میں کر جاتے ہیں اور اس کے بعد مثنوی کے شعر درج کر دیتے ہیں اور اس طرح ہر مسئلہ عام اردو خواں کے لیے دلنشیں ہو جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب کے دلچسپ طرز تحریر کے اندازے کے لیے شروع کتاب کے دو نمونے کافی ہوں گے۔

''عارف رومی تمثیل و تشبیہ کے بادشاہ ہیں، ہر قسم کے اخلاقی اور روحانی مسائل کو سمجھانے کے لیے اگر چہ ایک حد تک حکیم معنوی ہونے کی وجہ سے منطقی استدلال بھی کرتے ہیں۔ لیکن بات زیادہ دلنشیں اور یقین آفریں اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی تشبیہ یا مثال کے ذریعہ سے مطلب کو واضح کرتے ہیں ان کی مثنوی حکمت و عرفان کا بحر زخار ہے۔ ان کے بیان میں استدلال اور ذاتی وجدات

ہم آغوش ہیں۔'' ص:7

مولاناؒ مثنوی کے آغاز ہی میں بانسری بجانا شروع کرتے ہیں اور بانسری کی تشبیہ سے وہ روح انسانی کی ماہیت، اس کے مقصود و میلان کو دل نشیں اور دل سوز طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ کا بانسری کا مضمون ان کی تمام مثنوی اور تمام تصوف کا لب لباب ہے۔ ان ابتدائی اشعار کو باقی مثنوی سے کچھ ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ سورہ فاتحہ کو قرآن کریم سے۔ جس طرح تمام قرآن اور اسلام کا عطر سورہ فاتحہ میں موجود ہے اسی طرح مولاناؒ کے بانسری کے اشعار میں جو مثنوی کی تمہید ہیں ان کا تمام تصوف اور فلسفہ ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے''۔ ص:8

توضیح مطالب میں جا بجا جامی اور حافظ اور غالب و اقبال وغیرہ کے فارسی اور اردو کلام کا بھی پیوند لگاتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں مقولے سعدی اور شیخ اکبر وغیرہ کے پیش کرتے گئے ہیں۔ ادارہ نے اپنی بعض مطبوعات کے ذریعہ جتنا بھی مفسدہ پھیلایا ہوا اس کا کفارہ بڑی حد تک اس کتاب سے ہو گیا ہے۔

صدق جدید، نمبر 6، جلد 10، 8/جنوری 1960

(66) صہبائے مینائی

از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی،

مکتبہ عارفین ڈھاکہ۔

کتاب کا موضوع امیر مینائی ہے اور ان کی شاعری - موضوع خود چونکا دینے والا۔ گویا غریب امیر کو پڑھنے والا کوئی اس ترقی پسندی کے دور میں بھی موجود ہے! اور وہ بھی کوئی قدامت زدہ بوڑھا شاعر نہیں بلکہ ایک جوان عمر ایم اے اور پی ایچ ڈی! - لیکن ڈاکٹر آفتاب کا نام دیکھ کر حیرت رخصت ہوگئی وہ تو ایک جانے ہوئے قدر شناس ہیں پرانی قدروں کے اور مانے ہوئے جوہری ہیں ماضی قریب کے ادبی خزانوں کے! ابھی کچھ ہی دن ہوئے جب گلہائے داغ میں نئے نئے گل کھلائے تھے اور اب صہبائے مینائی کے جام چڑھاتے ہوئے محفل میں وہ آئے ہیں۔ داغ کے بعد امیر کا نمبر آنا ہی تھا۔

شادانی صاحب اور مصنف کے دیباچوں کے بعد باب اول ''شعر و شاعری'' پر ہے۔ بہتر تھا کہ اس کا عنوان ''مشرقی شاعری'' یا ''اردو شاعری'' ہوتا۔ یہ باب مصنف نے جن تیکھے تیوروں کے ساتھ قلم بند کیا ہے اس کی ہمت بس انھیں کا قلم کر سکتا تھا اور یہ اتنا جامع پر مغز و متوازن ہے کہ مصنف آگے کچھ نہ لکھتے جب بھی سب کچھ لکھ جاتے۔ دو چار سطریں پڑھ کر خود اندازہ کیجیے کہ مصنف کا قلم کتنی جان اور کیا دم خم رکھتا ہے۔

مشرقی شاعری کی بڑائی اس بات میں نہیں کہ اس میں کس حد تک مغربی اثرات کارفرما ہیں اور کہاں تک اس نے طرز مغرب کی پیروی کی ہے۔ اپنی روایات کو ٹھکرایا ہے بلکہ اس میں ہے کہ وہ کس حد تک اپنی مشرقی انفرادیت یا خصوصیات کو بر قرار رکھ کر دوسرے ممالک کی شاعری سے ہم چشمی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

اردو شاعری کی بدبختی حالی کا مقدمہ شعروشاعری ہے اور حالی اور مقدمہ شعرو شاعری دونوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ انہیں غلط سمجھا گیا ہے۔ اصلاح کے مشورہ کو بغاوت کی تلقین سمجھنا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔ ''اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم چوب نے میں الجھ گئے نے نواز کے دل تک رسائی حاصل نہ کر سکے یہ تو دیکھ لیا کہ انھوں نے کیا کہا ہے، لیکن اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کے کہنے سے ان کا مقصد کیا تھا''۔ص:18

یہ تعلیم و تلقین عین اس زمانہ میں جب ''نقادی'' کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ چیخ چیخ کر ٹی ایس ایلیٹ اور جیمس جوائیس اور فلاں فلاں ''صاحب'' کے سروں میں سر ملا دیا جائے!۔ اور اردو شاعری تو خیر تھی ہی مصنف نے اسی طنطنہ سے مدافعت لکھنؤ کی بدنام شاعری کی بھی کی ہے اور ناسخ وزیر، رند قلق یہاں تک کہ میاں امانت کے کلام سے بھی جواہر ریزے نکال کر پیش کر دیے ہیں!۔

باقی تین باب امیر کی شاعری کے پس منظر امیر کی شخصیت اور ان کی شاعری پر تبصرہ کے لیے وقف ہیں۔ اور تینوں باب اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل۔ اس کے بعد صدہا شعر امیر کے چاروں دیوانوں سے انتخاب کر کے پیش کیے ہیں جن کا ہر صفحہ روکش گلزار۔ آخر میں چند ضمیمے ہیں ان میں امیر کی تصانیف کا ذکر ہے اور متفرقات۔منفرد مضمون سے الگ ہو کر زبان و انشاء کے اعتبار سے بھی کتاب پھولوں میں تلنے کے قابل ہے۔ اودھ کے شرفاء کا فصیح سلیس شستہ روزمرّہ، اب یہ زبان بھی کم تر دیکھنے میں آتی ہے۔ اور ان کمیاب نمونوں میں سے ایک کامیاب نمونہ یہ مجموعہ اوراق۔ روشن جیسے آفتاب، خنک جیسے ماہتاب۔

صدق جدید، نمبر 7، جلد 10، 15 جنوری 1960

(67) گل رعنا

مرتبہ مالک رام صاحب

قیمت مجلد سات روپے پچاس پیسے،

علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ، دہلی۔

یہ کتاب غالب کا تقریباً اولین دیوان اردو اور فارسی ہے اس کا زمانہ انتخاب 1828 ہے اور اس میں ان کی اردو غزلیں 116 اور فارسی 27 کی تعداد میں درج ہیں اور اردو غزلیں زیادہ تر تخلص اسد کے ساتھ ہیں فارسی کلام کے شروع میں ایک فارسی قصیدہ بھی ہے۔ کلام کے شروع والا دیباچہ اور خاتمہ بھی غالب ہی کے قلم سے فارسی میں ہی اور مقدمہ مرتب کے قلم سے پر مغز ہے۔ اگر چہ محمد حسین آزاد پر گرفت کہیں زیادہ سخت ہو گئی ہے۔ حاشیے بھی محنت و دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ غالبیات کے ذخیرہ میں کتاب کے آجانے سے ایک معقول وقیمتی اضافہ ہو گیا ہے۔

صدق جدید نمبر 36 جلد 20 مورخہ 14/ اگست 1970

(68) شرح دیوانِ غالب

ازسید محمد احمد بیخود موہانی مرحوم

614 صفحہ تقطیع 26x20 مجلد، قیمت پندرہ روپے

دانش محل، امین آباد لکھنؤ۔

آج سے کوئی 30، 35 سال پہلے لکھنؤ میں جناب بیخود موہائی (استاد فارسی شیعہ کالج لکھنؤ) اردو کے ایک ممتاز نقاد و ادیب و محقق رہا کرتے تھے۔ ان کی شرح غالب کے تذکرے اہل ادب کی زبان سے سننے میں آتے رہتے تھے۔ کتاب اب تک شایع نہیں ہوئی تھی۔ اب پہلی دفعہ مصنف کی وفات کے کوئی تیس سال بعد جا کر چھپی ہے------ اور شارح کی شہرت کے عین مطابق ہے، شروع میں دیباچہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صدر شعبہ اردو (لکھنؤ یونیورسٹی) کے قلم سے۔ دیباچہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بلیغ و پرلطف ہے اور کچھ نہ کہنے پر بھی بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔

غالب کی شرحیں متعدد ایسی ہیں جو خود شرح طلب بن گئی ہیں، یہ ان میں نہیں، یہ بس شرح ہے جیسی کہ شرح ہونی چاہئے۔ یہ غالب کے حل مطالب کی ایک کلید ہے۔ طباطبائی مرحوم سے اس کی نوک جھونک خصوصیت کے ساتھ قابلِ دید ہے۔ غالب کے شائقین اگر اس شرح کو اپنے مطالعے میں رکھیں گے تو انشا اللہ اپنے آپ کو گھاٹے میں نہ پائیں گے۔

صدق جدید نمبر 51 جلد 20 مورخہ 27 نومبر 1970

صنف ادب (حکایت)

(69) حکایاتِ رومی حصہ اول

مترجم: مرزا نظام شاہ لبیب،
انجمن ترقی اردو، دہلی۔

مثنوی شریف اور اس کی حکایات سے آج کس کے کان نا آشنا ہیں؟ مولانا کا طرزِ تعلم یہ ہے کہ تصوف و سلوک کے ہر مسئلہ کے ضمن میں تشریح و تمثیل کے لئے حکایات بکثرت لاتے ہیں۔ اور پھر حکایات کے اندر دوسری حکایتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ہر حکایت نتیجہ خیز اور سبق آموز ہونے کے ساتھ دلچسپ و دلآویز بھی ہوتی ہے۔ اردو میں ان کا منتقل ہو آنا اردو خوانوں کی خوش قسمتی ہے۔ کتاب کا ابھی صرف حصہ اول شائع ہوا ہے اس میں کل مثنوی کے نصف حصہ یعنی دفتر سوم تک کی حکایات آ گئی ہیں۔ اور ان کی مجموعی تعداد 82 ہے۔ ترجمہ ٹھیٹھ لفظی نہیں ہے جا بجا حذف و اختصار سے کام لیا گیا ہے اور جن حکایات میں اعتقادی رنگ زیادہ ہے یعنی جو صرف مسلمانوں کے کام کی ہیں نیز وہ قصے جو بچوں اور لڑکیوں کے سامنے لانا مناسب نہ تھے وہ سب چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مترجم مرزا نظام شاہ صاحب لبیب دہلی کے شاہی خاندان کے رکن ہیں کس کے منہ میں زبان ہے جو ان کی زبان پر حرف رکھ سکے؟ اور پھر کہنہ مشق اہلِ قلم سید ہاشمی فرید آبادی کے مشورہ و نظر ثانی نے تو اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کتاب انجمن ترقی اردو کے سلسلہ میں ایک مفید اضافہ ہے۔

صدق نمبر 19 جلد نمبر 5 مورخہ یکم فروری 1940

(۷۰) حکایت رومی: (حصہ اول ودوم)

ترجمہ از مرزا نظام شاہ صاحب لبیب ؔ

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

حکایات رومی حصہ اول کوئی ڈھائی تین سال کا عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی اور اس زمانہ میں ریویو بھی ان صفحات میں نکلا تھا۔ اب دونوں حصے ایک ساتھ شائع ہونے سے کتاب مکمل ہوگئی ہے۔ مثنوی کی حکایتیں حذف واختصار کے بعد سلیس اردو میں بیان کردی گئی ہیں۔ اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ کتاب عورتوں، بچوں سب کے لیے قابل مطالعہ رہے۔ حصہ اول مثنوی کے دفتر سوم تک تھا۔ حصہ دوم مثنوی کے دفتر ششم تک آ گیا ہے۔ مثنوی کی معنویت پر کچھ کہنا تحصیل لا حاصل ہے۔ مترجم لبیب صاحب ایک تو خود دہلوی بلکہ شاہی خاندان کے اور پھر مسودہ پر سید ہاشمی فرید آبادی کی نظر ثانی۔ زبان کی صحت اور بیان کی سلاست کا کہنا ہی کیا۔

صدق جدید، نمبر 22، جلد 12، 26 / جولائی 1946

صنف ادب (خاکے)

(71) کیا خوب آدمی تھا

مرتبہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر۔ دہلی

آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن کو 1939 میں یہ اپج سوجھی کہ ہندوستان کے چند مشاہیر حال و (خاص کر مشاہیر ادب) کو لے کر ان پر ان کے کسی جاننے والے سے کسی نیاز مند سے ایک ایک تقریر پندرہ منٹ والی کرادیجیے۔ عنوان عمومی یہ تھا ''کیا خوب آدمی تھا'' حالی۔ نذیر احمد داغ اقبال چکبست راشد الخیری، مولانا محمد علی وغیرہ کل اا مشاہیر انتخاب میں آئے، سلسلہ کا آغاز راشد الخیری مرحوم سے ہوا اور خاتمہ مولانا محمد علیؒ پر۔ بولنے والوں میں بیخود دہلوی، خواجہ عبدالمجید دہلوی، ملا واحدی، پنڈت کیفی وغیرہم۔

محمد علی پر تقریر مدیر صدق نے کی تھی جو صدق میں نکل بھی چکی ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس نے خوب کیا جو ان کو یکجا کر کے ایک مستقل شکل دے دی۔ تقریر یں بھی اچھی ہیں اور بعض تو بہت دلچسپ۔

کاغذ، کتابت وجلد بھی اچھی ہیں۔ لیکن اغلاط مطبعی کی کثرت نے سارا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ پڑھنے والے کی طبیعت خوش ہوتے ہوتے یک بارگی جھنجلا کر رہ جاتی ہے۔ ناشر نے جہاں اتنا اہتمام کاغذ، کتابت، وغیرہ کا کیا تھا۔ کاش اس کا آدھا صحت کا کرلیا ہوتا، شروع میں ایک ننھی منی سی تقریب ڈاکٹر عابد حسین کے قلم سے ہے۔

صدق نمبر 20 جلد 7 مورخہ 15 ستمبر 1941

(72) گنج ہائے گرانمایہ

از جناب رشید صاحب صدیقی،

ضخامت 219 صفحے، اردو بک ایجنسی، علی گڑھ۔

خنداں کے بعد گریاں! رشید صدیقی کا نام سب جانتے ہیں، یہ علم کم لوگوں کو ہوگا کہ وہ اگر ہنس سکتے اور ہنسا سکتے ہیں تو، رو بھی سکتے ہیں اور رلا بھی سکتے ہیں ان کے مزاحیہ مضمون کے مجموعے پہلے نکل چکے ہیں یہ تازہ مجموعہ ان کے تعزیتی مضامین کا ہے۔ ظریف کے آنسو! آنسو نہیں موتی کے دانے ہوتے ہیں۔ اردو کا یہ شوخ نگار آج سوگوار اپنے محبوبوں کے مزار پر عقیدت و محبت کے پھول ہاتھ میں لیے فاتحہ پڑھنے نکلا ہے، اس کا اداس چہرہ، اس کا اداس بشرہ، اس کا حسرت انگیز لہجہ سب قابلِ دید ہیں۔

محبوبوں کے نام آپ سنیں گے؟ ان میں سے بعض تو یقیناً آپ کے بھی محبوب ہوں گے۔ (1) محمد علی۔ (2) ڈاکٹر انصاری۔ (3) مولانا سلیمان اشرف۔ (4) مولانا ابو بکر محمد شیث۔ (5) اصغر گونڈوی۔ (6) ایوب عباسی۔ (7) اقبال۔ (8) احسن مارہروی۔ اقبال، محمد علی، انصاری کو تو ایک دنیا جانتی ہے۔ اصغر بھی کچھ ایسے گمنام نہیں۔ دونوں مولانا بھی علی گڑھ کے حلقے میں خوب مشہور صرف ایک ایوب عباسی سے دنیا ناواقف تھی، اب واقف ہو جائے گی۔

مضمون بڑا کوئی بھی نہیں۔ سب لکھے ہوئے ہیں۔ لکھوائے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن محمد علی والا مضمون مختصر ہونے کے باوجود سب سے ممتاز ہے، اپنی مثال آپ ہے لکھنے والے کے لیے باعثِ فخر ہے، موجب اجر کا بھی، ایک بار سچ میں نکل چکا ہے مستحق اس کا ہے دوبارہ چھپے بار بار چھپے۔

کتاب سب کے پڑھنے کے قابل ہے نوجوان طلبہ کے لیے خصوصاً وہ

دیکھیں اور سمجھیں کہ جو قلم لطیف مزاح پر قادر ہے وہ تعزیت سے معذور نہیں۔ اور جو قلم لطف و مسرت کی گدگداہٹ کا خزانہ ہے وہ درد و غم کی بھی کسک سے خالی نہیں۔ ادیب بننے سے پہلے شریف ہونا ضروری ہے اور یہ کتاب ایک خادم کی شرافت کی دستاویز ہے۔

صدق نمبر 19 جلد 8 مورخہ 7/ستمبر 1942

(73) چند ہم عصر:
از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب،
217 صفحہ تقطیع 22x18 قیمت تین روپیہ، انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ کراچی (پاکستان)

اپنے معاصرین پر قلم اٹھانا جہاں اس لحاظ سے آسان بھی بہت ہے کہ جتنے موقع ان سے واقفیت کے حاصل رہتے ہیں۔ اتنے گزشتہ تاریخی شخصیتوں کے لیے کہاں ممکن ہیں۔ وہیں اس اعتبار سے سخت دشوار بھی ہے، کہ قلم ان پر لکھنے کے لیے آزاد نہیں ہوتا۔ بلکہ کہیں دباؤ کہیں مروت کہیں خوف کہیں لالچ، کہیں خوشامد کہیں حسد، غرض کوئی نہ کوئی بیڑی قلم کے پیر میں پڑی ہی رہتی ہے--- قابل داد ہے وہ صاحب قلم جو ان سب بیڑیوں کو توڑ تاڑ اپنی آنکھوں دیکھے ہوئے لوگوں کی سیدھے سادے لفظوں میں رنگ آمیزی کے بغیر (رنگ آمیزی کے بغیر''، ''رنگ'' کے بغیر نہیں) تصویر کھینچ لے جائے۔

بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق کچھ اس قسم کا مذاق فطرت ہی سے لے کر آئے ہیں۔ آدمی جذباتی نہیں۔ معقولی قسم کے ہیں۔ اور پھر جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے لگی لپٹی کے بغیر بے دھڑک کہہ بھی ڈالتے ہیں۔ اپنی اس صلاحیت کا صحیح اندازہ کر کے انھوں نے اپنے 23 ہم عصروں کے چربے تیار کر دیے ہیں۔ اور ان 23 میں کوئی قید بڑے چھوٹے کی نہیں ان میں نامور مشاہیر بھی ہیں۔ جیسے سرسید، حالی، امیر مینائی و محمد علی اور گمنام بھی نور خاں اور نام دیو مالی اور بعض ایسے بھی جو نہ شہرت کے نام بلند پر ہیں نہ گمنامی کے قعر میں بلکہ دونوں کے ادھڑ میں جیسے ڈاکٹر شیخ اقبال میرن صاحب اور پروفیسر ریبٹ سک--- اور تقسیم عنوانات اگر بجائے طبقاتی کے زمانی معیار سے کیجیے تو مجموعہ کے سب سے پہلے مضمون پر تاریخ 1900 درج نظر آئے گی اور سب سے آخری پر سنہ 1953 پڑا ہوا۔ گویا ایک ادیب کی 50 سال سے اوپر کی مشق قلم کا مرقع! مجموعہ کی ندرت کا یہ پہلو بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔

کتاب شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور سنجیدگی خشکی کے مرادف نہیں۔ اشخاص ورجال کے کرداری خصوصیات پر روشنی بھی اس سے خوب پڑتی ہے۔ مشاہیر وغیرمشاہیر دونوں کی زندگیوں کو مصنف نے خوب خوب پرکھا، جانچا، تولا ہے۔ مضمون اپنی اپنی جگہ سب ہی قابل مطالعہ ہیں لیکن نمبر اول پر میرن صاحب سوزخوان پر ہے۔ یہ وہی میرن صاحب ہیں جن کا ذکر غالب کے خطوط میں بار بار آرہا ہے۔ بابائے اردو قدیم صحبتیں دیکھے ہوئے ہیں! اور ساتھ ہی بزم جدید کی میز کے بھی مزے اٹھائے ہوئے ہیں! اس لیے ان کے قلم میں قدرۃً دونوں رنگ کی دل چسپیوں کا منظر کھنچ آیا ہے۔ زبان کی خدمت میں ان کی عمر گزر چکی آج کس کی مجال ہے جو ان کی زبان پر حرف گیری کر سکے پھر بھی بھول چوک لازمۂ بشریت ہے۔ دو جگہ ذرا کھٹک پیدا ہوئی شبہات محض استفادۃً عرض خدمت ہیں۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حالات میں لکھتے ہیں:

''ان پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا۔ اور ان کے آخر زمانہ کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بو آتی ہے۔ (ص109)

لفظ ''بو'' فارسی میں جو بھی وسیع مفہوم رکھتا ہو، اردو میں 'بو' اور ''بو آنا'' تو صرف محل ذم پر آتا ہے۔ اور ''بدبو'' کے معنی میں چلا ہوا ہے۔

اسی طرح ص183 پر عذر کے حالات میں ہے:

''سارے شہر میں بھاگڑ مچ گئی۔ سینکڑوں گولی کا نشانہ بنے، صدہا سولی پر چڑھا دیے گئے۔''

'سولی' بے شک بعض اہل زبان 'پھانسی' کے معنی میں بھی لکھ گئے ہیں۔ تاہم مصنف کے قلم حقیقت رقم کے زیادہ شایان شان یہ فقرہ ہوتا ''صدہا پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔''

کتاب چند ہی سال کے عرصہ میں چوتھی بار شائع ہوئی ہے۔ اور اب کی پانچ مقالوں کے اضافہ کے ساتھ، حسرت موہانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ کتاب کے حسن قبول کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔ اور حسن قبول بلا وجہ نہیں۔

صدق جدید، نمبر42، جلد8، 8مارچ1943

(74) شیش محل

از شوکت تھانوی،

اردو بک اسٹال، لاہور

شوخ نگاری وظرافت دوسروں کے لیے پطرس بلکہ رشید صدیقی تک کے لیے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنالیا ہے اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فنکار کی نگاہ ہوگئی ہے۔ ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔ شیش محل ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے۔ اپنے ملنے والوں کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انھوں نے اس قلمی آئینے میں دکھائے ہیں۔ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ افراط نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ قلمی نگار خانہ یا یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کے ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف وتعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول! ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی۔ بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی۔ ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہیں، غرض ریاض خیر آبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی سے لے کر افقر موہانی، امید امیٹھوی اور صدیق بکڈ پو تک ہر ردیف ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں شاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہو گیا ہے اور کہیں دوغزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیتا ہے۔ چہرے یقیناً دلچسپ ودلکش سب کے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا کسی پر رعنائی وزیبائی کا نقاب پڑا ہوا کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ بھرا ہوا، کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم وابرو پر غضب کا بانکپن۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگار خانہ خود مصور کے مرقع سے خالی ہے...... مجنوں کا ڈرامہ بغیر مجنوں کے پاٹ کے یا برات بغیر نوشہ کے! عرضی دعویٰ بغیر بقلم خود کے؟...... ظریف کی ستم ظریفی!

صدق نمبر 26، جلد نمبر 9،، یکم نومبر 1943

(75) دید و شنید

از مولوی سید رئیس احمد جعفری،

کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور۔

کتاب کا انتساب ''چشم بصیرت'' کے نام ہے۔ عنوان کتاب کے دونوں جزوں کی مناسبت سے دیدہ عبرت کے ساتھ گوش ہوش کے نام بھی ہو سکتا تھا۔

مولوی رئیس احمد خیر آبادی اردو خوانوں کی دنیا میں اب بالکل اجنبی نہیں-------پہلے بمبئی جا کر روزناموں کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ابھرے پھر پنجاب اور سندھ کے افق پر ناول نگار بن کر چمکے لیکن اس سے بھی قبل بہت قبل محمد علی کے سیرت نگار کی حیثیت سے نمودار ہو چکے تھے۔ وقت کے باقی باللہ کی شخصیت میں اپنے کو ضم کر دینے والا خود بھی کسی درجہ میں فانی فی اللہ کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور اس کی شہرت کی اصل ضامن یہی ہے-------- فی الجملہ وہ خود اس قابل ہیں کہ ان کا تعارف تفصیل سے کرا دیا جائے لیکن بالفعل تو وہی دوسروں کی رہنمائی کرا رہے ہیں اور اسی میں انھیں رہنے دیجیے۔

کتاب ہندوستان اور بیرون ہند کی تقریباً ایک سو دس شخصیتوں کا تعارف نامہ ہے'' جنھیں میں نے دیکھا''، ''جن سے میں ملا''، ''جن کو میں نے پرکھا''۔

یہ تین فقرے ختم کتاب پر کھلتا ہے کہ یوں بھی لکھے جا سکتے تھے۔

''جنھیں میں نے پڑھ لیا''، ''جنھیں میں نے بھانپ لیا''، ''جنھیں میں نے چھانٹ لیا''۔

اس 110 کی فہرست میں یہ سوال نہ کیجیے کہ وقت کے ادیبوں، لیڈروں، شاعروں، ایڈیٹروں، فاضلوں اور درویشوں میں سے کون کون ہیں۔ سوال یہ کیجیے کہ کون کون

نہیں ہیں؟ مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی اور عبدالعزیز ثعالبی ٹیونسی سے شروع ہو کر اور ظفر علی خاں اور ظفر الملک مرحوم اور اقبالؔ اور جوشؔ، صلاح الدین سلجوقی اور شعیب قریشی اور چودھری خلیق الزماں اور گاندھی جی اور جواہر لال نہرو اور خواجہ حسن نظامی اور مولانا تھانوی کو طے کرتی ہوئی جو فہرست شہزادی سلمٰی اور عطیہ بیگم فیضی پر ختم ہوتی ہو اس کے طول و عرض کا رقبہ تو خیر باقی اس کے عمق کی تھاہ کون پا سکتا ہے------- جگ بیتی کے بین السطور جو آپ بیتی غیر شعوری طور پر مرتب ہوتی گئی ہے وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ''حدیث دیگراں'' کے پردہ میں ''سِرّ دلبراں'' بھی کچھ گفتہ اور کچھ ناگفتہ! مصور غریب اب اس کو کیا کرے کہ بے ارادہ سہی مرقع کے صفحہ پر کچھ اپنا بھی عکس ساتھ ساتھ اترتا آ گیا ہے۔

کتاب 15 مختلف عنوانات میں تقسیم ہے مثلاً مجاہدین صف شکن، صوفیائے عظام، رہنمایان ملت، اصحاب ادب، شعرائے عصر وغیرہ کہیں کہیں قافیہ کی لہر آ گئی ہے مثلاً علمائے کرام، صوفیائے عظام، طبع مواج اگر اس کے التزام پر آ جاتی تو اور قافیوں کو لانے کے لیے بھی کہیں بہت دور جانے کی ضرورت نہ تھی۔ امراء ذی وقار کے ساتھ ش[illegible]ئے نامدار بآسانی دے سکتے تھے اور رہبرانِ ملت کے ردیف مجاہدین امت بخوبی [illegible]تے۔

ریویو نگار نے کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا ہے بجنسہٖ اس باب کے جو مدیر صدق پر ہے۔ 11 صفحوں میں سے صفحہ ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ پڑھا ہی نہ جا سکا------- مداحی اور حسنِ ظنِ شاعرانہ کی بھی کوئی حد ہونا چاہیے۔ مصنف کے قلم پر غالب رنگ مدح و تحسین اور حسنِ ظن کا ہے۔ اپنے مرشد مولانا مفتی حیدر حسین ٹونکی محدث دارالعلوم ندوۃ سے تو انھیں بے پناہ عقیدت و محبت ہونی ہی تھی اور ان کے 50 صفحے کے تذکرے میں وہ چھوٹا بڑا ہر واقعہ لکھتے ہی چلے گئے ہیں۔ باقی اور بھی جن جن کی انھوں نے مداح سرائی کی ہے انھیں مبارکباد ہی دینے کو جی چاہتا ہے۔

مدح کی داستان گر سنیئے ہے قلم میرا ابر گوہر باز

خواجہ حسن نظامی (خدا جانے انہیں صوفیائے عظام کے حلقے میں حکیم الامت تھانوی اور مولانا عین القضاۃ لکھنوی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھ کر تبسم سا کیوں آ جاتا ہے) مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، چودھری خلیق الزماں، مولوی مسعود علی ندوی (علمائے کرام کی صف میں انہیں دیکھ کر داد دینی پڑی کہ ندوہ سے ان کی ''سند عالمیت'' آخر آج کام آ ہی گئی۔ ڈاکٹر حکیم عبدالعلی ندوی، سر راس مسعود، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، بھولا بھائی ڈیسائی سب انہیں خوش نصیبوں میں داخل ہیں۔ لیکن جا بجا رنگ جمالی پر شان جلالی بھی غالب آ گئی ہے۔ ان بدنصیبوں سے بے اختیار ہمدردی کرنے کا جی چاہنے لگتا ہے۔ جن کے حصے میں بجائے مدح کے قدح آئی ہے۔

قدح کا التزام گر رکھئے ہے زباں میری تیغ جوہر داد

ڈاکٹر عبدالحمید خواجہ اوکاساوالے، قاضی عبدالغفار صاحب، سر شفاعت احمد خاں، ظفر علی خاں وغیرہ کا شمار گویا اسی ہریجن طبقہ میں ہے۔ لیکن وہ بساط بزم ہو تو اور میدان رزم ہو تو دونوں صورتوں میں عجب نہیں جو مصنف کو صدا شاعرانہ بانک پن کے ساتھ زبان سے یہی آ رہی ہو۔

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغز گوئے خوش گفتار

مصنف ندوی بھی ہیں اور جامعی بھی، مذاق کی بلندی و شستگی ندوہ کا حصہ ہے اور انداز بیان کی متانت اور شرافت جامعہ کا ورثہ ہے۔ نسبتاً خیر آباد کے معروف انشاء پرداز ریاض خیر آبادی کے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ زبان کی صحت اور پختگی نہ سہی عبارت کی سلاست، روانی و شیرینی خود پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ گل تر اسی چمن سر سبز و شاداب کا ہے!

ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے!

صدق نمبر 36 جلد 15 مورخہ 27/جنوری 1950

(76) یادرفتگاں

از مولانا سید سلیمان ندویؒ،

تقریباً سوا پان سو صفحہ، مجلد، قیمت چھ روپیہ، مکتبہ الشرق، آرام باغ، کراچی، ا۔

سید القلم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنے دوسرے کمالات وفضائل سے قطع نظر وقت کے بہت بڑے مرثیہ نویس بھی تھے۔ ان کے مرثیے، نظم میں اور مبالغہ آمیز نہیں۔ سادہ نثر میں ہوا کرتے تھے۔ ان کے معاصرین میں جو ذرا بھی ممتاز تھے ہر سال ان میں سے دو ایک وفات پاتے ہی رہتے تھے اور اب ان کا یہ فرض تھا کہ اس گزرنے والے کا ماتم کریں۔ خوب کریں، اور بڑی بات یہ کہ دل سے کریں۔ دوسروں کا اس سے متاثر ہونا بالکل قدرتی تھا۔ دیکھتے دیکھتے ان ماتمی مضامین کی تعداد سوڈیڑھ سو تک پہنچ گئی اور خوش قسمت تھا وہ معاصر جس نے سید القلم کے سامنے وفات پائی۔

سید القلم کے بھتیجے اور داماد سید ابو عاصم ایڈوکیٹ کراچی نے خوب کیا جو ان متفرق ماتم پاروں کو اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اور ادب، سوانح نگاری: تاریخ تینوں پر بہ یک وقت ایک احسان کر دیا۔ سید القلم کو خود بھی ان شذرات کی اہمیت کا احساس تھا۔ وصل بلگرامی کے تعزیت نامہ میں لکھ گئے:

"کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں"۔ ص:268

عنوانات کی تعداد 135 ہے۔ اور مرحومین کا تنوع بجائے خود جاذب نظر ہے۔ عالم فاضل، درویش ومشائخ، قومی لیڈر، شاعر، تاجر، حکام والا مقام، ادیب وافسانہ پرداز، مورخ وسوانح نگار، حکیم اور ڈاکٹر، وکیل اور بیرسٹر سب ہی اس بزم کو آراستہ کیے ہوئے ہیں۔ اور پھر فہرست مسلمانوں تک محدود نہیں ہندو اور مسیحی سب ہی اپنی اپنی

مجموعہ میں سب سے پہلا مضمون مولانا شبلی پر ہے۔ مورخہ نومبر 1912 اور سب سے آخری مضمون مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ پر ہے۔ مورخہ دسمبر 1952۔ اس لیے ضمناً ان اوراق سے خود سید القلم کی انشاء و اسلوب نگارش پر بھی خوب روشنی پڑ جاتی ہے۔ مرحومین کے کچھ نام آپ سنیں گے؟ ...... مولانا شبلیؒ، حضرت تھانویؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر علی امام بہادر یار جنگ، مظہر الحق، شرر لکھنوی، مہاراجہ سر کشن پرشاد، پریم چند۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ یقین ہے کہ اتنے ہی ناموں سے ہو گیا ہو۔

مجموعہ سید القلم کی شرافت بیان کا آئینہ ہے۔ مسلک و عقیدہ میں جو لوگ مخالف تھے ان کا بھی ذکر کس لطافت و شایستگی سے کیا ہے۔ جگ بیتی کے ساتھ ساتھ کتاب ایک خاص بڑی حد تک مصنف کی آپ بیتی کا بھی کام دیتی گئی ہے۔

سید ابو عاصم سلمہ کچھ اور نہ کرتے محض اس مجموعہ کو شائع کر دیتے جب بھی ان کا احسان اردو ادب پر کم نہ تھا۔ چہ جائے کہ اس پر انھوں نے اضافہ ایک دلچسپ و شگفتہ مقدمہ سے کر دیا ہے۔ مقدمہ نویس نے ایک جگہ خواہش یہ ظاہر کی ہے کہ کاش یہ مقدمہ مدیر صدق یا فلاں بزرگ کے قلم سے ہوتا۔ ان دوسرے بزرگ کے قلم سے ہوتا۔ جب تو خیر، ورنہ جہاں تک مدیر صدق کا تعلق ہے۔ مقدمہ نویس نے تو اس کی جانشینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ خصوصاً مقدمہ کا آخری پیراگراف تو فقروں کی ترکیب اور الفاظ کی نشست کی حد تک بھی 'ماجدی' ہے۔

کتاب اردو کے ہر صحیح ذوق رکھنے والے کے لیے قابل دید ہے۔

صدق جدید، نمبر 29، جلد 5، 17 جون 1955

صنف ادب (خطوط)

(77) خطوط محمد علیؒ

مرتبہ مولوی محمد سرور صاحب، بی اے آنرز (جامعہ)

ضخامت تقریباً 352 صفحات۔ مجلد۔ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی (دہلی، لکھنؤ، لاہور، بمبئی)۔

فرزندانِ جامعہ میں آخر ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے بانیِ جامعہ کی سیرت پر کچھ لکھنے لکھانے، سامان فراہم کرنے کے لیے وقت کا خیال کیا۔ سرور صاحب اس سے قبل مضامین محمد علی کے عنوان سے دو جلدیں شایع کر چکے ہیں، اور اب یہ خطوط محمد علی کی پہلی جلد بھی انھیں نے مرتب فرمائی ہے اور اس سلیقہ مندی، خوش ذوقی جوش و اخلاص کے ساتھ۔ محمد علی کے خطوط آج بھی سیکڑوں کی نہیں ہزاروں کی تعداد میں ملک میں موجود و محفوظ ہوں گے، لیکن لوگوں سے انھیں حاصل کرنا گویا پہاڑ پر جوئے شیر لانا ہے۔ آفریں ہے مرتب کی ہمت و تندہی پر۔

یہ مجموعہ کل 59 خطوط کا ہے لیکن بعض خطوط بڑے لانبے چوڑے ہیں، اور بعض تو گویا پورا رسالہ ہیں۔ محمد علی مرحوم خط کم لکھتے لیکن جب لکھتے تو دل کھول کر رکھ دیتے۔ خطوط میں غصہ بھی ہوتا، اور شوخی بھی، ظرافت بھی ہوتی اور کبھی مکتوب الیہ پر اچھی خاصی ڈانٹ پڑ جاتی۔ صداقت ہر صورت اور ہر حال میں موجود رہتی۔ ہر خط ان کی وقتی کیفیتِ قلب کا پورا آئینہ ہوتا۔ اس مجموعے میں خطوط کل 10 صاحبوں کے نام ہیں اور سب سے بڑی تعداد اس شخص کے نام جواب مدیر صدق ہے۔ ترتیب مکتوب الیہ کے اسمائے گرامی کے مطابق۔ ایک خط مولانا کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے نام ہے۔ ایک گاندھی جی کے نام، تین نواب محسن الملک کے نام۔ اٹھائیس ان

سطور کے راقم کے نام۔ باقی سید محفوظ علی بی اے بدایونی، قاضی عبدالغفار مرادآبادی (حال ایڈیٹر پیام) اور نواب صاحب جاورہ کے نام-------ترتیب یہ صحیح نہیں بجائے اشخاص کے سنہ وار ہونی چاہیے تھی۔ اس شخص وار سے خواہ مخواہ خلط ہوگیا ہے۔اور محمد علی کی شخصیت کے نشو ونما پر، روشنی بہت کم پڑتی ہے۔

ہر خط میں لازمی طور پر کچھ چیزیں تشریح طلب ہوتی ہیں، کنائے ہوتے ہیں، تلمیحیں ہوتی ہیں، جنھیں صرف مکتوب الیہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ دوسروں کے لیے صرف معمے اور پہیلیاں۔ضرورت تھی کہ ایسے موقع پر حاشیے دے دیئے جاتے۔حاشیے اب بھی موجود ہیں لیکن ضرورت سے بہت کم کہیں کہیں طباعت میں سنہ کی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ مثلاً محسن الملک کے تیسرے خط میں تاریخ 26/ جولائی 1909 پڑی ہے، حالانکہ ان کا انتقال 1907 میں ہو چکا تھا۔اسی طرح اور بھی جا بجا غلطیاں ہیں۔

خطوط کا لطف تو اصل کتاب ہی کے مطالعے سے آسکتا ہے، نمونے کے طور پر مختصر اقتباسات دینا لطف کو غارت کرتا ہے، اور پھر اقتباسات بھی مفصل ہوں، مع مفصل حواشی کے۔جن حضرات کو مسلمانانِ ہند کے اس سب سے زیادہ محبوب رہنما کی شخصیت اور زندگی سے کچھ بھی دلچسپی ہو(خواہ وہ دلچسپی مخالفانہ حیثیت سے ہی) یا جو صاحب مسلمانوں کو پچیس سال کی سیاسیات سے واقف کرانا چاہتے ہیں ان سب کے لیے کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اس کے اندر سب سے پہلا خط 1906 کا لکھا ہے، اور سب سے آخری ستمبر (بلکہ شاید اکتوبر) 1930 کا۔اور اسلامی سیاست کا شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس پر کچھ نہ کچھ روشنی اس سے نہ پڑتی ہو۔آخر عمر میں پیہم ذاتی صدمات کے علاوہ اپنی قوم اور اکابر قوم کے ہاتھوں جیسے جیسے دکھ محمد علی کو اٹھانے پڑے تھے، ان کی بھی ایک جھلک ان صفحات میں خود محمد علی کے قلم سے نظر آجائے گی۔

صدق نمبر 46 جلد 6، 14/ اپریل 1941

(78). غبارِ خاطر

از مولانا ابوالکلام آزاد

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

الہلال مرحوم کی زبان اور تذکرہ کے اسلوب بیان کے دیکھنے کو آنکھیں ایک عرصۂ دراز سے ترس رہی تھیں اور اب بظاہر کوئی صورت اس تمنا کے پورے ہونے کی نہ تھی۔ مصنف ماشاءاللہ زندہ وسلامت لیکن اب دوسروں کی نذر ہو چکے تھے اور گویا اپنی زبان تک بھول چکے تھے۔ اکبر نے تو یہاں تک کہا تھا۔

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات ان کی

لیکن یہاں معاملہ ان حدود سے بھی گزر چکا تھا۔ یہاں بات تو "ان" کی تھی ہی زبان بھی اپنی نہیں رہی تھی انھیں کی ہوگئی تھی۔ لیکن جو حکیم مطلق بہتے دریا کو پھیر لانے پر قادر ہے اس کی مشیت وحکمت کا تقاضا ہوا کہ مولانا ایک بار پھر قیدِ فرنگ میں مبتلا ہوں اور اب کی جب باہر نکلیں تو اپنی رفیقِ حیات بی بی زلیخا کی مفارقت دائمی کے غم میں مصر ادب کے یوسف بن کر نکلیں-------- غبار خاطر مولانا کے ان 20-22 مفصل خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے احمد نگر قلعہ میں محبوس ہو کر اگست 1942 اور جون 1945 کے درمیان اپنے حبیب قدیم مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ علی گڑھ کے نام عالم خیال میں تحریر فرمائے ہیں-------- عالم خیال اس معنی میں کہ ان خطوط کو کبھی مکتوب الیہ کے نام روانہ کرنے کی نوبت نہ آئی! کتاب کو مجموعۂ خطوط کہنا بھی بالکل صحیح بیانی نہیں۔ خطوط یہ صرف ظاہر وقالب کے لحاظ سے ہیں ورنہ معنی و حقیقت کے اعتبار سے یہ یکسر ادبی اور علمی مقالات ہیں۔

ابوالکلام اردو کے ایک خاص اسلوب بیان کے موجد مالک ہیں اور یہ مجموعہ ابوالکلامی انشاء کا بہترین نمونہ ہے۔ پاک ستھرا مذاق جسے ابتذال یا بازاریت کی ہوا

بھی نہیں لگی۔ ہموار و یکرنگ بلند سطح جس میں پستیوں کا گزر نہیں۔ شرافت و متانت جو ادبی سفلہ پن کے نام سے بھی آشنا نہیں مولانا کے مقام ادب کے خصوصیات میں سے ہیں۔ اس چھوٹے سے مجموعے میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ ساتھ ہی شوخی و رنگینی کسی ایک صفحہ میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی ------- ذکر یہاں صدر کانگریس کی سیاسیات یا صاحب ترجمان القرآن کے عقائد کا نہیں صرف ادیب، انشاء پرداز و صاحب طرز ابوالکلام کے کمالات و کرامات کا ہے اور ان حدود کے اندر حق یہ ہے کہ ابوالکلام اپنی نظیر آپ ہیں۔

ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شروع میں ایک خاصا مفصل مقدمہ مولانا کے سکریٹری محمد اجمل خاں کے نام سے ہے اور اگر اس کے سارے فقرے اور ساری عبارتیں ان کے قلم سے بھی مان لی جائیں تو پھر ایک نئے عقیدہ ''اتحاد'' ''حلول'' کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔

تاریخ فلسفہ عقیدہ، لطیف کلام ادب اعلیٰ سب کچھ ان صفحات کے اندر مل جائے گا لیکن یہ سب دماغ کی کاوشیں اور تراشیں ہونگی دل کے حصے کی جگہ بھی دماغ ہی نے لے لی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں محمد علی جوہرؔ اور ابوالکلام آزاد دونوں معاصر ایک دوسرے سے بالکل متضاد ایک ایک سرے پر نظر آتے ہیں۔ کتاب بھر میں لے دے کے ایک مکتوب ایسا ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے درد و گداز کا مرقع ہو سکتا ہے اور یہ مولانا نے اپنی رفیق حیات کی خدمات پر لکھا ہے لیکن یہاں بھی مولانا زیادہ سے زیادہ کترا کے نکل گئے ہیں صرف اس کے آخری صفحہ پر البتہ ذرا ملول و غمگین نظر آتے ہیں۔

صدق نمبر 19 جلد 12 مورخہ 3/ جولائی 1946

(79) خطوط غالب (جلد اول)

مرتبہ مولوی مہیش پرشاد صاحب،

ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد

غالب کے خطوط میں جو سادگی بیساختگی و دلآویزی ہے محتاج بیان نہیں۔ مختلف مجموعے اور ان کے متعدد ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں لیکن تقریباً سب کے سب غلط اور اہم حیثیتوں سے ناقص، شکر ہے کہ اب ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد کے حسن اہتمام اور مولوی مہیش پرشاد صاحب، استاد فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کی کاوش سے پہلی بار ایک مکمل و صحیح مجموعہ اردوئے مکتوبات غالب کا شائع ہونے میں آیا ہے۔ لفظ صحیح اضافی اعتبار سے کہا گیا ورنہ ایسی کون سی بشری کوشش ہے جس میں سہو ونسیان، خطا و غلطی کا گزر نہ ہو۔ اتنی سعی تصحیح اور ایک لمبے غلط نامہ کے باوجود کم از کم یہ غلطی تو ریویونگار کی سرسری اور اچٹتی ہوئی نظر میں آ ہی گئی۔ 193 پر مکتوب 183 کے شروع میں صراحت ہے دوشنبہ کے دن اور 15 فروری کی لیکن اس کے بعد ہی درج ہے کل دوشنبہ 16 فروری ہے۔ ظاہر ہے یہ سہ شنبہ ہونا چاہیے۔

خطوط تعداد میں 452 ہیں اور 19 مختلف اصحاب کے نام ہیں۔ فاضل مرتب نے نہ صرف تصحیح کا پورا اہتمام کیا ہے بلکہ ان پر اور بھی بہت کچھ محنت صرف کی ہے نمبر ڈالا ہے تاریخ ڈالی ہے وقس علیٰ ھذا۔ شروع میں ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس پر بھی جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (صدر شعبہ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی) کی محققانہ نظر ثانی نے پوری کردی ہے۔ 5-16 صفحہ کا مفصل مقدمہ ان کے قلم سے بھی ہے جو اخباروں کی رسمی زبانوں میں نہیں بلکہ واقعی اور صحیح معنوں میں بصیرت افروز ہے۔

خطوط غالب کے ادب وانشا سے متعلق کچھ کہنا تحصیل لا حاصل ہے۔ حیرت

ہوئی ہے کہ آج سے اسی سال قبل اس بلا کی روانی، شستگی، برجستگی ظالم کے قلم میں کہاں سے آگئی تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر لسانی وادبی معلومات کے اعتبار سے بھی مجموعہ قابل مطالعہ ہے۔ اردو کے مبتدی منتہی ہر درجہ ومرتبہ کے طلبہ کے لیے۔ دوسری جلد کی اشاعت کا انتظار شائقین ادب کو یقیناً رہے گا۔

ہفتہ وار صدق پرچہ نمبر 13 جلد 7 28/جولائی 1941

صنف ادب (داستان)

(80) آرائش محفل

از میر شیر علی افسوس

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

آرائش محفل کے لقب سے مشہور ایک تو وہ پرانی کتاب ہے جس کا اصل نام قصہ حاتم طائی ہے اور جس کے مصنف محمد حیدر بخش حیدری ہیں۔ پیش نظر کتاب گو اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے مصنف میر شیر علی افسوس دہلوی (متوفی 1809) ہیں جو بعد کو لکھنوی ہو گئے تھے اور آخر کے نو سال کلکتہ میں گزار کے وہیں وفات پائی۔ اس کتاب کا اصل ماخذ تو سجان رائے کی فارسی خلاصۃ التواریخ ہے لیکن مولف نے اس میں اتنی ترمیم اور کاٹ چھانٹ روا رکھی کہ کتاب ترجمہ سے زیادہ تالیف بن گئی ہے یہ خود ان کا بیان ہے۔

مسلک اثنا عشری رکھتے تھے۔ دیباچہ میں اپنے نام کے ساتھ جعفری لکھا ہے۔ خدا معلوم یہ اپنے نسب کی طرف اشارہ ہے یا اپنے مسلک کی جانب۔

کتاب کا موضوع عہد ہنود کی تاریخ ہند ہے لیکن تاریخ سے قبل ہندوستان کا جغرافیہ طبعی و سیاسی بھی اچھا خاصا آ گیا ہے۔ جغرافیہ طبعی خشک قسم کا نہیں بلکہ موسم اور فصل کی رنگینیاں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے بیان میں سما گئی ہیں۔ نباتات ہند کے ذکر میں خوب گلکاریاں کی گئی ہیں اور حیوانات کے باب میں بھی زندہ دلی کا ثبوت ہے۔ یہاں کی بعض سواریوں کا بھی بیان ہے جس کے اب صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں مثلاً مہا ڈول چڈول اور بعض اور صناعیوں کا بھی ذکر ہے مثلاً گھڑیال (پیمائش

وقت کا آلہ) کا بھی ذکر ہے۔ اصل تاریخ کو قدرتاً ملک کے مختلف حصوں مثلاً اڑیسہ ملتان اجین وغیرہ میں تقسیم کر کے بیان کیا ہے۔ بعض بعض سلطنتوں کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے مثلاً راجہ یدھشٹر اور جنگ مہابھارت کا ماجرا یا راجہ بکرماجیت کا واقعہ۔ ہندو دیومالا یعنی دیوی دیوتا راکشسوں کے قصے بھی اچھے خاصے اس ضمن میں آ گئے ہیں جو دلچسپ تو بہرحال ہیں اور ان کے بعض حصے سبق آموز بھی ہیں۔ کتاب تاریخی اعتبار سے کچھ زیادہ مستند کہی نہیں جا سکتی اس لیے کہ جن ماخذوں سے اس میں لیا ہے وہ خود ہی نقل در نقل کے متعدد واسطوں کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی اس کا مطالعہ طور پر ہندو تاریخ کے بعض اہم اجزاء سے باخبر کر دینے کے لیے کافی ہے۔

مصنف کی زبان اور طرزِ بیان کا کیا پوچھنا۔ دہلی کی ''ثقاہت'' اور لکھنؤ کے ''بانکپن'' دونوں کا مجموعہ کتاب تاریخ سے کچھ بڑھ کر ادب و انشاء کی ہو گئی ہے البتہ مطالعہ کے وقت یہ لحاظ ضرور رکھ لیا جائے کہ وہ اردو آج نہیں آج سے ڈیڑھ سو سال قبل کی ہے۔

صدق نمبر 25 جلد 15 مورخہ 11 رنومبر 1949

(81) الف لیلہ ولیلہ

مترجمہ ڈاکٹر منصور احمد صاحب

انجمن ترقی اردو دہلی

الف لیلہ ایک مشہور کتاب ہے اردو میں اس کے ایک سے زائد ایڈیشن موجود تھے لیکن وہ غالباً انگریزی کے واسطے سے ترجمہ ہوکر اردو میں آئے تھے اور یہ پیشِ نظر ایڈیشن غالباً براہ راست عربی سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔ دیباچہ میں اس کی تصریح ضروری تھی مگر یہاں سرے سے دیباچہ ہی غائب!

یہ صرف حصہ اول ہے اور اس میں 50 حکایتیں ہیں، سرورق پر اس کا اظہار ضروری تھا، فہرست مضامین بھی ایک ضروری چیز تھی، ترجمہ جا بجا دیکھنے سے اچھا معلوم ہوا پھر بھی کسی اہل زبان کی نظر ثانی کا محتاج رہ گیا ہے۔

3 پر سطر 3 ''اس کے بچھونے میں اس کی بیوی ایک غلام حبشی کو لیے ہوئے'' یہاں ''میں'' کے بجائے پر کا موقع تھا۔

9 سطر 4 میں ''ہم صحبتی جس معنی میں آیا ہے اس کے لیے صحیح لفظ صرف ''صحبت'' تھا۔ ہم صحبتی مصاحبت کے معنی میں آتا ہے۔

20 سطر 3 میں ''اے سروقد والے'' کی تراکیب بھی نامانوس نظر آتی ہے۔

بعض عام فہم الفاظ کے ترجمہ کے موقعہ پر مترجم نے بعینہ عربی لفظ رہنے دیا ہے حالانکہ اور مرادفات آسانی سے مل سکتے تھے اور وہی اردو خوانوں کی سمجھ میں آتے۔ مثلاً 217 میں چوہے کی آواز کے لیے ''زیق زیق'' کتے کی آواز کے لیے عہہ عہہ اور گدھے کی آواز کے لیے بان بان عربی سے منتقل کر کے رکھ دیئے ہیں۔ حالانکہ ان سب آوازوں کے لیے اردو میں بالکل الگ الفاظ موجود ہیں اور خوب چلے ہوئے۔ کتاب قصہ کہانی سے ذوق رکھنے والوں کے لیے بہر حال دلچسپ ثابت ہوگی۔

ہفتہ وار صدق پرچہ نمبر 13 جلد نمبر 7 28 جولائی 1941

(82) خلاصۂ فسانۂ عجائب یا نرالی کہانی

(83) خلاصۂ باغ و بہار یا درویش باغ

از الیاس احمد مجیبی صاحب

اردو گھر 80/4 مارٹن روڈ کراچی 5، (پاکستان)

فسانۂ عجائب (مرزا رجب علی بیگ سرور اکبر آبادی ثم لکھنوی) کا سال تصنیف 1824 ہے۔ اور باغ و بہار (میر امن دہلوی) کا 1801۔ مگر اللہ نے دونوں کی زبان میں کچھ عجب موہنی رکھ دی ہے کہ سوا سو ڈیڑھ سو سال گزر جانے پر بھی اب تک دونوں گویا زندہ ہیں اور جو بھی ادب کا رسیا ہے، اس کے لیے میر امن کی سادگی و سلاست اور سرور کی رنگینی و لطافت آج تک جاذب نظر چلی آ رہی ہے۔ لیکن قصوں کے درمیان میں قدرۃً ایسی باتیں جا بجا آ گئی تھیں، جو لڑکوں لڑکیوں کے مطالعہ کے قابل نہ تھیں، ہمارے مشرقی معیار اخلاق سے۔ ازل سے یہ فخر مجیبی صاحب کے حصہ میں آ چکا تھا کہ وہ ان قیمتی خزانوں کا از سر نو جائزہ لیں، اور جو درخت پرانے ہو چکے ہیں ان میں کچھ ایسا کاٹ چھانٹ کر دیں کہ چمن نئے سرے سے آراستہ ہو جائے اور گلستاں پھر سے سرسبز و شاداب نظر آنے لگے۔

مجیبی صاحب اس کام میں اکیلے نہیں۔ ادبیات کے معرکے خوب خوب سر کیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ایسے استادوں کے کلام و بیان میں ہاتھ لگانا کچھ آسان نہ تھا۔ امتحان اب کی سخت تھا۔ لیکن مجیبی صاحب یہی نہیں کہ کامیاب نکلے، بلکہ بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب نکلے۔ ان کا درجۂ اول تو کہیں گیا ہی نہیں، اور نمبر کہنا چاہیے کہ سو فی صد ہاتھ رہے۔ دونوں پر ان کے ہلکے پھلکے دیباچے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند

نہیں۔ مخمل ہی کا پیوند ہیں۔

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب دونوں کی عبارتیں تبصرہ خوانوں میں سے ہوں گی کتنوں کے حافظہ میں؟ بہتر ہوگا کہ دونوں کے نمونوں پر بھی ایک اچٹتی ہی نظر ڈالتے چلیں۔ باغ و بہار جس کا دوسرا نام قصۂ چار درویش بھی ہے۔ اس میں تیسرے درویش کی داستان ہے (وزیرزادی مرد سوداگر کے بھیس میں تھی):

"سوداگر تو چاہتا ہی تھا۔ نزدیک آیا۔ خواجہ کی نظر پڑی۔ ایک برچھی عشق کی سینہ میں گری خواجہ نے برابر بیٹھایا۔ پوچھا کہاں سے آنا ہوا کہاں کا ارادہ ہے۔ سوداگر بچہ بولا، کمترین کا وطن روم اور قدیم سے استنبول زادبوم ہے۔ قبلہ گاہ سوداگر ہیں۔ اب طاقت سیر و سفر کی نہیں، اس واسطہ مجھے رخصت کیا ہے، کہ تجارت سیکھوں آج تلک قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا۔ یہ پہلا ہی سفر درپیش ہوا۔ دریا کی راہ ہواؤنہ پڑا۔ لیکن آپ کے اخلاق کا جو شور ہے۔ محض ملاقات کی آرزو میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے تمنا دل کی برآئی۔ اب یہاں سے کوچ کروں گا یہ سنتے ہی خواجہ کے ہوش جاتے رہے۔ بولا اے فرزند ایسی بات نہ سناؤ۔ کوئی دن غریب خانہ میں کرم فرماؤ۔ ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں بہت نفع ملے گا۔ تم خوش ہوگے۔ سفر کے ہرج مرج سے بچو گے۔ سوداگر بچہ نے اوپری دل سے عذر کیا۔ خواجہ نے اپنے گماشتے کو فرمایا کارواں سرا سے ان کا اسباب منگا کر رکھواؤ۔"

(ص: 63-64)

اب لکھنؤ کے تعارف کی چند سطریں فسانۂ عجائب کے آغاز میں ملاحظہ ہوں:

"جائے مردم خیز۔ باشندے یہاں کے ذکی عقل و فہم کے تیز انصاف سے جو اس شہر کو دیکھیے جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے۔ سبحان اللہ عجب شہر گلزار ہے۔ ہر شخص باوضع قطع دار ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ

شیر مال، کباب، نان ونہاری، جہاں کی نعمت اس آب داری کی جس
کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے، سرخ پیاز
سے بگھار، سریلی جھنکار، شیر مال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھر بھری۔
ایک بار کھائے، نعمت جنان کا مزا پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ
جائے۔ کباب کی وہ آب و تاب کہ مرغ و ماہی کا دل محرومی سے
کباب ادرک کا لچھامیاں خیر اللہ کی دوکان کا باریک سے باریک
کترا۔ ہاضم نایاب۔ حسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن ہونٹ سے
کھائے، دانت لگانے کی نوبت نہ آئے۔'' (ص:10)

صدق جدید، نمبر 28، جلد 2، 13 جون 1952

(84) نوطرزِ مُرصع

مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سندیلوی۔ایم اے، پی ایچ ڈی،

234 صفحہ۔مجلد مع گردپوش، قیمت کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی، یوپی، الہ آباد۔

میر محمد حسین عطا خان تحسین کی اس کتاب کا نام ہی نام اب تک سننے میں آرہا تھا۔گوایک زمانہ میں چھپ بھی چکی ہے۔ بلکہ ایک بار نہیں دودو بار لیکن اس طبع و اشاعت کو بھی اب سو سال سے اوپر ہو چکا اور اب اس کا شمار نایاب ہی کتابوں میں تھا۔نورالحسن ہاشمی صاحب نے جو لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں اور کئی ادبی کتابوں کے مصنف اس کے ایک نہیں، چھ چھ قلمی نسخوں کا پتا فلاں اور فلاں جگہ سے لگایا اور دو مطبوعہ نسخوں سے ان کا مقابلہ بڑی دیدہ ریزی سے کر کے یہ ایڈیشن شائع کردیا۔مسودہ کی ترتیب سے وہ تو 52 ہی میں فارغ ہو چکے تھے۔ چھپائی کی نوبت 6، 7 سال کے بعد اب خدا خدا کر کے آئی ہے۔

''ایڈٹ'' کرنے کے آج کل جو لوازم سمجھے گئے ہیں مرتب نے اس معیار پر کتاب کو مرتب و مہذب کر کے پیش کیا ہے۔طویل دیباچہ 15، 16 صفحہ کا،طویل تر مقدمہ 30 صفحوں کا نسخوں کے اختلافات وغیرہ پر بہ کثرت فٹ نوٹ مصنف کے سنہ پیدائش و وفات پر بحث ،تصنیف کی تاریخ سے متعلق موشگافی ۔اپنے پیش رووں سے ایک پر تنقید و اعتراض دوسرے کی داد اور اس سے اتفاق ایک ایک جزئیہ سے متعلق ہندی کی چندی۔ یہ سب ہی کچھ موجود ہے، کہ یہی اس وقت کی ''ریسرچ'' (تحقیق) کے جوہر ہیں۔

کتاب کی تصنیف اغلباً 1768 و 1769 کی ہے ۔ گویا دو سو سال پرانی ہونے میں اب دس ہی سال رہ گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ اردو اس مدت میں کہاں سے

کہاں جا پہنچی اور کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ اس لیے قدرۃً کتاب کی عبارتوں پر جا بجا گمان یہ گزرنے لگتا ہے کہ کہیں اردو کے بجائے فارسی تو نہیں۔ ''آغاز قصہ'' کی پہلی چار سطریں ملاحظہ ہوں:

''بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا۔ سلیمان قدر فریدون فر، جہاں بان، دین پرور، رعیت نواز، عدالت گستر برآرندۂ حاجات بستہ کارارن بخشندۂ مرادات امیدواران، فرخندہ سیرنام کہ اشعہ شوارق فضل ربانی کا اور شعشہ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اور پر لوح پیشانی اس کے لمعان و نورافشاں رہتا''۔

ترکیبیں تمام تر فارسی کی۔ جا بجا حروف ربط بھی فارسی کے (در، بر، درمیان، وغیرہ) اسلوب بیان تصنع و مبالغہ سے لبریز، تشبیہ و استعارہ کی افراط، لفظی صنعتوں کی بھرمار، ان سب تکلفات کے باوجود خوبی اور خصوصیت یہ کہ کم سے کم شمالی ہند کی حد تک، یہ اردو کی سب سے پہلی مکمل کتاب ہے۔ چار درویشوں کی خودگزشت کہانیوں کا مجموعہ۔ میر امن دہلوی کی باغ و بہار۔ قصۂ چہار درویش اگر نقش ثانی ہے تو یہ اس کا ہی نقش اوّل۔

کتاب کس درجہ کی ہے۔ موضوع کتنا وزنی ہے۔ اس کی ترتیب وتہذیب پر عمر عزیز کا اتنا حصہ گزار دینا عقلی ونقلی کیا وجہ جواز رکھتا ہے۔ یہ سب سوالات الگ ہیں باقی اس وقت ''تحقیق'' کا جو دستور یا فیشن چل گیا ہے۔ کتاب اس معیار سے نیچی نہیں، اونچی ہے۔ گھٹیا نہیں، بڑھیا ہے اور اس پیمانے سے جو ناپیے تو ہر طرح قابل قدر ہی نکلے گی۔

صدق جدید، نمبر 35، جلد 9، 21 جولائی 1959

صنف ادب (ڈرامہ)

(85) کہرے کا چاند

از ڈاکٹر محمد حسن،

69 صفحہ، قیمت تین روپے۔ شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی دہلی۔

غالب پر ڈرامہ وہ بھی غالب صدی اور غالب سال میں۔ غالب کی بہترین ادبی یادگار ہو سکتی ہے۔ اور یہ ڈرامہ ایک بڑی حد تک اس لقب کا مستحق ہے۔ مصنف مولد کے لحاظ سے لکھنوی ہیں اور مسکن کے اعتبار سے دہلوی۔ دونوں چشموں سے اپنے کو سیراب کیے ہوئے۔ کتاب کا تقریباً نصف حصہ اول خوب ہے۔ زبان سلیس، بے تکلف، آمد کلام کا نمونہ۔ نصف آخر میں اگر چہ وہ بات نہیں رہی ہے آمد کے ساتھ آورد سخن کی بے ساختگی کے ساتھ تکلف کی آمیزش ہو گئی ہے۔ پھر بھی لطف بے لطفی میں نہیں بدلنے پایا ہے اور یادگار کی حیثیت سے کتاب کی بات آخر تک بنی رہی ہے۔ غالبیات پر رطب دیا بس کا انبار پر انبار لگ گیا ہے۔ اس میں اس ڈرامے کا مرتبہ یقیناً ادبی حیثیت سے بلند ہے۔

صدق جدید نمبر 13 جلد 20 مورخہ 27 رفروری 1970

صنف ادب (روز نامچہ)

(86) ایک نادر روز نامچہ (یادگار مظہری)

مرتبہ ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی، ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔
207 صفحہ، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔
ادارۂ فروغ اردو، 37 امین آباد پارک لکھنؤ۔

مضافات لکھنؤ میں سندیلہ ضلع ہردوئی ایک مردم خیز اور بڑا اجلا و ستھرا قصبہ ہے۔ یہاں کے ہندو تک بڑے نستعلیق اور اسلامی تمدن کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ یہیں کے ایک خوش باش اور چھوٹے سے رئیس سید مظہر علی (1829 تا 1911) نامے تھے۔ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ اور بڑے منتظم قسم کے زمیندار۔ زمانہ کے نشیب و فراز اور اپنے ہر قسم کے تجربات کو نظم و احتیاط کے ساتھ قلم بند کرنے والے۔ اپنی زندگی ہی میں اپنی خودنوشت سوانح عمری کی دو جلدوں میں سے ایک جلد شائع کر گئے تھے اور اب یہ ان کے بڑے ضخیم قلمی روز نامچہ کا مختصر سا انتخاب ہے۔ جسے ان کے سعید و رشید پوتے نے ترتیب و تہذیب پر پورا وقت صرف کرنے کے بعد شائع کیا ہے۔ روز نامچہ کے ساتھ وصف ''نادر'' کا اضافہ بے معنی یا مبالغہ آمیز نہیں۔ روز نامچہ نویس اسے 40 سال کی مدت تک بلا ایک دن کے ناغہ کے پابندی سے لکھتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی نہ چھوڑا اور 24/دسمبر 1911 کی جس سہ پہر کو 2 بجے انتقال کیا ہے۔ عین اس کی صبح تک فکِ روح سے کل چند گھنٹہ قبل تک اسے لکھتے رہے ہیں۔ اور مجلدات روز نامچہ کی کل ضخامت فل اسکیپ سائز پر کچھ کم، ہزار صفحہ تک پہنچی ہوئی ہے! ''ندرت'' اگر یہاں بھی نہیں تو اور کہاں پائی جائے گی!

روز نامچہ محض ذاتی حالات کیا معنی ، مقامی حالات پر ہی محدود نہیں ان حالات کے علاوہ اس میں عام ملکی حالات بھی ہیں اور غیر ملکی بھی ۔ بہ قول دیباچہ نویس۔

''اس روز نامچہ میں حالات عام اس سے کوئی ان کا تعلق کسی شہر وقصبہ ودیہہ وملک سے ہو۔ بالمرہ درج ہوتے رہے ۔سندیلہ کے حالات تو انھیں خیر میونسپلٹی کے سکریٹری ہونے کی وجہ سے برابر معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان اور سمندر پار کی خبریں انھیں اخبار اور پانیر وغیرہ سے معلوم ہوتی تھیں۔ جنھیں وہ کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو پڑھا کرتے تھے۔''

مرتب نے اس ضخیم دفتر سے صرف ایک مختصر سا انتخاب کر کے اسے شائع کیا ہے اور اس انتخاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے:

باب(1)واقعات ہند

باب(2)ریاستیں اور تعلقے

باب(3)واقعات بیرون ہند

باب(4)مقامی حالات

باب(5)ذاتی حالات

یہ تقسیم اچھی تھی لیکن اس کی پوری پابندی تھی ذرا مشکل۔ چنانچہ افسوس ہے کہ ترتیب میں خلط مبحث اچھا خاصہ ملتا ہے۔ مثلاً متعدد اندراجات جو باب (4) کے قابل تھے۔ باب (1) کے تحت میں آ گئے ہیں۔ وقس علی ہذا۔ لیکن کتاب اس کے باوجود بھی دل چسپ ہی ہے اور عام ناظرین کی نظر ان باریکیوں تک پہنچے گی بھی نہیں۔

باب اول میں علاوہ متفرق معلومات کے مختلف سنوں میں غلہ کا نرخ اور مشاہیر ہند کی وفات کی تاریخیں خوب معلوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سرسید، محسن الملک، واجد علی شاہ، نواب علی نقی خاں، اسیر لکھنوی، امیر مینائی، مولوی عبدالحق منطقی خیر آبادی، مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی، مولوی غلام امام شہید، ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی

وفات کی تاریخیں۔

باب دوم میں بھی علاوہ متفرق اور قیمتی معلومات کے ریاستوں سے متعلق کثرت سے اشخاص کی وفات کی تاریخیں درج ملتی ہیں۔ مثلاً سرسالار جنگ ونواب کلب علی خاں والی رام پور، نواب مشتاق علی خاں والی رام پور، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، نواب شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال، راجہ سرامیر حسن خاں والی محمود آباد، راجہ جنگ بہادر والی نانپارہ، ہر ہائینس میر محبوب علی خاں نظام دکن وغیرہم۔

باب سوم بیرون ہند سے متعلق بھی کچھ کم دلچسپ و پر معلومات نہیں۔ جنگ روم و روس، تعلقات افغانستان و روس، محاربۂ ہندو کابل، سیاحت ہند امیر کابل، جنگ روس و جاپان، وفات ملکہ وکٹوریہ، جنگ ٹرانسوال، جنگ ٹرکی و یونان، قتل شاہ ایران، معزولی سلطان ٹرکی اور خدا معلوم کتنے ہی واقعات بیرون ہند سے متعلق مختصر لیکن کارآمد معلومات ان صفحات میں آگئے ہیں اور وفات مشاہیر سیاست و والیان ملک کی تاریخوں کا جو ذخیرہ فراہم ملتا ہے وہ اس کے علاوہ۔

باب (4) باب (5) کے عنوانوں سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام دلچسپی کے نہ ہوں گے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ دلچسپی اور افادہ دونوں کے لحاظ سے یہ باب بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان میں متعدد نسخہ بھی آزمائے ہوئے درج ملتے ہیں اور متعدد کارآمد تجربے۔ روز نامچہ نویس ہیں خالص دنیا دار۔ اور اپنی دنیا داری کا اظہار بھی انھوں نے کثرت سے کیا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ خیال آخرت سے بالکل بیگانہ ہی ہوں۔ جولائی 1891 کو ایک عنوان احتساب نفس کا ملتا ہے اور اس کے تحت میں عبارت ذیل درج ہے:

''انسان کا دنیا سے بہ نیک نامی گزر جانا اس زندگی سے بہتر ہے جو بہ بدنامی زندہ رہے۔ جب کسی شخص کی عمر قریب بہ عمر طبعی پہنچے تو اس کو اپنے خدائے لم یزل سے یہی دعا کرنا چاہیے کہ انجام بہ خیر ہو۔ اور کوئی بدنامی اپنے ساتھ قبر میں نہ لے جائے میں اس وقت جو اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے فضل و کرم سے

بہت قسم کی نعمت ہائے دنیوی مجھے عطا فرمائی ہیں۔ اور کوئی تمنا ایسی باقی نہیں رہی کہ جس کا میں آرزومند ہوں اور یوں انسان جب تک زندہ ہے اس کی تمناؤں کا تکملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اب میری خواہش دلی یہ ہے کہ قبل پیش آنے کسی بدنامی یا حزن وملال یا رنج وغم فکر وتردد کے اگر سفر آخرت مجھے پیش آجائے تو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو مجھ کو بیش نہاد نہیں۔ موجود کل سامان آسائش دنیاوی اس عنایت سے حسب ذیل مجھے حاصل ہیں......'' (ص:157-154)

یہ اندراج اس وقت کا ہے جب ان کا سن کل 56 سال کا تھا یعنی وہ ادھیڑ عمر کے تھے۔ بعض اور اندراجات بھی اس سے ملتے جلتے ہوئے موجود ہیں اور اس کے بعد بھی وہ 20 سال بعد زندہ رہے......طبیعت کا میلان نقوش وعملیات، نجوم وحقیر وغیرہ کی جانب تھا کثرت سے معلومات اس قسم کے ملتے ہیں اور کہیں کہیں مجرب طبی نسخے بھی درج ہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی خاصی دلچسپ ہی نہیں خاصی کارآمد اور سبق آموز بھی ہے۔ اور مرتب نے اسے شائع کر کے نہ صرف اپنے جدامجد کی (خدا معلوم کس مصلحت سے مرتب اپنے اس رشتہ کا اظہار غیر ضروری سمجھتے رہے) ایک قابل قدر یادگار محفوظ کر دی اور اردو خوانوں کے ہاتھ میں ایک وسیع تجربہ والی اور متعدد جہات سے قابل مطالعہ کتاب دے دی ہے۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 6، 7 جنوری 1955

صنف ادب (سفرنامہ)

(87) ساحل اور سمندر:

از احتشام حسین صاحب ایم اے، 367،

صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت ساڑھے چار روپیہ،

سید وجاہت حسین، سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ، لکھنؤ۔

لکھنؤ یونی ورسٹی کے اردو لکچرر سید احتشام حسین صاحب اردو خوانوں کے حلقہ میں خاصہ معروف ہو چکے ہیں۔ خصوصاً ترقی پسندوں میں یہ ان کے دو ماہہ سفر امریکہ وانگلستان کی گویا ایک سرسری اور چلتی ہوئی سی ڈائری ہے، جن میں برائے نام ساز کر پیرس کا بھی آ گیا ہے۔ سفر 52 اور 53 میں ہوا تھا۔ اپنے شوق ارادہ سے از خود نہیں گئے تھے بلکہ امریکہ والوں کی پراصرار دعوت پر اور وہاں کے ایک تہذیبی ادارہ کی فیلو شپ پا کر وہاں لے جائے گئے تھے۔ بڑی الجھنوں اور بہت سی کروٹوں کے بعد بادل ناخواستہ گئے جیسے کوئی طالب علم مدرسہ کو مچل مچل کر لایا جاتا ہے اور لوٹ کر آئے تو نیم مسرور اور نیم افسردہ وملول، جیسے کوئی ہندوستانی نوجوان والدین کے اصرار سے اور ان کی تعمیل ارشاد میں عقد ازدواج قبول ہی کر لیتا ہے!

روداد سفر کے بیان کرنے میں کسی خاص اہتمام وتعب کو دخل نہیں دیا گیا ہے۔ ایک قلم برداشتہ یادداشت سی ہے۔ تاہم یہ سادگی اور بیساختہ پن بجائے خود ایک جاذبیت رکھتی ہے۔

آغاز سفر میں سفر کی تیاریوں کے مرحلے اور پاسپورٹ، ویزا وغیرہ کی دشواریاں جزوی تفصیل سے بیان کی ہیں کہ پڑھنے والا کچھ اکتانے سا لگتا ہے اور اگر

کہیں تبصرہ نگار کی طرح پست ہمت اور تھڑ دلا ہوا جب تو اتنی رکاوٹیں اور زحمتیں پڑھ کر باہر کے سفر کے ارادہ ہی سے کان پکڑ لیتا ہے۔

سفر نامہ کیسا ہی سرسری ہو۔ بہر حال معلومات کا خزانہ دار ہوتا ہی ہے۔ بہت سے موتی آپ کو ان صفحات کے اندر بھی بکھرے ہوئے ملیں گے۔ باہر کی دنیا الگ رہی۔ لکھنؤ سے دہلی اور پھر مدراس اور بمبئی کے سفر بھی کچھ کم سبق آموز نہیں اور اردو کی خدمت سے تو اپنی بساط بھر احتشام صاحب باہر جا کر بھی غافل نہیں رہے۔

سفر نامہ کے صفحہ صفحہ سے کچھ اور ہو یا نہ ہو۔ لیکن مسافر کی مشرقیت بہر حال نمایاں ہو رہی ہے اور جی یہ چاہتا ہے کہ کاش اسلامیت بھی کہیں تو نمایاں ہوتی! ۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے، بعض فقرے نادانستہ سہی، بڑے بلیغ ان کے قلم سے نکل گئے ہیں، چنانچہ نیویارک کے دوران قیام میں:

''کئی دن سے خیال تھا کہ پاکستان ہاؤس جا کر احمد شاہ بخاری صاحب (کبھی کے پطرس) سے ملوں گا۔ چنانچہ ۱۱ بجے وہاں پہنچ گیا۔ دلی اور کراچی کے درمیان صرف ایک سڑک کا فاصلہ حائل ہے'' (ص:119)

ماشاءاللہ۔

مسافر نے پردیس میں نہیں، ''صاحب'' کے دیس میں کیا دیکھا؟ کیا پایا؟ اس کا کھل کر جواب دینے سے تو شرمیلا مسافر خود کچھ گھبراتا سا ہے اور کنائی کاٹ جاتا ہے تاہم کچھ نہ کچھ جھلکیاں تو آپ زیر نقاب بھی دیکھ ہی سکتے ہیں۔ اس تمدن کا لب لباب چند لفظوں میں سن لیجیے۔:

''یورپ اور امریکہ دونوں جگہ تعلقات میں ایک قسم کی تاجرانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ جس مروت اور محبت، احساس وقار اور تصور اخلاق میں ہم چور ہیں وہاں شاذ ہے۔ خاندانی زندگی زیادہ تر محض میاں بیوی اور نابالغ بچوں تک محدود ہوتی ہے۔ بوڑھے ماں باپ تک اس محفل میں اجنبی ہوتے ہیں۔ دوسرے عزیزوں کا کیا ذکر، ماں باپ جب 80-85 سال کے ہوتے ہیں اور کسی کام کے نہیں رہتے تو اکثر انھیں

ضعیف خانوں اور اسپتالوں وغیرہ میں زندگی کی آخری سانسیں گزارنی پڑتی ہیں۔

میرے ایک ہندوستانی ملاقاتی نے بتایا کہ انھیں کیلیفورنیا کے ایک خاندان میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ بوڑھی خاتون نے جو میزبان تھیں، اپنے بیٹے کی تصویریں دکھائیں بیٹا کوریا کی جنگ میں شریک تھا۔ بوڑھی عورت نے کہا سال بھر ہوئے میرے بیٹے کی شادی ہوئی اور کچھ ہی دن بعد کوریا چلا گیا۔ ابھی بہو آئی تھی۔ میرے ساتھ دو ہفتہ تک رہی اور سنتے ہو! میں نے اس سے کچھ بھی نہیں لیا، حالاں کہ وہ کھانا میرے ہی ساتھ کھاتی تھی۔'' ص:355)

اس بیان کا ایک ضمیمہ رہا جاتا ہے۔ اسے بھی بے سنے نہ رہیے:

''مجھے امریکہ کی جنسی زندگی کے سمجھنے کا موقع زیادہ نہیں ملا۔ ویسے آپ جو کچھ فلموں میں دیکھتے، کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔ جنسی جرائم اور غلط جنسی رجحان سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات عام ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ خود امریکہ کے ماہرین نفسیات جنسی کجرویوں اور ان سے پیدا ہونے والے جرائم کی زیادتی سے بے حد خوف زدہ ہیں۔'' (ص:360)

احتشام صاحب دوسروں پر اخلاقی نکتہ چینی میں بڑے محتاط اور کچھ مرنجان مرنج سے واقع ہوئے ہیں۔ لیکن جو منظر ہر چوراہہ پر، ہر رہ گذر میں، چلنے والوں کو پکار کر دعوت نظارہ دے ہی رہے ہوں ان کی طرف سے آنکھیں آخر کہاں تک بند رکھتے۔

بس ایک اقتباس اور۔ اور اس کے بعد کتاب بند کر دیجیے۔ یہ خاص لندن کی زندگی سے متعلق ہے:

''یہ انسانی حسن، یہ جامہ زیب جسم، یہ گوشت اور پوست کے اندر تھرکتی ہوئی جوانی، یہ اختلاط اور پیار کے نظارے، یہ جرأت شکن بے اعتنائی، یہ رنگین ہونٹوں کے دلآویز خطوط، اور آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے!۔ یہ مفلسی کا شباب اور یہ بکتے ہوئے جسم، یہ نوجوانوں کے زرد چہرے اور پھیکے

تبسم، یہ بھیک مانگتی نگاہیں، بیمار بچے، یہ سرمایہ داری کے ماتھے کی شکن اور مزدور کے جسم کا پسینہ۔ یہ طاقت کا نشہ اور کمزور کی بے بسی، یہ رنگ ونسل کی خلیج اور قتل وغارت کی گرم بازاری کیا ہیں یہ سب کچھ اس لیے سوچتا ہوں کہ افسردہ ہو جاؤں۔'' (ص: 303-302)

ہاں کسی جگہ بائبل کا ترجمہ انجیل نظر سے گزرا۔ یہ نظر ثانی، اپیل کا محتاج ہے۔ یا تو اردو میں بھی بائیبل ہی رکھیے یا پھر ہولی بائیبل کی جگہ مستند مرادف کتاب مقدس۔

صدق جدید، نمبر 3، جلد 5، 7 دسمبر 1954

صنف ادب (سماجیات)

(88) اُس بازار میں

ازشورش کاشمیری،

248 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت چار روپیہ،

دفتر ہفت روزہ چٹان، میکلوڈ روڈ، لاہور (پاکستان)

کتاب کا شہرہ عرصہ سے تھا۔ کتاب نکلتے ہی حسب توقع خوب پھیلی، صدق میں تبصرہ کے لیے وصول اب ہوئی ہے۔ جب نوبت تیسرے ایڈیشن کی آ چکی۔ اور اس تبصرہ کے چھپتے چھپتے کئی مہینہ کی مدت لگ جانا ناگزیر ہے۔ کتاب بوڑھی اس پر بھی نہیں ہوئی ہے۔ جوانی باقی ہے۔ اور اس لیے ''نئی'' کتابوں کے ذیل میں رونما ہونے میں مضائقہ نہیں۔

کتاب ایک معروف وممتاز خطیب کے قلم سے ہے۔ اور خطیب بھی ایسا کہ جس کا ادب بھی خطابت اور جس کی صحافت بھی خطابت!...... اور اچھے خطیب کے لیے لازم نہیں کہ اچھا مصنف بھی ہو۔

تبصرہ نگار کی سب سے پہلی الجھن یہ ہے کہ کتاب ہے کس موضوع پر! آٹھ صفحہ کے ''چہرہ نما'' کے بعد بھی کتاب کا گھونگھٹ بدستور قائم! اور کچھ نہیں کھلتا کہ کتاب ہے کس متعین موضوع پر...... ''بیسوائی'' پر تو ظاہر ہے۔ لیکن آخر اس کے کس متعین پہلو پر، اس کے کس رخ پر، اور کس غرض اور مقصد کے ساتھ۔ اس کی تاریخ ہے؟ اس کی حمایت و وکالت ہے؟ اس کا احتساب اور اس پر تنقید ہے؟ اس مرض کی تشخیص اور اس کا علاج ہے؟ شروع کے صفحہ کے صفحہ تصویروں کی نذر، لیکن جہاں تک موضوع و

مقصد پر روشنی ڈالنے کا تعلق ہے یہ پورا البم بھی صورت تصویر خاموش و بے زبان!

ص:3 و ص:5 پر دو بڑے لمبے لمبے فقرے، بغیر کسی عنوان کے مصنف کی طرف سے درج ہیں۔ بڑے شاندار بڑے جاندار، حسن خطابت کے نمونے لیکن کتاب کی پیشانی ان کے بعد بھی زیر نقاب جوں کی توں!

کتاب میں دو وصف بڑے نظر پڑے:

(1) ایک یہ کہ بیسوائی اور بیسواؤں کے اتنے مفصل تذکرہ کے باوجود مصنف کا قلم فحش سے آلودہ نہیں ہوا۔ اور کتاب ختم کرنے پر اس کے چند فقرے بھی ایسے نہیں ملتے جن پر فحش نگاری کا اطلاق ہو سکے ...... یہ وصف کوئی معمولی وصف نہیں۔

(2) خود کتاب تو نہیں لیکن کتاب کے فقرے جا بجا ادیبانہ اور منشیانہ ہیں۔

کتاب کی مدح و توصیف میں دیانت کے ساتھ جو کچھ کہا جا سکتا تھا، کہ دیا گیا...... کاش اس سے کہیں زیادہ کہنا ممکن ہوتا!

کتاب کی ظاہری و معنوی کمزوریوں کو گناتے ہوئے خصوصاً مصنف کے حسن نیت کا خیال کر کے دل کو دکھ ہوتا ہے لیکن تبصرہ نگار کے بھی اخلاص کا عین تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ اسے محسوس ہوا۔ اسے مصنف سلمہ اللہ کے بھی علم میں لے آئے۔

(1) کتاب، اور پھر اس قسم کی کتاب کا۔ اس بیسویں صدی میں فہرست مضامین سے خالی ہونا۔ ایک نا قابل عفو کوتاہی ہے۔

(2) صحافتی مقالے لکھ دینا اور چیز ہے، تصنیف کی تو جان ہی حسن ترتیب۔ یا مختلف حصوں کے درمیان ربط منطقی و توافق نفسیاتی ہے...... کاش اس بنیادی نکتہ پر مصنف نے توجہ رکھی ہوتی!

(3) ذی روح کی تصویریں درج کرتے رہنا یوں بھی کوئی اسلامی خدمت نہیں، چہ جائے کہ پیشہ ور بیسواؤں کے فوٹو اور وہ بھی بالکل بلا ضرورت!......

اس سے بھی بڑھ کر بعض کے کمالات اور کارناموں کا اشتہار! بدگمانوں کو اس شبہ کا پورا موقع کہ مقصود کہیں فلاں اور فلاں فاحشہ کی پبلسٹی تو نہیں؟

(4) مصنف نے ان چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے اسباب کی چھان پھٹک کی ہے...... کاش ان صدہا بیانات میں سے صرف چند کو بھی اصل الفاظ میں علمی انداز میں مرتب کر کے دے دیا گیا ہوتا!

(5) اسباب فحش کاری کی فہرست جو دی گئی ہے وہ ایک عجیب نمونہ خلط مبحث و انتشار خیال کا ہے۔ عنوانات شمار میں غالباً بیس دیے ہیں، لیکن ان کی تقسیم تمام تر غیر منطقی ہے اور ان میں کثرت سے توارد یا مغالطہ تقسیم متوارد موجود ہے، ذرا سے غور و توجہ کے بعد ان بیس کو سمیٹ کر پانچ میں لایا جا سکتا تھا۔

(6) بعض بیسواؤں کی زبان سے ایک آدھ فقرہ نہیں، پوری پوری تقریریں ایسی شستہ و رفتہ، دھلی دھلائی، نقل ہوئی ہیں کہ زبان خطابت ترجمان ان کی نہیں، صاف مصنف کی معلوم ہونے لگی ہے...... یہ کتاب کا ہنر نہ ہوا، عیب ہوا۔

(7) زبان کی غلطیاں حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً مکان کی جمع ''مکانیں'' (ص:81 حاشیہ) ایک بیسوا کی زبان سے یہ فقرہ اس تھکا فضیحتی پر صلوٰۃ بھیجئے (ص: 432) صلوۃ یہ صیغۂ واحد، لعنت کے معنی میں تبصرہ نگار کے علم میں نہیں۔ صرف ''صلواتیں'' بہ صیغۂ جمع موقع ذم و شتم پر آتا ہے۔ اور پھر فعل بھی بھیجنا اس کے ساتھ نہیں آتا، ''سنانا'' آتا ہے۔

کہیں کہیں اردو، انگریزی کا ٹھیٹھ ترجمہ ہو گئی ہے مثلاً ''وہ مناکحت پر یقین نہیں رکھتی''۔ (ص:144) یا ''اوہو، یہ تو ایک خبر ہے'' (ص:112) ''خبر'' نئی خبر یا اہم خبر کے معنی میں تمام تر انگریزی استعمال ہے۔

زبان کی غلطی کہیں کہیں ذرا باریک قسم کی ہے۔ مثلاً ''وہ گنوار پن جو اس بازار کی عام خصوصیت ہے۔ سارے گھر میں نہیں'' (ص:30) آخری جز و شاید یوں بہتر ہوتا ''گھر بھر میں کسی میں نہیں''۔

ہاں ایک خاص ترکیب اس کثرت سے استعمال ہوئی ہے کہ اسے غلطی کتابت پر محمول کرنا دشوار ہے۔ ''گویا عورت'' یا ''گویا عورتیں'' ''گانے والی عورت'' یا محض ''گائن'' مناسب تھا۔ جمع ''گائنین''۔

ایک لفظ کا املا بھی ہر جگہ نامانوس نظر آیا۔ ''نکیائی'' یا ''نکیاہی'' لکھنؤ میں صحیح لفظ زبانوں پر ''نکاہی'' جاری ہے اور یہی املا جلال کے سرمایہ زبان اردو میں ہے۔ صاحب نوراللغات نے ''نکہائی'' دیا ہے۔

(8) ص: 212 پر جو شعر نقل ہوا ہے ۔ اس میں عمل ''تخلیق'' کو ''یزدان کے دلچسپ جرم'' سے تعبیر کیا گیا ہے...... ایسی گستاخی صرف جوش ملیح آبادی اور ان کے ہم مذہب ہی کر سکتے تھے۔

ص: 194 کے حاشیہ پر جو شعر نقل ہوئے ہیں، ان میں بھی شوخی گستاخی کی حد تک جا پہنچی ہے۔

(9) ایک پورا باب ص: 17 سے ص: 24 تک ''رہزنی کا پہلا شکار'' کے عنوان سے فحش کاری کی تاریخ اور اس کے غیر فطری طریقوں کے لیے وقف ہے ۔ یہ باب کیا بہ اعتبار دین و اخلاق اور کیا بہ اعتبار علم و تحقیق، ہر حیثیت سے کتاب کا کمزور ترین اور سب سے گھٹیا باب ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فحش کاری گویا ایک امر طبعی ہے۔ انسان اس پر مجبور ہے اور جن طریقوں کو خلاف فطرت کہا جاتا ہے۔ وہ بھی فلاں اور فلاں ڈاکٹر کے قول کے مطابق کچھ ایسے مضر یا غیر طبعی نہیں!...... یہ نتائج تمام تر غلط ہیں اور محض ثمرہ غیروں سے بے جا مرعوبیت اور نہایت سطحی مطالعہ کا ہیں۔ عملی نتیجہ اس کا یہ رکھا ہوا ہے کہ نوجوانوں کی راہ سے فسق و شہوانیت کی منزل کی رکاوٹیں دور ہو کر رہیں۔

(10) کتاب کے انتہائی تکلیف دہ حصے وہ ہیں جن میں دانستہ نہ سہی بہر حال پوری طرح یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بیسواؤں کے ہاں آمد و رفت کچھ ایسی معیوب نہیں۔ آخر فلاں فلاں بزرگان قوم و ملت اور فلاں فلاں مشاہیر علم و

ادب نے بھی تو یہی کیا ہے...... قلبی اذیت کے ساتھ صرف ایک اقتباس اس قسم کا دیا جاتا ہے، جو نہ صرف ایک بدترین لائیبل (ہتک عزت) کا نمونہ ہے، بلکہ اس کا ایک ایک فقرہ تلبیس کی پوٹ ہے!۔

''سرسید کانوں کے رسیا تھے، انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تو کلکتہ کی ایک جانی پہچانی طوائف نے انھیں چندہ میں بہت سارو پیہ دیا۔ مولانا شبلی کی ثقاہت میں کسے کلام ہے، لیکن وہ بھی آواز پر مرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے تو خیر ایک طوائف ہی کو اپنے گھر بٹھالیا تھا...... غرض اس دور کا ہر شاعر یا ادیب اس مکان کی سیاحت پر مرتا تھا۔ ادھر سیاسی رہنماؤں میں مولانا محمد علی مرحوم ومغفور جب کبھی کلکتہ جاتے یا لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد کے ہاں قیام ہوتا، تو زہرہ دمشتری کے کے ہاں بھی ایک آدھ نشست جمالیتے، چوں کہ من اُجلا تھا، اس لیے اس میں کوئی عیب نہ دیکھتے تھے۔ حکیم اجمل خاں کے زہد و ورع پرانگلی رکھنا خود ایک عیب ہے، لیکن تحریک خلافت کے زمانہ میں وہ کبھی کبھار خوش وقت ہو لیتے تھے'' (ص:232)

شورش صاحب اگر ملحد و بے دین ہوتے، توان سے گلہ نہ تھا، لیکن الحمدللہ کہ وہ ایک پختہ مومن کی طرح یقین رکھتے ہیں کہ اپنے چھاپے ہوئے ایک ایک لفظ کا جواب انھیں بھری عدالت میں دینا ہوگا، ان کے ضمیر اوران کی دیانت کو یقیناً ابھی اندازہ نہیں کہ ایک بیسوا کی زبان سے یہ سرتاسر دروغ بے فروغ شائع کر کے کتنا شدید ظلم اپنے اوپر اوران سارے مرحوم ومغفور حضرات پر کرڈالا ہے۔ اناللہ۔

(الف) سرسید کے لیے خدارا وہ بتائیں کہ سرسید بننے کے بعد انھوں نے کسی ایک نامحرم، خصوصاً کسی ایک کسبی کا بھی گانا کب اور کہاں سنا؟...... ''یونیورسٹی'' کا تو خیر اس وقت وجود ہی نہ تھا۔ کالج کے لیے جب بعض کسبیوں نے (جو سرسید کی ''جانی پہچانی ہوئی'' ہرگز نہ تھیں) ازخود چندہ پیش کیا۔ تو سرسید نے بادل ناخواستہ صرف اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ اس سے پاخانہ بنوائے جائیں گے۔ کیا اس کو یوں مسخ کر کے پیش کرنا کچھ بھی واسطہ سچائی سے رکھتا ہے!

(ب)   مولانا شبلی کے ''آواز پر مرنے''۔ ہاں نامحرموں اور کسبیوں کی ''آواز پر مرنے'' کے واقعات کن کن ثقہ ومستند نہ سہی، ضعیف راویوں سے سننے میں آئے ہیں؟

(ج)   اکبرالہ آبادی نے اکبر بننے سے قبل۔ عین جوانی کے زمانہ میں جب وہ وکیل تھے۔ ایک نوعمر فاحشہ سے توبہ کرائی تھی اور اس کی تطہیر کے بعد باقاعدہ اس سے عقد کیا تھا۔ اس واقعہ کو مسخ کر کے یوں لکھنا کہ ایک فاحشہ ہی کو گھر بٹھالیا تھا۔ اگر تلبیس صریح نہیں تو اور کیا ہے!

(د)   مولانا محمد علی مرحوم نے مولانا بننے کے بعد محمود آباد ہاؤس میں قیام ہی کب کیا؟ وہ تو فرنگی محل اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحبؒ کے ہاں مقیم ہوتے تھے۔ دو ایک بار اپنے سیاسی لفٹنٹ، چودھری خلیق الزماں کے ہاں ٹھہرے ہیں، زہرہ ومشتری کے ہاں یا کسی اور کسبی کے ہاں ان کی آمد ورفت کا کوئی ایک کمزور سا گواہ بھی موجود ہے! اس سے بھی بڑھ کر اس نام کی کسبیوں کا وجود بھی لکھنؤ میں ان کے زمانہ میں تھا؟

(ہ)   اب رہے حکیم صاحب مغفور، تو ان کے لیے بھی ارشاد ہو کہ تحریک خلافت کے زمانہ (1920، 1921، 1922) میں انھیں کسی کسبی سے ''خوش وقت'' ہونے کی فرصت کب کب اور کہاں کہاں ملی ہے؟

یہ پورا اقتباس اور اسی کا ہم مضمون ایک ٹکڑا ص:199 پر بھی ہے۔ اسی درجہ تکلیف دہ اور حقیقت سے معرا ہے کہ شورش صاحب اگر اس جزو سے متعلق جلد سے جلد معذرت شائع کر دیں تو انشاءاللہ خلق وخالق دونوں کی نظر میں اپنی عزت بڑھالیں گے۔

مصنف مخلص ہیں، مومن ہیں، ذہین وطباع ہیں، اور عام طور پر ایک دلچسپ وشگفتہ انداز تحریر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کتاب سے ان کی بلند نامی میں ہرگز اضافہ نہیں ہوتا، اور اسے لکھ کر انھوں نے علمی، اخلاقی، اصلاحی، انشائی کسی حیثیت سے

بھی اپنے حق میں انصاف نہیں کیا ہے۔ اصلاحی حیثیت سے کتاب صفر محض ہے اور معلوماتی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ قابل قدر نہیں۔ آیندہ ایڈیشن میں محض لفظی نظر ثانی کافی نہیں، ضرورت نقطۂ نظر کی کامل تبدیلی کی ہے۔ مجرم کی ذات سے ہمدردی رکھنا اور ہے اور نفس جرم کا استخفاف بالکل اور۔ دونوں میں فرق زمین و آسمان کا ہے۔

ع وہ راہبر کی ہدایت یہ رہگذر کا فریب

مصنف کا قلم بالواسطہ اور غیر شعور طور پر سہی پیشہ بیسوائی کو ہلکا دکھانے کا مجرم ہے اور مصنف نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھتے وقت اپنی دینی و اخلاقی بلکہ علمی ذمہ داریوں تک کو بالکل بھلا دیا ہے۔

صدق جدید، نمبر 52، جلد 6، 30 نومبر 1956

صنف ادب (سوانح)

(89) غالب

از چودھری غلام رسول مہر

ناشر مبارک علی، لاہور۔

ادبی کتابوں پر طویل تبصرے صدق کے موضوع سے خارج ہیں اور نہ اب اتنی فرصت ہے کہ ادبی کتابوں کا با استیعاب مطالعہ کیا جا سکے لیکن بعض کتابوں میں کشش کچھ اس بلا کی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہے۔ غالب کے نام سے کون اردو خواں واقف نہیں؟ وہی اردو کا نامی گرامی شاعر۔ اور مہر صاحب انقلاب کو بھی غیر معروف کون کہہ سکتا ہے؟۔ انقلاب سے ذہن جواہر لال اور ماسکو اسٹالین اور کمیونزم کی طرف منتقل نہ ہو۔ وہ انقلاب بھی نہیں جو کبھی مستقبل میں برپا ہوگا اور ابھی صرف دو شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ انقلاب جو ہر چوبیس گھنٹے لاہور کی سرزمین پر آج بھی برپا ہوتا رہتا ہے۔

پورا مطالعہ تو کیا ہو سکتا جگہ جگہ چھلتی ہوئی نظر پڑی اور غلّہ کے چند دانوں سے پوری ڈھیری کا اندازہ ہو گیا! غالب پر اردو میں اب تک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو چکا ہے لیکن ضرورت پھر بھی باقی تھی اور وہ اس کتاب سے پوری ہوتی ہے۔ روز ناموں کے ایڈیٹر کی زندگی مصروف ترین زندگی ہوتی ہے ان بیچاروں کو رات دن تار برقیوں کے ترجمے سے اور افتتاحیوں سے اتنی فرصت کہاں کہ ادبیات کا خیال بھی کر سکیں لیکن صحافتِ پنجاب کے مہر عالم تاب صاحب ''انقلاب'' کا کمال ہے کہ اپنی بیماری کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کے لکھ ڈالنے کا وقت نکال لیا! اور پھر اس کی

تیاری میں جن ہزار ہا صفحات کی الٹ پلٹ کی ضرورت پڑی اس کا ذکر ہی نہیں!۔
کتاب مغز کے لحاظ سے پست ہوتی جب بھی ان حالات میں قابلِ قدر تھی لیکن وہ پست نہیں بلند ہے، ایسی بلند کہ اس کا مصنف اگر کسی یونیورسٹی کے سامنے اسے بطور ''مقالہ تحقیق'' پیش کر دیتا تو ڈگری تو کہیں گئی نہیں تھی۔

غالب کی سیرت، غالب کے حالات، غالب کی سوانح حیات ساری چیزیں مصنف نے کمال یہ کیا ہے کہ غالب ہی کی تحریروں سے، غالب ہی کے رقعات سے، تصانیف سے، اشعار سے چن چن کر جمع کی ہیں اس سلیقے کے ساتھ کہ تالیف پر تصنیف کا گمان ہوتا ہے اور ان ریزہ چینیوں میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ خود استاد غالب کی زبان کا تو پوچھنا ہی کیا، جہاں جو فقرہ ہے حسن بیان کی جھلک، لطف انشا کی کان، باقی مہر صاحب بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔ خوب خوب پیوند کاری کی ہے اور گلدستہ ایسا سج سجا کر رکھ دیا ہے کہ پتی پتی خوش رنگ بھی اور خوشبو سے دماغ کو معطر کر دینے والی بھی۔ ادبیات کا ذوق رکھنے والوں نے اگر قدر دانی کا ہاتھ نہ بڑھایا تو ناشر کا نقصان ہو یا نہ ہو محرومی خود ان کی یقینی ہے۔ ایک کسر یہ رہ گئی ہے کہ فہرست مضامین مجمل ہے خوب مفصل چاہئے تھی یا پھر آخر میں انڈکس موجود ہوتا۔ ایک جگہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔

''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بڑی محققانہ کتاب ہے لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔''

مہر صاحب کا یہ حسن ظن صرف اس توجیہ پر قابل عفو ہے کہ انہوں نے اس کے دوسرے مقالات غور و توجہ سے پڑھے نہیں ورنہ مضمون ''غالب ہی کی طرح اگر اس کے دوسرے مقالات کی بھی انہوں نے کرید کی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ''بڑی محققانہ'' کا سرٹیفکیٹ ان کے قلم سے نکلتا۔

ادبی حیثیت سے قطع نظر تاریخی حیثیت سے بھی کتاب، کتاب خانوں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ ایک غالب کے ضمن میں اس دور کی اسلامی ہند کی کہنا

چاہئے کہ معاشری مجلسی اور سیاسی تاریخ خاصی جامعیت کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ص 201 کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

اس زمانے میں غلّہ بہت گراں ہو گیا تھا، غالب اس گرانی کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں۔

''غلّہ گراں ہے موت ارزاں ہے، میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنا سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر۔ ترکاری مہنگی۔''

ذرا اپنے زمانے کی حالت کو سامنے رکھ کر اس گرانی کا اندازہ فرمایئے غالب ان نرخوں کی بنا پر جو ہمارے نزدیک اعلیٰ درجہ کی ارزانی کے نرخ ہیں فرماتے ہیں کہ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد ایسا دور آنے والا ہے جس میں گرانی کے یہ نرخ انتہائی کشایش کے مقابلہ میں بھی ارزاں ہوں گے۔''

اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کا مطالعہ محض لطف کی خاطر نہیں بلکہ نفع و حصول معلومات کی غرض سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ سالک صاحب کی رفاقت یہاں بھی نہ چھوڑی۔ ان کے قلم کا دیباچہ گو مختصر ہے لیکن دلچسپ، کتابت روشن، چھپائی صاف، کاغذ اچھا غرض باطن کے ساتھ ظاہر بھی خوش آیند۔

صدق نمبر 2 جلد 2 مورخہ 11 رفروری 1937

(90) حیاتِ جاوید

ازمولانا الطاف حسین حالی،

انجمن ترقی اردو نئی دہلی۔

سرسید احمد خاں کی مشہور و معروف سوانح عمری، مولانا حالی کے قلم سے۔ فرطِ شہرت سے کسی جدید تعارف کی محتاج نہیں۔ خصوصیات بری بھلی جو کچھ بھی ہیں معلوم و معروف ہیں۔ عرصہ سے ناپید تھی۔ انجمن نے نیا ایڈیشن اپنے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔ آخر میں اسماء و اعلام کی فہرست بہت مفصل ہے۔

ہفتہ وار صدق مورخہ 17/جون 1940 پرچہ نمبر 7 جلد نمبر 6

(91) اعمال نامہ

از سر سید رضا علی،

ہندوستانی پبلشرز دہلی

اعمال نامہ! نام سن کر ذہن پولیس اور تھانہ کی طرف منتقل نہ ہو اور نہ پھر کراماً کاتبین کے نامہ اعمال کی طرف! کتاب کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں ایک زندہ دل علیگڈھی کی کہانی اسی کی زبانی اور بہتر ہوتا کہ یہی عبارت اندرونی سر ورق پر بطور کتاب کے عنوان تحتانی کے لکھ دی جاتی۔

مراد آباد کے سید رضا علی سے علی گڑھ کے حلقہ میں کون ناواقف ہے؟ بڑے منچلے بڑے ہونہار شروع ہی سے تھے بی اے کیا ایل ایل بی ہوئے محسن الملک مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری ہوئے وکالت میں نام پیدا کیا۔ لیگ کے سلسلہ میں شہرت حاصل کی۔ قومی لیڈری اور سرکاری جاہ ومنصب کے اونچے اونچے مرتبے طے کرتے ہوئے اب ''سر'' ہیں سی بی ای ہیں اور سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں۔ لیگ کے سابق صدر ہیں وقس علی ھذا - اور اب جا کر یہ کھلا کہ قانون اور سیاست کی خشکیوں کے باوجود یہ ''بوڑھا لڑکا'' (کسی نے اولڈ بوائے کا یہ ترجمہ خوب کیا ہے) ایک خوش ذوق سخن فہم اور اچھا خاصا اہل قلم بھی ہے۔

وہ نام خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں!

افسانہ حیات موثر ودلچسپ کس کا نہیں ہوتا؟ بشرطیکہ اپنی بدمذاقیوں سے خود ہی تاثیر ودلچسپی کا خون نہ کر دیا جائے۔ اور پھر یہ محض آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی ہے۔ محسن الملک وقار الملک جسٹس محمود، مسٹر بک اور مسٹر ماریسن، سر علی امام مظہر الحق راجہ صاحب محمود آباد نواب صاحب ڈھاکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین۔ مولانا شبلی اکبر الہ آبادی محمد علی شوکت علی سے لے کر کلکتہ کی مشہور مغنیہ

تک خدا معلوم کتنوں کی تصویریں آپ کو اس مرقع میں ملیں گی اور کتاب کہنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم یافتہ اسلامی ہند کی چالیس۔ پچاس برس کی ایک سرسری تاریخ بن گئی ہے گو ایسی تاریخ جس میں قدم قدم پر شعر و ادب مداخلت کرتے نظر آرہے ہیں شاید مداخلت بے جا کی حد تک۔

سید صاحب مذہباً شیعہ ہیں مگر ایسے شیعہ جو سنیوں میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ اور یہ اثر ایک تو علی گڑھ کی تربیت کا ہے اور پھر اس کا بھی کہ ان کے بزرگوں میں اہل سنت بھی رہے ہیں۔ سید صاحب تجدد سے بھی متاثر ہیں پردہ کی بحث میں کھل کھیلے ہیں۔ لیکن ان کا تجدد کچھ بجھا ہوا سا ہے ایک اور مراد آبادی کی طرح جو ہندوستان میں اس مسلک کے نقیب ہیں ان کا تجدد نہ تو خود مشتعل ہے، نہ دوسروں کے لیے اشتعال انگیز اور صبر آزما۔ سیاست میں بھی سید صاحب کی روش کچھ مرنجان مرنج سی ہے۔ کہیں کہیں گرما گرم بھی لیکن یہ حیثیت مجموعی سب کو سموئے ہوئے، مروت کی نظریں ہر طرف کیے ہوئے۔

کتاب حسنِ ترتیب کے لحاظ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں۔ خلط مبحث جا بجا ہو گیا ہے۔ لیکن حسن ترتیب ہے بھی مشکل اور کہنہ مشقی کے بعد ہی میسر آسکتی ہے۔ جو پیشہ ور مصنف نہیں ان کے ہاں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کتاب متفرق معلومات کے کشکول کی حیثیت سے بڑی دلچسپ اور پر لطف ہے۔ اور شعر و ادب کے بہ کثرت مباحث میں کہیں، کہیں تو سید صاحب بڑے پتہ کی کہہ گئے ہیں۔ کاش ادب ہی کو انہوں نے اپنا مستقل موضوع رکھا ہوتا!

ایک بڑی بات ہندوستان کی موجودہ ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت بڑی بات یہ ہے کہ کتاب سوانح عمری محض دماغ کی نہیں بلکہ دل کی بھی ہے۔ ''گفتنی'' کی تصریحات کے ساتھ اشارات نا گفتنی بھی جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ''برون در'' کی نقاشی کے پہلو میں مصوری ''درون خانہ کی بھی اچھی خاصی ہوتی گئی ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ عجب نہیں اس سے دلچسپ تر ہو۔

صدق نمبر 44 جلد 9 مورخہ 20 مارچ 1944

(92) حیات شبلی

از مولانا سید سلیمان ندوی،
دارالمصنفین اعظم گڑھ

اللہ کی شان کہ جس کی شاگردی اور فیض اثر سے اردو کے بعض بہترین مصنف پیدا ہوئے اور جس کے قلم نے بیشمار مشاہیر کی سوانح عمریاں مقالات تصانیف کے ذریعہ سے لکھ ڈالیں خود اسی کی یاد آج تیس سال سے قوم کی بے حسی اور جمود پر نوحہ پڑھ رہی تھی۔ لیکن بحمد اللہ اتنی طویل مدت کا شدید انتظار بے نتیجہ نہیں رہا اور آج جو مفصل و مکمل کتاب حیات شبلی کے شایان شان ہاتھوں میں نظر آرہی ہے وہ وقت کے رئیس المصنفین مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے "دیر آید درست آید" اسی کو کہتے ہیں:۔

انتظار کے بعد یاس اس قدر پھیل چکی تھی کہ معمولی درجہ کی بھی سوانح عمری نکل آتی تو غنیمت معلوم ہوتی لیکن یہ حیات ایسی ویسی نہیں ہر طرح سے جامع اور مستند شائع ہو کر رہی۔ مستند سے یہ مردانہ ہے نہ ہو سکتی ہے کہ نوسوا نوسو صفحے والی ضخیم کتاب میں سید صاحب نے جو واقعہ جس طرح تحریر فرمایا یا جو رائے جس باب میں لکھی ہے وہ سب دوسروں کے نزدیک بھی مسلم ہو گی۔ ایسا ہونا تاریخ یا تذکرہ کی کسی کتاب میں ممکن ہی نہیں۔

ہر ہر واقعہ مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر مسئلہ سے متعلق اختلاف رائے ممکن ہے۔ ہر روایت کے مختلف اجزا سے متعلق گنجائش جرح وتنقید کی اچھی خاصی رہ جاتی ہے۔

تاریخ بالکل مسلم اور متفق علیہ ہونا دنیا کے ناممکنات میں سے ہے مورخ یا سوانح نویس کے لیے بس اسی قدر کافی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے حتی الامکان دیانت سے

تحقیق سے، احتیاط سے اور تعصب و جنبہ داری سے الگ ہو کر لکھے۔

شبلی کی حیثیت ایک پورے دور کی تاریخ کے مرادف ہے۔ سرسید رفقاء سرسید، علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی ندوہ مخالفین ندوہ علماء کی تاریخ شروع حکومت انگریزی، حیدرآباد، سیاسیات کانگریس وغیرہ بیسوں مباحث ناگزیر تھے۔ اس خارزار کو طے کرنا آسان نہ تھا۔ مصنف نے اپنی والی کوشش یہی کی ہے کہ ایک طرف بحیثیت عزیز و سعادتمند شاگرد کے استاد کے حقوق محبت و عظمت بھی پوری طرح ادا ہو جائیں دوسری طرف بحیثیت بے لاگ مورخ کے قلم معاصرانہ واقعات کے ساتھ پورا انصاف برتتا رہے۔

پڑھنے والوں کی رائیں اپنی اپنی واقفیت و معلومات کے بقدر اور اپنے اپنے رجحانات و میلانات کے مطابق بعض بعض بیانات کتاب سے یقیناً مختلف ہوں گے۔

اسی طرح جیسے حالی کی حیات جاوید سے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ مباحث کتاب کی ترتیب سے متعلق بھی سب کا اتفاق رائے ضروری نہیں۔ کتاب کی جامعیت اور دلچسپی میں ذرا شک نہیں اور بہ حیثیت مجموعی حیات شبلی حیات نگار کا ایک عمدہ افادۂ قلم ہے۔ خصوصاً کتاب کا مقدمہ۔

صدق نمبر 1 جلد 10 مورخہ یکم مئی 1944

(93) مابدولت

از شوکت تھانوی

ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

اردو کے مقبول معروف ظریف شوکت تھانوی کی یہ خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس کی کہانی انہی کی زبانی۔ گویا مابدولت خود بدولت کے قلم سے۔ آپ بیتی پوری نہیں ادھوری ہے۔ ادھوری کیفیت کے لحاظ سے نہیں کمیت کے لحاظ سے۔ ادھر شوکت لکھنؤ کے ریڈیو گھر میں باضابطہ داخل ہوئے ادھر اس خودنوشت کی تائے تمت آ گئی۔ اعمال اچھے ہوں یا برے، نامۂ اعمال دلچسپ ورنگین ہر فرد بشر کا ہوتا ہے۔ خشک کسی کا بھی نہیں ہوتا ہے۔ پھر شوکت کی زندگی تو رنگا رنگیوں کا مجموعہ ہے۔ مرقع زندگی دلآویز کیسے نہ ہوتا۔ کتاب کا شروع کر دینا شرط ہے۔ پھر تو وہ خود اپنے اختتام تک پہنچا دے گی۔

مصوری اور نقاشی میں بڑا ابل ہے۔ تاریخ اور مزاح کو جمع کرنا آسان نہیں۔ تاریخی کتابت کا دامن سنبھالئے تو ظرافت تشریف لے جاتی ہے اور ظرافت کے منانے میں لگے رہیے تو واقعیت اٹھ جائے گی------ شوکت نے حوصلہ اس کا کیا ہے کہ انھیں دانتوں سے تاریخ اور واقعیت کے چنے بھی چبائے جائیں اور اسی لب ودہن سے شوخی وظرافت کی شہنائی بھی بجتی رہے۔ زندگی میں وہ منزلیں بھی آتی ہیں جہاں ہنسوڑ کے بھی آنسو نکل نکل آتے ہیں اور ہنستا ہنسانا جس کا پیشہ ہوتا ہے وہ بھی بلبلا جاتا ہے، تلملا اٹھتا ہے۔ یہ مرقع زندگی کے اس رنگ سے بیگانہ نہیں۔ ظریف ہنسنے ہنسانے ہی پر ادھار کھائے نہیں بیٹھتا ہے۔ جس وقت اس کے قلم سے یہ فقرہ حجرہ کی خلوت میں تنہا اپنے خالق کے حضور میں نہیں بلکہ دوست ودشمن، ناقد وحاسد سب کے ہاتھ میں جانے والی کتاب میں مخلوق کو سنانے کو ایک نامحرم خاتون کے سلسلے میں نکلا

ہوگا کہ ''یہی آنا جانا ایک دن ہم کو لے ڈوبے گا''۔ ادھر سے پسندیدہ نظریں ادھر سے ان نظروں کی پذیرائی ہوئی۔ شیطان نے دونوں کو اپنے آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے''۔ تو عجب نہیں جو روتے ہوئے دل کے ساتھ آنکھوں میں بھی ندامت و استغفار کے کچھ موتی چھلک آئے ہوں۔

آپ بیتی کے ضمن میں جگ بیتی بھی لازمی ہے شوکت صاحب اپنے ذاتی واقعات و معاملات میں تو بڑے ثقہ محتاط راوی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں دوسروں کا ذکر آیا ہے وہاں تخیل و افسانہ نگاری کے خوگر قلم و دماغ پر کہیں کہیں رنگ مبالغہ کا چڑھ گیا ہے-------- آرٹسٹ اپنے آرٹ کا شکار خود ہو گیا۔ ایسی کتاب بھری پری زندگی کے عین وسط میں لکھ ڈالنا اور شایع کر دینا ایک مجاہدہ ہے۔

صدق نمبر 8 جلد 12 مورخہ 22 /مئی 1946

(94) ذکرشبلی

از محمد امین زبیری،

ضخامت 242 صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔ دانش محل، لکھنؤ۔

حیات شبلی مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے قلم سے عرصہ ہوا نکل چکی ہے۔ یہ ذکر شبلی اس پر تبصرہ اور اس کے بعض حصوں کا جواب ہے۔ تاریخ ہو یا سیرت یوں بھی اسے اس طرح لکھنا کہ سب کا اس پر اتفاق ہو جائے ممکن نہیں اور پھر مشاہیر معاصرین پر قلم اٹھانا تو اور بھی دشوار ہے۔ چھوٹا بڑا کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس کی مختلف تعبیریں نہ ہو سکتی ہوں اور جسے مختلف رنگوں میں نہ لیا جا سکتا ہو۔ سر سید کی مشہور و معرکۃ الاراء شخصیت خصوصیت کے ساتھ اسی اختلاف تعبیرات کا شکار ہو سکتی تھی اور ہو رہی ہے۔ اور مولانا شبلی کی شخصیت بھی اس باب میں ان سے کچھ ایسا پیچھے نہیں۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے استاد کی سیرت پر قلم اٹھایا اور سر سید کا بھی ذکر اس میں بکثرت آنا ناگزیر تھا۔ تو یہ تو اسی وقت سے ظاہر تھا کہ یہ ذکر ہر جگہ ذکر خیر کے مرادف نہ ہوگا ___ یہی ہوا اور اس سے جہاں ایک جماعت کو مسرت حاصل ہوئی وہیں دوسری جماعت میں قدرتاً ناگواری اور بے اطمینانی بھی بڑھی۔ اور اس کا عملی ظہور اب ان اوراق میں ہوا ہے۔ سر سید اور شبلی دونوں اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے طرف و ماحول کے مطابق ملت کے بہترین خادم اور امت کے قابل ذکر افراد ہوئے ہیں ___ بایں ہمہ دونوں خاطی بشر ہی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کے ہاں اجتہادی غلطیوں کی کثرت ہو اور دوسرے کے ذاتی اخلاق کے دامن پر دھبے نکتہ چینوں کو زیادہ نظر آتے ہوں۔ آپس کی عیب بینی سے جب حضرات صحابہ جیسے نفوس مقدس نہ بچ سکے تو انیسویں اور بیسویں صدی کے افراد کس شمار و قطار میں ہیں۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل کا منظر تو بس جنت ہی میں دیکھنے میں آئے گا۔ اس عالم ناسوت

میں دعا تو صرف اس کی کرتے رہنا چاہیے کہ لا تجعل فی قلوبنا غِلاً للذین آمنوا۔

ذکر شبلی اسی اختلاف مذاق واختلاف بصیرت کے ماتحت حیات شبلی پر ایک ناقدانہ ومعترضانہ تبصرہ ہے۔ عصبیت کی بلا بدترین بلا ہے۔ جسے کم از کم اس زمانے کے تو بڑے بڑے مرتاض زاہد بھی شاید ہی پاس نکل سکے اور جہاں وطنی، اعتقادی، تلمیذی، سیاسی بہت سی عصبیتیں جمع ہو جائیں وہاں ہر فریق دوسرے پر جو کچھ بھی ظلم روا سمجھ لے کم ہے۔ محاکمہ جو غریب کرنے بیٹھے تو وہ بھی کسی نہ کسی عصبیت کے تحت فیصلہ کرے گا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ فیصلہ بجائے ''آج'' کے ''کل'' پر اٹھا رکھا جائے۔

یہ بہت غنیمت ہے کہ زبیری صاحب کی کتاب کا بڑا حصہ مولانا شبلی کی پبلک زندگی ہی سے متعلق ہے صفحہ 161 سے صفحہ 175 تک۔ ''دستہ گل کا پس منظر'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق مولانا کی خانگی زندگی سے ہے اور یہ صفحات تحریر میں نہ آئے ہوتے تو بہتر تھا۔ بہر حال بہت سے گڑے ہوئے مردے اکھڑ کر رہے اور جو باتیں ناگفتنی تھیں فریقین کے جوشِ عقیدت سے منظر عام پر آئیں۔ انھیں ہمیشہ کے لیے دفن ہی کر دیا جائے تو بہت خوب ہو۔

صدق نمبر 9 جلد 14 مورخہ 4/ جولائی 1947

(95) رند پارسا

از مولوی رئیس احمد جعفری،

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

ریاض خیر آبادی متوفی 1934 کے نام سے آج سے 25-24 سال قبل اردو کے ادبی حلقوں میں سب ہی واقف تھے اور اب بھی سن دار اور پڑھے لکھوں میں ان کے بہت سے قدرداں نکل آئیں گے۔ شہرت خاص انہوں نے شاعر ہی کی حیثیت سے پائی (گوان کا ضخیم دیوان ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوسکا) لیکن خواص کے حلقہ میں وہ اپنی شیریں و سلیس نگاری کے لحاظ سے بھی کچھ کم ممتاز نہ تھے۔ ان کا ریاض الاخبار ان کا فتنہ وعطر فتنہ اور ان کے اپنائے ہوئے ناول حرم سرا وغیرہ نے ان کے نام کو اردو ادیبوں میں اور نثر نگاروں کی صف میں مدتوں بلند رکھا۔ مفصل سوانح عمریاں جب ان سے مشہور تر شخصیتوں کی ان کے شایان شان اردو میں بہت کم لکھی جاسکیں تو ریاض بیچارہ کے لیے اس کی توقع بھی نہ کرنا چاہیے تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق (اللہ ان کی عمر میں بہت برکت دے) اب مرحوم کے دل میں بات ڈال دی اور انہیں خاندان ریاض ہی کا ایک گل نو بہار باہمت و کارگزار لکھنے لکھانے کے لیے ہاتھ آ گیا۔ کتاب تیار ہوگئی اور بہر حال جیسی بھی ہوئی۔ بہت سے مرحوموں کی قسمت میں تو ایسی بھی نہ آئی۔

ریاض اپنی خمریات کے لیے مشہور ہیں، کلام کی مستی و رندی کے لحاظ سے وہ گویا اردو کے حافظ شیراز ہیں (شیراز اور خیر آباد کے درمیان مناسبت کے بہت سے اسباب موجود ہیں) اور گوان کے ہاں رندی بھی جا بجا شراب طہور کے جام مقدس میں نظر آتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں۔

نسخۂ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا
گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

پھر بھی اکثر حصہ ان کے خمریات کا اس مادی و دنیوی دخت رز کی آشنائی کی گھاتوں سے لبریز ہے۔ لیکن یہ سب بڑا قال ہی قال رہا۔ صحیح معنوں میں شاعری ہی شاعری عملی زندگی میں کبھی ام الخبائث کے قریب تک نہ گئے ــــ تو عنوان کتاب ''رند پارسا'' کی تضاد لفظی کی لم یہ نکلی! قال پر جائیے تو رند ہی رند حال پر آئیے تو محتاط و پا کباز۔

کتاب نویس اپنے ہیرو کے معتقد و مخلص ہی نہیں عزیز قریب بھی ہیں انھیں طبعی تعلق بھی ان کے ساتھ وہی تھا جو ایک بچے کو اپنے بڑے ابا سے ہوتا ہے۔ خانگی زندگی کے بعض ایسے ایسے پہلوؤں تک ان کی نظر پہنچ گئی ہے جو باہر والے مخلصوں اور شاگردوں سے ہمیشہ مخفی ہی رہتے۔ ریاض کی نثر نگاری کے بعض بہترین نمونے سوانح نویس کے دور شعور سے پہلے ہی نمودار ہو کر پبلک کی نظر سے غائب ہو چکے تھے۔ ان تک ان کی بھی رسائی نہ ہوئی۔

مصنف کا قلم برسوں کی عادت اور مشاقی کی بنا پر ایک ادیب سے زیادہ ایک صحافی کا قلم ہے اور ادب وصحافت کے درمیان جو فرقِ عظیم ہے وہ ہزار باریک ہونے پر بھی اہل نظر سے مخفی نہیں۔ تصنیف کا کام فرصت و وقت چاہتا ہے۔ مصنف کو جلدی نہیں ہوتی۔ مدتوں وہ اپنے ذہن میں ایک نقشہ تیار کرتا ہے سوچ بچار کے بعد قلم اٹھاتا ہے۔ لفظ لفظ کو تولتا ہے۔ ترکیبوں کی تراش خراش پر دھیان جماتا ہے۔ اپنا لکھا ہوا کاٹتا پیٹتا ہے۔ صبح کا لفظ شام کو بدل دیتا ہے۔ کل کا لکھا آج غلط ٹھہرا دیتا ہے۔ اپنا نقاد آپ بنا رہتا ہے۔ صحافی غریب اتنی طوالت کہاں پاسکتا ہے اس کا کام تو چٹ پٹ گرما گرم کھانا پیش کر دینا ہے۔ معدہ جیسا بھی اثر قبول کرے بہر حال ذائقہ چٹپٹا اور خوشبو بھوک تیز کرنے والی ہو۔ قلم سرپٹ دوڑ رہا ہے اور ادھر کاتب صاحب تقاضے کے لیے سر پر کھڑے ہیں کہ کاپی جمانے میں دیر ہوئی تو وہ ذمہ دار نہیں ــــ رئیس صاحب لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے جا بجا ایڈیٹر اور کہیں کہیں صرف رپورٹر نظر آتے ہیں۔ یہ ہجو و تنقیص نہیں ان کی حاضر دماغی کی تحسین ہے کہ انھوں نے مجموعہ ایسا تیار کر دیا جو قدر دانانِ ریاض کے ذوق کو تسکین بخشے گا جس کے اندر ریاض کی شاعری، نثاری، ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کی جھلکیاں حد کافی تک تو بہر حال مل جائیں گی۔

صدق نمبر 25 جلد 15 مورخہ 11 نومبر 1949

(96) یادایّام

ازنواب سراحمد سعید خاں چھتاری

مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔

نواب صاحب چھتاری کے نام سے آج ملک کے طول و عرض میں کون نا واقف ہے؟ حیدرآباد دکن کے وزیراعظم دوبار رہے۔ صوبہ کی گورنری دو مرتبہ کی، منسٹر اور ہوم ممبر برسوں رہے۔ اس وقت بھی مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر ہیں۔ سراحمد سعید خاں اور نواب سعید الملک کے نام سے تو کم لیکن نواب صاحب چھتاری کے لقب سے ایک دنیا واقف ہے------- آج معلوم ہوا کہ صاحب سیاست ہونے کے ساتھ ساتھ اہل قلم بھی ہیں!

وہ نامِ خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں!

مشہور وزیر سلطنت سلجوقیہ نظام الملک طوسی عملی سیاسیات کا ماہر ہونے کے ساتھ ہی سیاست نامہ کا مصنف بھی تو ہوا ہے۔ اور چرچل وغیرہ کی مثالیں تو بالکل سامنے کی اور تازہ ہیں۔

''یادایام' نواب صاحب کی خودنوشت سرگزشت حیات ہے اور خودنوشت سوانح حیات ہمیشہ دوسروں کی لکھی ہوئی سے زیادہ دلچسپ و مؤثر ہوتی ہے۔ بشرطیکہ قلم میں خلوص اور سلیقۂ تحریر اوسط درجہ کا بھی ہو۔ اور ''یادایام'' خوش قسمت مصنف بحمد اللہ اس دولت سے محروم نہیں۔ گھر پر مذہبی تعلیم و تربیت خالص مشرقی اور بڑی حد تک دینی ماحول مقبول و برگزیدہ دادا کا آغوش تربیت پھر علی گڑھ کی اسکولی تعلیم، رئیسانہ ماحول، ریاست کا کاروبار، شادی بیاہ، حکام رسی کونسل کی ممبری، وزارت، صوبہ کی ہوم ممبری، معاصرین سے تعلقات، آپس کی نوک جھونک، گورنر کی اچانک وفات پر عارضی گورنری! یہ ساری پرلطف داستان خاصے پرلطف انداز میں بیان ہوئی

ہے اور 1920 سے لے کر 13 سال بعد تک جو سیاسی شخصیتیں یو پی میں نمایاں رہی ہیں ان سب کی جھلکیاں اس مرقع میں موجود ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد مرحوم، پنت جی موجودہ وزیر اعظم، مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر، سر تیج بہادر سپرو، علی برادران، پنڈت موتی لال نہرو، حافظ ہدایت حسین مرحوم، رائے راجیشور بلی، سر جیمس سٹن، لارڈ ریڈنگ، سر الگزینڈر موڈیمین، سر سیتا رام، سر ولیم مارس، چودھری خلیق الزماں، حسرت موہانی، ان کے تذکروں سے دلچسپی کسے نہ ہوگی۔ کتاب کے ورق الٹتے جائیے اور سب سے تعارف اپنی اپنی جگہ ہوتا رہے گا۔ قدرتاً سب سے زیادہ روشنی خود نواب صاحب چھتاری ہی کی ذات پر پڑتی ہے اور پھر ان لوگوں پر جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً نواب جمشید علی خاں نواب باغپت ------ بات اور بڑی بات یہ ہے کہ بچپن کی شرارتوں سے لے کر اپنی وزارت ہوم ممبری اور گورنری کی سیاسی زندگی کا کوئی قابلِ ذکر پہلو مصنف نے چھپایا نہیں ہے اور اپنی بشریت کے حصوں کو بھی ویسا ہی نمایاں کیا ہے جیسے اپنے کارناموں کو۔

نواب صاحب ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں اور نام کے نہیں بلکہ سالانہ محراب سنانے کے ایسے پابند کہ بڑے سے بڑے منصوبوں اور عہدوں پر فائز رہ کر بھی اپنے اس معمول میں ناغہ نہ ہونے دیا۔ ان کی اس مذہبیت کا اصلی راز ان کے جدِ امجد اور والد ماجد کی گہری دینداری میں ملتا ہے۔ اور بعض واقعات ان دونوں کے کتاب میں بڑے مؤثر بیان ہوئے ہیں۔ اور اپنے عقد کی رات کا اپنا ایک نادانی کا واقعہ دوسرا شاید اس صفائی اور بے تکلفی سے بیان نہ کرتا جیسا نواب صاحب بیان کر گئے ہیں اور کتاب کے مطالعہ سے اتنا تو بہر حال عیاں ہو جاتا ہے کہ نواب صاحب اور جو کچھ بھی ہوں بہر حال عقائد کے لحاظ سے ایک پختہ مسلمان اور عملی زندگی میں ایک شریف انسان ہیں۔ رواداری اور شگفتہ مزاجی کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ اور مرنجان مرنج کردار کے مالک، دوستی کو تہ بہ تہ اختلافات کے باوجود نباہے جانے والے اور

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

کتاب دلچسپ ہی نہیں بڑی سوجھ بوجھ سکھانے والی اور اخلاق وحکمت کے بہت سے درس دینے والی بلکہ صفحہ 31 پر جو واقعہ شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے ورود علی گڑھ کے سلسلے میں درج ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے شروع سے بعض فقہی مسائل کو بھی رٹ نہیں بلکہ ماشااللہ خوب سمجھ کر پڑھا ہے---- کسر جو کچھ کتاب بھر میں ہے وہ بس یہ کہ داستان ناتمام سی رہ گئی ہے۔ یو پی کی دوبارہ گورنری جو لمبے زمانے کی تھی اور حیدر آباد کی وزارت عظمٰی یہ دونوں باب کتاب کے اہم ترین اجزا ہو سکتے تھے اور افسوس ہے کہ یہی صفحات بالکل سادہ رہ گئے ہیں خدا کرے کتاب کا دوسرا حصہ جلد سے جلد اس اہم فروگزاشت کے تلافی کر دے۔ شروع میں پیش لفظ سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے پڑھنے کے قابل ہے۔ ایک مکتوب پنت جی کا 1930 کا لکھا ہوا اور ایک سر چنتا منی کا 1929 کا دونوں اصل انگریزی میں جوں کے توں درج ہیں۔

صدق نمبر 6 جلد 16 مورخہ 9/ جون 1950

(97) یادگار حالی:

از صالحہ عابد حسین صاحب،

241 صفحہ، 88×44 مجلد مع گرد پوش، قیمت......، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

(98) حیات سرسید

از نور الرحمٰن صاحب،

164 صفحہ، 18×22 مجلد، قیمت......۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

جدید انجمن ترقی اردو (ہند) نے آخر کچھ کتابیں چھاپنی شروع کر دی ہیں۔ پر چھائیں کا تعارف ان صفحوں میں پہلے کیا جا چکا ہے۔ آج یادگار حالی اور حیات سرسید پیش نظر ہیں۔

حالی دوسروں کی یادیں سناتے رہے۔ سعدی اور غالب اور سرسید کی سوانح عمریاں چھاپتے رہے۔ خود ان غریب کی یاد اب تک کہنا چاہیے کہ کسی کو آئی ہی نہیں۔ اور گو 1937 میں ان کی پیدائش کی صد سالہ جوبلی خوب دھوم دھام سے منائی گئی۔ پھر بھی ان کی سیرت کا مسئلہ بدستور تشنہ ہی رہا۔ اور اس لیے ان کی وفات سے 35 سال بعد 1950 میں یہ یادگار بہت غنیمت بلکہ اس سے بھی کچھ زائد نظر آ رہی ہے۔ اس کی تالیف کا شرف انھیں کی ایک عزیزہ (غالباً نواسی) بیگم صالحہ عابد حسین کے حصہ میں آیا ہے اور اس لیے اس میں حالی مرحوم کی خانگی نجی گھریلو زندگی کے بعض پہلوؤں کی تفصیل قدرۃً زرا زیادہ ہے۔

شروع میں مولانا ابو الکلام آزاد کے قلم سے چند سطریں پیش لفظ کے عنوان سے ہیں۔ اور کوئی پانچ صفحہ ''عطیہ مولانا ابو الکلام آزاد'' کے عنوان سے۔ ان کی ادبیت اور حسن انشاء کا کیا کہنا، کتاب بھر میں اور کچھ نہ ہوتا صرف یہی ہوتا تو

بھی بہت کچھ تھا۔

کتاب مولفہ کی تمہید کے علاوہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔نشو نما، آب ورنگ ، برگ و بار۔لیکن یہ عنوانات بجائے اس شاعرانہ رنگ ڈھنگ کے اگر سیدھی سلیس زبان میں ہوتے تو پڑھنے والوں کو یہ سمجھنے میں زیادہ آسانی رہتی کہ ہر باب کے ماتحت کیا کیا ہے۔عنوان ایسا ہونا چاہیے جو ہر باب کے لیے کلید کا کام بلا تکلف دے سکے۔ عمومی حیثیت سے بس یہ سمجھ لیا جائے کہ باب اول میں سادہ واقعات زندگی پیدائش سے وفات تک ہیں ۔دوسرے باب میں مختلف قومی، ملی جماعتوں کا ذکر اور تیسرے باب میں شاعری پر مفصل تبصرہ۔

مولفہ مخلص پر جوش عقیدت مند ہیں لیکن تصنیف و تالیف میں زیادہ پختہ کار نہیں ۔کتاب متعدد سوالات کے جوابات میں قدرۃً تشنہ رہ گئی ہے ۔ حالی کے شاگردوں کی فہرست ان کی کتابوں کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل زندگی میں اور بعد وفات بھی حالی کی زبان پر اعتراضات اوران کے جوابات مسدس اور نیچرل شاعری کی شدید مخالفت کے اسباب۔معمولات تصنیف و تالیف اور طریق شعر گوئی ،اس قسم کے متعدد عنوانات کا خلا طبیعت کو بری طرح محسوس ہوتا ہے۔مولفہ شاید خود بھی ''ترقی پسند'' شاعری کی ہمدرد ہیں اوراس لیے حالی کو بھی گھسیٹ گھسیٹ کر اس میدان میں لائی ہیں۔حالاں کہ ''ترقی پسندی'' جس اصطلاحی معنی میں آج چلی ہوئی ہے، حالی غریب تو اس کا نام سن کر ہی شاید کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتے۔مولفہ جس معنی میں حالی کے کلام کو غیر ''فرقہ وارانہ'' ثابت کرنا چاہتی ہیں۔حالی اسے ہرگز اپنے حق میں داد نہ سمجھتے ۔اور نہ اپنی شاعری کے اسلامی یا ملّی ہونے سے وہ ذرہ بھر بھی شرماتے ۔مولفہ کی زبان اچھی خاصی سلیس اردو ہے۔لیکن کہیں کہیں انگریزیت اسی طرح غالب آ گئی ہے ۔ مثلاً یہ فقرہ ''ذاتی پروپیگنڈے کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا'' (ص:8) صاف انگریزی وضع وترکیب کا ہے۔ایک خاص صاحب جن کا شمار نہ اردو کے ادیبوں میں ہے نہ نقادوں میں ۔ ان کے رائے کو بار بار سنداً پیش کرنا بھی

مولفہ کے حسن ذوق کی کچھ اچھی شہادت نہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی اب بھی بہت غنیمت ہے۔ نظر ثانی اور تھوڑی سی مزید توجہ کے بعد اسے طبع ثانی میں بہت بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری کتاب سرسید پر ہے۔ اس کے لکھنے والے اپنے زمانہ کے ایک ممتاز ''علیگ'' اور ''جامعی'' ہیں۔ خیالات عموماً سلجھے ہوئے رکھتے ہیں۔ اور زبان بھی خاص سلیس لکھ لینے پر قادر ہیں۔ لیکن اس خاص کتاب کی تحریر کے وقت معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کچھ دودے سے ہو رہے تھے۔ اپنا ضمیر اور رجحان طبیعت کسی طرف لیے جاتا تھا۔ اور وقت کی مصلحتیں کسی طرف۔ یہ فکری حیص بیص اور ذہنی انتشار جگہ جگہ غیر مخفی ہے۔ اسی کے اثر سے کتاب میں کوئی خاص بات نہ پیدا ہو سکی اور کتاب گویا حیات جاوید کی تلخیص ہو کر رہ گئی۔ باقی نئی نسل کے لوگ جن کی دسترس سے حیات جاوید باہر ہے۔ ان کے لیے یہ کتاب بھی بری نہیں۔ سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے تعارف ان ڈیڑھ سو صفحوں میں اچھا خاصہ ہو جائے گا۔ اور یہ بجائے خود کافی ہے۔

دو تین موٹی باتوں کی طرف اشارہ بہر حال ضروری ہے۔ جن کا شمول طبع ثانی میں ہو جانا چاہیے۔ (1) سرسید کے مشہور و معروف صاحب زادے جسٹس محمود کو کوئی ''دماغی مرض'' (ص:83) ہرگز لاحق نہ تھا جس نے آخر زمانہ میں سرسید کی زندگی کو بے لطف بنا دیا تھا۔ 1900 میں حیات جاوید کی اشاعت کے وقت یہ اخفاء جتنا بھی ''مصلحت آمیز'' ہو آج 50 میں اس بڑی ہی افسوس ناک عادت مخموری یا بدمستی کا نام کھل کر لینا ہرگز ''راستی فتنہ انگیز'' کے دائرہ میں نہیں آتا۔

(2) مرض الموت کے حالات زرا تفصیل سے لکھنے تھے۔ بعض بڑے مؤثر حالات مل سکتے ہیں۔

(3) خاص خاص تصانیف پر تبصرہ زرا مفصل اور جاندار لفظوں میں ہونا تھا۔ اصل کتابوں کے مطالعہ کے بعد نہ کہ ان سے محض بالواسطہ واقفیت حاصل کر کے۔

(4) ہمیشہ ان کی یہ رائے رہی کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم

رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔(ص:128) یہ رائے جس مطلق صورت میں یہاں درج کردی گئی ہے۔ یہ سرسید کے مسلک کی صحیح ترجمان نہیں۔

دونوں کتابیں۔ چھپائی، کتابت، کاغذ، جلد کے اعتبار سے خوشنما ہیں لیکن غلطیاں افسوس ہے کہ دونوں میں کثرت سے رہ گئی ہیں۔

صدق جدید، نمبر 21، جلد 1، 8/دسمبر 1950

(99) حیات اکبر

از سید عشرت حسین الہ آبادی مرحوم وملا محمد واحدی دہلوی ثم پاکستانی
241 صفحہ مجلد قیمت درج نہیں۔ بزم اکبر بزرنالائیز۔ کراچی (پاکستان)۔

کتاب کا اصل مسودہ حضرت اکبر کے صاحب زادہ سید عشرت حسین مرحوم کے قلم سے تھا۔ اسے ترمیم و تہذیب کی موجودہ صورت کے ساتھ شائع واحدی صاحب نے کیا ہے۔ قالب پہلے سے موجود تھا روح واحدی صاحب نے ڈالی ہے۔

کتاب اپنے اصل موضوع پر بہت مختصر ہے۔ ص 41 سے 160 تک آ گئی ہے اور متعدد ضروری عنوانات بالکل تشنہ رہ گئے ہیں۔ مثلاً اکبر کی قانونی قابلیت اور بہ حیثیت جج کے ان کے فیصلے اور کارنامے۔ ان کی نج کی زندگی اور اس کے بعض رنگین پہلو، معاصر علماء سے ان کی عقیدت، معاصر ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات وغیرہا۔ اتنی مختصر کتاب کے لیے صحیح نام بجائے ''حیات اکبر'' کے ''خاکۂ اکبر'' ہونا تھا، لیکن یہی غنیمت ہے کہ اس خاکہ کی بھی توفیق پاکستان ہی کو ہوئی، لکھنؤ اور دہلی اور الہ آباد سب اتنے سے بھی محروم رہے۔

ص 5 تا 7 پر ایک لمبا قطعہ درج ہے، قطعہ بجائے خود بہت اچھا ہے لیکن اس کا ربط اصل کتاب سے نہیں کھلتا اور نہ اس پر کوئی سنہ و تاریخ ہی درج ہے۔ شروع میں ایک دیباچہ نما تحریر خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے اور کتاب کے قلمی مسودہ کو دیکھ کر مدیر صدق کے جو تاثرات ہوئے تھے، وہ بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ متن کتاب پر حاشیے بھی کثرت سے ہیں، زیادہ تر خواجہ صاحب اور مدیر صدق کے لکھے ہوئے اور کچھ واحدی صاحب کے قلم سے بھی۔ تصویریں تین درج ہیں۔ ایک بچپن کی، ایک ججی کے زمانہ کی، ایک پیرانہ سالی کی۔ ایک تصویر جو عین جوانی کے زمانہ کی ہے۔ اور اس کا بشرہ ذہانت کا سب سے زیادہ مظہر ہے۔ افسوس ہے کہ وہی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکی خاندان میں ایک گروپ میں ابھی چند سال ادھر تک موجود تھی۔ تصویر کا

دینا اگر جائز رکھا بھی جائے، تو پھر گناہ باللذت ہو۔ محض بے لذت ہو کر تو نہ رہ جائے۔

خواجہ صاحب کا دیباچہ آپ بیتی کے رنگ میں ہے۔ اس میں صفحہ 31 سے صفحہ 102 تک جو مضمون درج ہے اس سے حضرت اکبر کے دوسرے جاننے والے بہ مشکل ہی اتفاق کریں گے۔ کم از کم اس تبصرہ نویس کے ذاتی معلومات تو اس کے بالکل برعکس ہیں۔

حالات زندگی کے ختم پر تعزیت کے خطوط اور تار انگریزی اور اردو میں سب ہی دے دیے گئے ہیں۔ مرتب کو اس موقع پر اپنی قوت امتیاز و انتخاب سے کام لینا تھا۔ اور صرف دو چار اصل تعزیت نامے دے کر باقی سب کے محض نام لکھ دینے بالکل کافی تھے۔ آخر میں بزم اکبر کے صدر و سرپرست صاحبان کی تقریریں ہیں، بالکل خاتمہ پر ایک ضمیمہ ہے۔

صدق جدید نمبر 10، جلد 2، 8/ فروری 1952

(100) کشکول محمد علی شاہ فقیر:

از چودھری محمد علی ردولوی،

24+324 صفحہ۔ قیمت درج نہیں۔صدیق بک ڈپو، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

چودھری محمد علی ردولوی ہمارے اودھ کے اچھے شوخ نگاروں میں ہیں۔ لکھتے کم ہیں، مگر عموماً اچھا لکھتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ انکے کوئی 24 مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ کچھ خاکے اور کچھ ریڈیائی کہانیاں، کوئی واقعاتی اور کوئی افسانوی رنگ میں شوخی و مزاح کا عنصر ہر ایک میں شریک بلکہ شریک غالب - ادب لطیف کے صحیح مصداق نقرے کے نقرے شوخ در شوخ، شوخ ہی نہیں، کہیں کہیں چلبلے بھی!

شخصیتوں کا ذکر کثرت سے ہے، اکثر خاکے مصنف کی جانی پہچانی کسی متعین شخصیت ہی کی نذر اپنی والی کوشش یہی ہے کہ بات صرف تفریح، دل لگی اور ہنسنے ہنسانے تک رہے اور نوبت تضحیک و تفضیح کی نہ پہنچے، لیکن اب یہ کون کہے کہ کوشش ہمیشہ کامیاب ہی رہی ہے!- راستہ ہی ہے کچھ ایسا باریک نازک اور پرخطر:

جو آوت سوجات ہے بھنگی!

زبان بڑی صاف بلکہ لکھنؤ کے معیار سے ٹکسالی لکھتے ہیں، اور یہ داد معمولی نہیں اس وقت بہت بڑی داد ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کے کہنا چاہیے کہ بادشاہ ہیں۔ پھر بھی قلم کہیں کہیں شاید نادانستہ غلط العام کی راہ پر پڑلیا ہے۔ ''حسب دلخواہ'' (ص: 235)''راضی بہ رضا'' (ص:110 وص:112) وغیرہ۔

فحش و عریانی کے موقع ناگزیر ایک دو نہیں۔ بار بار اور وصل و اختلاط کی منظر کشی جا بجا۔ پھر کشکو لیے کو دعویٰ نہ زہد خشک کا نہ اپنی ثقاہت کا۔ پھر بھی قلم کا جوہر شرافت ہر جگہ نمایاں اور آج کی 'ترقی پسندی' کے معیار سے تو منزلوں دور۔

چودھری صاحب نرے ظریف نہیں۔ کچھ تھوڑے سے حکیم بھی ہیں۔ (نیم

حکیم نہیں۔ حکیم) اور ہنستے کھیلتے یا ان باتوں میں نفسیات بشری کا تجزیہ جا بجا خوب کرتے گئے ہیں۔ جیسے عنوان دھوکا کے ماتحت۔ اور کہیں کہیں چوری چھپے کوئی درس حکمت و اخلاق کا بھی دے نکلے ہیں۔ جیسے عنوان ''نیلم کا نگ کے نیچے- نذیر احمد اور سرشار دونوں کے رنگ سے رنگ لیکن دونوں کے بین بین۔ اتنا ہی نہیں۔ کہیں کہیں درد کی کسک اور سوز و گداز کی جھلک بھی پھوٹ نکلی ہے- یقین نہ آتا ہوگا۔ بے شک بات ہے بھی کچھ ناقابل یقین سی۔ لیکن انکار کرنے سے قبل ایک بار غریبی میں امیری کی سیر فرمالیجیے۔

تحریر آمد، روانی بیساختگی کا ایک سمندر ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ قلم ایک پیشہ ور مصنف کا قلم نہیں۔ ہر فن کی طرح فن تصنیف بھی اپنے کچھ مخصوص آداب اور ضابطے، یا اپنی ایک خاص ''ٹکنیک'' چاہتا ہے نظر ثانی کر لینے سے بیساختگی پر ہمیشہ اوس ہی نہیں پڑ جاتی کبھی کبھی اور جلا پیدا ہو جاتی ہے! -عیب چینی کی نگاہ کو چلتے چلتے ایک بات اور گرفت کی مل گئی۔ ''ان لوگوں نے بہتر دن دیکھے تھے'' (ص:149) یہ زبان چودھری صاحب کی اپنی نہیں۔ صاف صاحب بہادر کی پڑھائی ہوئی ہے۔ شروع میں ایک بڑا لمبا چوڑا ''تعارف'' لاہور کے ایک ہم قلم بزرگ کا ہے، کچھ ''تقریظ'' کا ہم رنگ اور جا بجا ثقیل سا۔

افسوس ہے کہ طبع، کتابت کی بے انتہا غلطیوں نے کتاب کا مزا ہی کرکرا کر دیا ہے۔

صدق جدید، نمبر 26، جلد 2، 30 رمئی 1952

(101) حیاتِ اجمل

از قاضی محمد عبدالغفار صاحب،

532×6 صفحہ، تقطیع 18×22۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت آٹھ روپیہ۔

انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم و مغفور اپنی ذات سے خود ایک انجمن ایک ادارہ تھے۔ موضوعِ تصنیف ایسی پُرعظمت اور مختلف الجہات شخصیت اور لکھنے والا قلم ''نقشِ فرنگ'' کا نقاش اور ''لیلیٰ کے خطوط'' کا کاتب، تبصرہ نگار کے دل نے کہا کہ اب اور چاہیے کیا، مدح و تحسین کے بادل ایک دم سے برس پڑیں اور عیب چینی کی نگاہ ناکام و حیران، بھٹکتی، ترستی، تڑپتی ہی رہ جائے!۔ مبتدا کی خبر کاش یہی نکلی ہوتی!

کتاب بالکل یکلخت اور گویا پھٹ سے صفحہ الف سے شروع ہو جاتی ہے! نہ تمہید نہ تقریر، نہ تعارف نہ عنوان! اور فہرست مضامین کے نام کی دو چار کالی لکیریں تک نہیں! بیسویں صدی کا پڑھنے والا، وہ ہزار بے تکلف ہو، ایسے سپاٹ آغاز تخاطب پر اپنا سر پیٹ کر نہ رہ جائے، تو کیا کرے؟۔ کچھ سطریں پڑھ چکنے کے بعد ہی کھلتا ہے کہ سامنے دیباچہ کے قسم کی کوئی چیز ہے۔ تو اس کی تان ئے تمت نکلتی ہے ''جے ہند''!۔ ''سیکولرازم'' کی اتنی رعایت اب تک سیکولر سرکار نے بھی کیوں کی ہوگی!

کتاب کی تقسیم مختلف حصوں میں ہے۔ ''تاریخی پسِ منظر'' ''نورِ صبح'' ''دورِ اوّل'' ''دورِ ثانی'' وغیرہا۔ لیکن جب تک عین ان عنوانات تک پہنچ نہ لیجیے گا، کوئی رہنمائی آپ کی مصنف کی طرف سے نہ ہوگی! اور نہ جب تک کتاب آپ ختم کر لیں گے کچھ اس کا پتا ملے گا کہ کتاب کے باب ہیں کتنے اور کون کون سے!۔ فاضل مصنف کی ادبیت، کہنہ مشقی، اور شہرتِ قلم سے توقع اس کی تھی کہ وہ دوسروں کو کتاب نویسی کے گُر اور کتاب سازی کے آداب سکھا دیں گے، یہ کس بدبخت کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ

پڑھنے والے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کا لطف اٹھاتے جائیں گے! ۔کتاب کے آخر میں اشاریہ کے نام سے چند ورق ضرور شامل ہیں لیکن اول تو وہ اشاریہ ہی کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے ناقص بعض بقدر ضروری عنوانات اس میں چھوٹے ہوئے اور جو عنوانات ہیں ان کے تحتانی ضروری اندراجات غائب اور پھر وہ جیسی بھی ہے۔ فہرست مضامین کے خلا کی تلافی کے قابل کسی طرح بھی نہیں۔ناظر کے ذہن کو جو جھٹکے لگنے ہیں وہ بہر حال لگ کر رہتے ہیں۔

صاحب سیرت کی زندگی کے مشغلے بڑی مختلف نوعیتوں کے تھے۔اس لیے سیرت کی ترتیب بہترین یوں ہوسکتی تھی کہ ہر شعبۂ زندگی کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ الگ الگ عنوان کے تحت کیا جاتا۔مثلاً ایک حصہ طبی خدمات کے لیے وقف ہوتا اور اس کے ماتحت مستقل باب ''طبی اداروں کی تشکیل''،تشخیص ومعالجہ،فنی اجتہادات،وغیرہ پر ہوتے۔اسی طرح ایک حصہ سیاسی کارناموں کے لیے وقف ہوتا۔اور اس کے ماتحت لیگ،کانگریس،خلافت کمیٹی وغیرہ پر ایک ایک باب ہوتا۔ایک حصہ ''معاصرین سے تعلقات'' کی نذر ہوتا۔وقس علیٰ ہذا۔یہ ترتیب بالکل منطقی بھی ہوتی اور نفسیاتی بھی ۔لیکن اس سلجھی ہوئی ترتیب کے بجائے ترتیب محض تاریخی رکھی گئی ہے۔اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ایک سنہ یا ایک زمانہ کی ساری مختلف مشغولیتیں ایک جگہ سمیٹ لی جائیں-قدرۃً بیان میں وہ انتشار وخلفشار پیدا ہوگیا کہ اسے مصنف کی مسلمہ ادبیت و انشاپردازی بھی زیر نہ کرسکی۔ضعف تالیف سے بچنا شوخ نگاری کے تخلیقی نمونے پیش کرنے سے کہیں زیادہ ضروری اور مقدم تھا۔ع نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند۔

حکیم صاحب کی زندگی کہنا چاہیے کہ ملک کی 35 سالہ تاریخ کا آئینہ تھی۔ ان کی داستان زندگی کی لپیٹ میں ندوہ اور علی گڑھ،لیگ اور کانگریس،خلافت کمیٹی اور جامعہ ملیہ،طبیہ کالج اور طبی کانفرنس وغیرہ بیسیوں اداروں اور گاندھی جی اور محمد علی، ڈاکٹر انصاری،اور شوکت علی۔ جناح اور ابوالکلام،شبلی اور عبدالباری فرنگی محلی،محمود آباد اور مشیر حسین قدوائی۔موتی لال نہرو اور سی آر داس۔ پچاسوں مشاہیر معاصرین

کا تذکرہ آ جانا لازمی تھا۔ یہ موقع سیرت نگاری کے لیے زرا کڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ادھر ہیرو پرستی کا تقاضہ یہ کہ صاحب سیرت کی بات ہر حال میں بالا رہے۔ ادھر دیانت کا فتویٰ یہ کہ حق تلفی کسی معاصر کی نہ ہونے پائے۔ قاضی صاحب عموماً اس گھاٹی کو پار کرتے چلے گئے ہیں لیکن کہیں کہیں جیسے جسم اپنا توازن قایم نہ رکھ سکا ہے۔ جامعہ ملیہ کی پیدایش وقیام کے سلسلہ میں کچھ معلوم ایسا ہونے لگتا ہے کہ جیسے مولانا محمد علی کی حیثیت محض ثانوی تھی۔

ملکی وملی مسائل میں یہ ضروری نہیں کہ صاحب سیرت اور سیرت نگار شروع سے آخر تک ہم رنگ ہی ہوں۔ سیرت نگار کو اگر دیانت اور اپنے فن کی عزت عزیز ہے تو چاہیے کہ قناعت مصوری (فوٹو گرافی یا عکاسی) پر کرے اور نقاشی (پینٹنگ) کی ہوس اور ولولہ کا دل ہی مار دے۔ قاضی صاحب ماشاءاللہ 80 فی صدی اس خود فنائی کے مجاہدہ میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن کاش یہی بات باقی 20 فی صدی کے لیے کہی جا سکتی!۔ حکیم صاحب کی اسلامیات کا تذکرہ اتنا ہلکا پھلکا۔ اور ان کے جذبات و طنیت کا نقش اتنا بھاری بھر کم کہ اسلامیت غریب دور سے صدا لگاتی رہ جائے۔

میرا حصہ دور کا جلوہ
آنکھیں میری باقی اُن کا!

یہ اس حافظ قرآن مرد مسلمان کے حق میں انصاف کچھ یوں ہی سا ہوا تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ۔ سطور اوران سے بڑھ کر بین السطور سے اثر یہ ڈالا گیا ہے کہ حکیم صاحب نے مایوس و بد دل ہو کر 1924 سے خلافت کمیٹی سے دلچسپی لینا بہت کم کر دی تھی۔ حالاں کہ تاریخ کی لوح پر یہ حقیقت ثبت ہے کہ مرحوم اس کے صدر 1925 کے آخر تک رہے، اور 1926 میں مرکزی خلافت کا جلسہ جب دلی میں ہوا، تو یا تو حکیم صاحب کے مکان ہی پر، یا اگر دفتر ہمدرد میں ہوا تو حکیم صاحب اس میں شریک ضرور ہوئے۔ اور عملی دلچسپی بھی لیتے رہے۔

اس فروگزاشت کو اس طبیب اعظم کے حق میں ایک طرح کا ظلم یہ سمجھئے کہ

کوئی مخصوص باب اس کے مجددانہ کمالات و خدمات پر کسی بڑے طبیب کے قلم سے لکھوایا ہوا اس حیات میں شامل نہیں۔ تاہم دو واقعے حکیم صاحب کی ''مسیحانہ'' تشخیص و معالجہ کے ان اوراق میں بھی مل جاتے ہیں۔ اور دونوں یورپ میں۔ ایک لندن سرجن ڈاکٹر اسٹینلی بایڈ کے مقابلہ میں (ص:99-100 پر)۔ دوسرا ایک مشہور و ممتاز فرانسوی ڈاکٹر کے مقابلہ میں (ص:343-344 پر)۔

قاضی صاحب عادۃً زبان کے بڑے بیٹھے ہیں۔ نوک جھونک جتنی بھی کریں قلم عموماً مزاح و خوش طبعی کے حدود سے تجاوز نہیں کرتا، اور توہین و دلآزاری کی پستیوں پر نہیں اترتا۔ لیکن کون کلیہ ہے جو مستثنیات نہیں رکھتا؟ صفحہ 124 پر حضرت اکبرؒ کے لیے بالکل بلاوجہ اور بے ضرورت ایک ''سرکار پرست شاعر'' کا خطاب، اور صفحہ 28 پر خلافت کمیٹی والوں کی شان میں یہ مصرعہ ہجو یہ کہ ''اس بے وقوفوں کی جنت سے بعد کے واقعات نے انھیں بہت بیوقوف بنا کر نکالا'' اب کیا عرض کیا جائے کہ کس ذہنیت کی نشاندہی کر رہے ہیں! - جلال کی حدت و تمازت جمال کے شبنم کو کتنی جلد خشک کر دیتی ہے!

قاضی صاحب تحریر کے میدان میں کوئی انیلے نہیں۔ ان کا قلم شستہ، سلیس، صحیح، ٹکسالی اردو لکھنے پر قادر ہی نہیں عادی بھی اسی کا ہے۔ لیکن بشریت کسی معیاری مہارت کے ہمہ وقتی قیام کی روادار کب ہے؟ جابجا برابر ایسے فقرے آتے گئے ہیں، کہ معلوم ہوتا ہے اردوئے شاہجہانی کا صاحب قران اور وفادار خادم اپنی بولی سے اکتا کر ''صاحب'' کے سرشتۂ ترجمہ میں آ کر امیدواری کرنے لگا ہو۔ ''حکیم صاحب کے کاندھے بہت چوڑے تھے'' (ص:92)۔ ''حکیم صاحب بھی مہاتما جی کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار تھے'' (ص:303)۔ ''اس بیوقوفوں کی جنت سے'' (ص: 380) وغیرہا۔ اور خیر یہ مفرد فقرے تو پھر غنیمت ہیں۔ ایک جگہ مرکب اور لمبے فقرہ میں تعقید و غرابت ناقابل یقین حد تک پہنچ گئی ہے۔

صحت لفظی ذیل کے لفظوں پر منہ بناتی نظر آئی۔ ''نموشۃ'' (ص: 351)

مبارکباد کی جگہ ''مبارکبادی'' عید الاضحیٰ کی جگہ (ایک مقام پر) عید الضحیٰ اور صحت معنوی ذیل کی ترکیبوں پر مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ عبدالمجید خواجہ کی جگہ خواجہ عبدالمجید (ص:450) اور مولانا شبلی ''بانی ندوہ'' (ص:140)۔ آخر میں ایک لطیفہ اور خواجہ حافظ کی وہ فیاضی تو سب کے ذہن میں ہوگی کہ اپنے ''ترک شیرازی'' کو سمرقند و بخارا کی سرزمین بخشے ڈالتے تھے، ہمارے قاضی صاحب نے بھی انکسار و خودنمائی کا یہ ریکارڈ قایم کردیا ہے کہ ایک جگہ اپنی اردوے معلاً نہیں اردوے مُطلاً کی سطروں کی سطریں بے تکلف حکیم صاحب مرحوم کی نذر کردی ہیں! (ص:225-226)۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی اب بھی اچھی کہی جائے گی۔ اور کسی مبتدی و نوآموز کے قلم سے نکلتی تو بے شک قابل داد ہی ہوتی۔ لیکن ایم اے کے طالب علم کی امتحانی کاپی ایم اے ہی کے معیار سے جانچی جائے گی۔ ایم اے کے منتہی طالب علم کو ہائی اسکول کا مبتدی طالب علم کیسے سمجھ لیا جائے؟ - اچھی کتاب کے لیے محض ذہانت و شوخ نگاری اور چست فقروں کی فراوانی ہی سب کچھ نہیں، ایک بڑا درجہ محنت اور توجہ کامل کے لیے بھی مخصوص ہے- اور کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ محترم مصنف خود ہی نقاد کا قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھیں۔ اور اپنی کتاب کا درجہ و مقام اپنے ہی قلم سے متعین کریں۔ ٹی، ای، لارنس کے لیے آخر مشہور ہی ہے کہ اپنی کتابوں کا سب سے بڑا نقاد وہ خود تھا۔ مغرب کے جواب میں ایک نظیر، مشرق میں بھی قایم ہوجائے۔ اور زبانیں بے اختیار گنگنا اٹھیں۔

یار من با کمال رعنائی — خود تماشہ و خود تماشائی

صدق جدید، نمبر 35، جلد 2، یکم اگست 1952

(102) شروانی نامہ

از حاجی عباس خاں شروانی

ضخامت کچھ کم پانچ سو صفحے تقطیع 26x20 قیمت پانچ روپیہ، شروانی بک ڈپو، علی گڑھ

علی گڑھ و نواح علی گڑھ کے مشہور و معروف شروانی خاندان سے کون واقف نہیں؟ علم دوستی، دین پروری، ملت نوازی، شرافت شجاعت سخاوت، گویا اس خاندان کے شریفوں رئیسوں کی جائداد رہی بھیکم پور دتاولی، حبیب گنج، بلونہ، اور وہاں والوں کے کارناموں کا حصہ اگر نکال دیا جائے تو کالج اور یونیورسٹی، کانفرنس، جامعہ عثمانیہ اور ندوہ جیسے مرکزی ملی اداروں اور خانقاہ حافظیہ خیرآباد جیسی درگاہوں کے تذکرے کچھ ادھورے اور ناتمام سے نظر آنے لگیں گے۔ حاجی اسماعیل خان۔ نواب سر مزمل اللہ خاں۔ حاجی ابوبکر خاں، حاجی موسیٰ خاں، یونس خاں، حاجی مصطفےٰ خاں، صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں، حاجی صالح خاں، تصدق احمد خاں، ہارون خاں، عبدالرحیم خاں، حاجی محمد مقتدیٰ خاں کے ناموں کی شہرت خواص سے گزر کر عوام تک کہنا چاہیے کہ ہر طبقہ میں ماضی اور ماضی قریب اور حال کے ہر دور میں پہنچ چکی ہے۔

حاجی محمد عباس خاں صاحب (علیگ) ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر و مؤلف حیات مسعود غازی وغیرہ کا شمار خود بھی اس خاندان کے مشاہیر میں سے ہے۔ ان کا قلم تصنیف و تالیف کے میدان میں منجھا ہوا ہے۔ اور یہ ان کے قلم کا تازہ افادہ ہے اقلیم صحافت و نگارش کے ایک چھپے رستم مولوی حاجی مقتدیٰ خاں شروانی کی نظر ثانی کے بعد اور اس بوڑھے نوجوان کے قلم کی شوخ کاریاں ہزار چھپانے پر بھی نہیں چھپتیں اور ایک ایک صفحہ سے جیسے ابلی پڑتی، مچلتی پڑتی، امڈی آتی ہیں!

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ (1) شروانیان سلف۔ (2) شروانیان

حال(3) اور شجرے۔ اور ہر حصہ خاصی تفصیل کے ساتھ متعدد تحتانی عنوانوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور طرز بیان اتنا دل چسپ ہے کہ جو لوگ شروانی خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ وہ بھی کتاب کے مطالعہ میں اپنا جی لگتا ہوا پائیں گے۔ کتاب میں ذکر علاوہ علی گڑھ و اطراف علی گڑھ مالیر کوٹلہ اور کشمیر کے بھی شروانیوں کا ہے۔ لیکن ایک شاخ غالباً اس خاندان کی شاہ آباد ضلع کرنال (مشرقی پنجاب) میں بھی آباد ہے جس کے ایک نوجوان رکن عبدالجبار خاں شروانی مدتوں تبصرہ نگار سے، مراسلت کوئی 10، 12 سال ہوئے، کرتے رہے تھے اور قیام پاکستان سے ذرا قبل انجنیری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے تھے۔ اس شاخ کا ذکر سرسری نظر میں کتاب میں دکھائی نہ دیا۔

حال کے بعض بزرگوں (مثلاً حاجی صالح خاں مرحوم) کا سنہ وفات درج نہ ہونا، ایک اہم فروگزاشت ہے۔ اس طرح سنہ عیسوی دیتے دیتے بعض موقعوں پر صرف سنہ ہجری پر اکتفا کر جانا بھی ناظرین کے لیے تکلیف دہ ہے...... بہر حال کتاب بہ حیثیت مجموعی صرف شروانیوں ہی کے نہیں دوسروں کے بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ کاش اسی قلم سے بعض مشاہیر خاندان شروانی مثلاً صدر یار جنگ مرحوم اور نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی سوانح عمریاں نکل آتیں!

صدق جدید، نمبر 16، جلد 4، 19 مارچ 1954

(103) مشاہدات

از ہوش یار جنگ بہادر

16×544 صفحہ، ہوش یار جنگ بہادر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

آپ بیتی دلچسپ ہوتی ہی ہے۔ اور پھر جب لکھنے والا مشاق اہل قلم ہو تو دلچسپی میں چار چاند لگ جانا بالکل قدرتی ہے...... ہوش بلگرامی کا نام اردو کا ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے کچھ ایسا نیا یا نامانوس نہیں، یہ خودگزشت انھیں رنگین قلم مرصع رقم بزرگ کی ہے۔ ایک دنیا دیکھے ہوئے، حیدرآباد اور رامپور اور بھوپال اور خدا معلوم اور کس کس گھاٹ کا پانی پیے ہوئے۔ زمانہ کا اتار اور چڑھاؤ دونوں اپنی ذات پر جھیلے ہوئے...... کیا اچھا ہوتا، کہ کتاب کا ایک توضیحی نام سرورق پر ذرا باریک قلم سے یہ بھی درج ہوتا: ''ہوش کی کہانی - ہوش یار کی زبانی'' (املا ذہن میں رہے: ''ہوشیار'' نہیں۔ ہوش یار)

کتاب کیا ہے ایک کشکول ہے۔ آغاز زندگی 1892 سے لے کر جون 1950 تک 58 سال کی رنگارنگ زندگی کا سارا ہی نچوڑ اس میں آ گیا ہے۔ واردات نرم بھی گرم بھی، مشاہدات خارجی بھی داخلی بھی اور باتیں عموماً میٹھی، لیکن کہیں کہیں کڑوی بھی...... پیش لفظ اور دیباچہ کے بعد عنوان اول ''پیارا وطن'' ہے لیکن وطن سے مراد ملک ہندوستان نہیں بلکہ مولد قصبۂ بلگرام اور اس کے بعد 20 باب اور ہیں۔ میرا اسلامی مسلک، ''میرا سیاسی مسلک''، ''حیدرآباد دکن''، ''رامپور''، ''حیدرآباد دس سال کے بعد''، ''انقلاب کا پس منظر'' وغیرہا...... مصنف کا سیمابی قلم منطقی ترتیب کا کچھ زیادہ پابند نہیں۔ جو بات جہاں اور جس وقت بیساختہ یاد پڑ گئی، بس وہیں اور اسی لمحہ درج ہو گئی۔

مصنف کی آنکھ ایک شیعہ گھرانے میں کھلی، لیکن مشہور بلگرامیوں، ڈاکٹر سید

علی اور عماد الملک سید حسین کی طرح ان کی شیعیت بھی ''رفض'' کے مرادف نہیں، بلکہ یہ تو صلح واتحاد کے دوراہے پر کھڑے ہوئے وعظ کچھ اسی قسم کا کچھ کہہ رہے ہیں۔

''یہاں تک کہ جرائیں بڑھ گئیں ہیں کہ اسلام کا ایک فرقہ ان کو بھی برا بھلا کہنے میں بدنام ہے جن کو اگر وہ خلیفہ نہیں مانتا ہے تو ان کے صحابی ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ اور اس پر بوالعجبی یہ کہ وہ تبرا بازی کو مرتضوی محبت سے تعبیر کرتا ہے اور مدح وقدح کے قضیے کھڑے کر کے مسلمانی طاقت کو تو کمزور کر ہی چکا ہے۔ علیؓ کی شان میں گستاخیوں کا محرک ہوتا ہے۔ علیؓ کی حکیمانہ روش پر اگر ان کے متبع چلتے اور اگر کسی کی مدح نہیں کر سکتے تو قدح بھی نہ کرتے ...... جن کی حمایت میں ردوقدح کی جاتی ہے وہ تو خلافت کے ہر عہد سے تعاون کرتے رہے۔ خلافتی امور میں سب کو صحیح مشورے دیتے رہے ...... اور اپنے کسی عمل سے، اپنی زبان کی کسی جنبش سے یہ محسوس تک نہ ہونے دیتے کہ وہ ذات کسی کے مسند خلافت پر بیٹھ جانے سے آزردہ ہے یا ناراض''۔ (ص:30)

لیکن شاعر تو پھر شاعر۔ کہیں کہیں اس شریفانہ، مصالحانہ روادارانہ مسلک کی خلاف ورزیاں، گو خال خال سہی۔ کتاب کے اندر ہی موجود ہیں ...... ایک مستقل باب ''میرا سیاسی مسلک'' کے عنوان سے ہے۔ لیکن اس کے مجمل کنایات اور مبہم تصریحات سے کہیں بڑھ کر سو تصریحوں کی ایک تصریح یہ موجود ہے کہ کتاب پر پیش لفظ یو، پی کے راجیہ پال شری کنہیالال منشی کے قلم سے ہے! اور یہ ایک بلیغ ترین تصریح ہر دوسری تصریح سے بے نیاز کر دینے کے لیے کافی ہے۔ بہ قول شخصے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہوا!

رضا کاروں والے حیدر آباد، اور رضا کار تحریک کے لیڈروں کے سلسلہ میں بیسیوں نہیں، پچاسوں ورق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی صحت وعدم صحت سے یہاں بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اسے اتحاد المسلمین کے ہمدرد مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔

کتاب کے بہترین حصے وہ ہیں، جہاں ہوش صاحب نے اپنے گھر کے اور اندرونی مشاہدات ملک کے مختلف امیروں، رئیسوں سے متعلق زیب قلم کیے ہیں۔ ان کی رسائی ان درباروں سرکاروں سے گزر کران کی جلوت وخلوت کی ایسی مجلسوں تک رہ چکی ہے جہاں دوسروں کا گزر ہو نہیں سکتا۔ ان حصوں میں ان کے قلم کی گلکاریاں محض ادبی وانشائی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ تاریخی اعتبار سے قیمتی دستاویزوں کا کام دے سکتی ہیں۔ سابق نواب رامپور ہز ہائی نس سر حامد علی خاں کے نام ''نامی'' سے کون ناواقف ہوگا۔ ان کی تصویر کی ایک جھلک اس موقع پر ملاحظہ ہو۔

''یہ موسیقی کے مسلمہ ماہر مان لیے گئے تھے۔ پونا کے بھات کھنڈے ان کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ شام کلیان کی راگنی گلے سے اس طرح ادا کی اور ایسے سچے سروں میں اس راگنی کو فضا میں منتشر کیا، کہ کھنڈے کان پکڑ رہے تھے...... وزیر خاں کی بین کاری کے شہرے یورپ اور امریکہ تک میں تھے۔ شاگرد (ہز ہائی نس) بھی بین کاری میں اپنے استاد سے کچھ کم نہ تھے۔ یوروپین لیڈیاں ان کے ساتھ بغل گیر رقص کے لیے ٹانگیں اچھالتی رہتی تھیں۔ اور ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ انھیں کے ساتھ ناچیں یہ سب کو نچا نچا کر تھکا دیتے تھے اور خود تازہ دم رہتے تھے۔ یہ تو بتاسوں پر بنداری ناچ ناچتے تھے اور بچھے ہوئے بتاسوں پر پیروں کو اس طرح معلق رکھتے تھے کہ رقص بھی ہوتا رہے اور بتاسے بھی نہ ٹوٹنے پائیں''۔ (ص:106)

ایسے ''کمالات'' کی نقاشی آپ کو اور کس مرقع میں نظر آئے گی؟

سیرتیں اس مرقع میں محفوظ و منقش بہت سی نظر آئیں گی۔ خواص، عمائد، شاعروں، فاضلوں، لیڈروں، ایڈیٹروں ادیبوں سب کی ممتاز ترین و شریف ترین سیرتیں شاید یہ دو ہیں۔ ایک عماد الملک سید حسین بلگرامی دوسرے سر مہاراجہ کشن پرشاد شاد۔ سید کی سیرت کے لیے تو اصل کتاب ہی کبھی ملاحظہ فرمایئے گا۔ سر مہاراجہ کی کچھ جھلکیاں فی الفور نظر میں لے آیئے:

''موحد ہونے کی وجہ سے وہ ہر مذہب کا احترام کرتے تھے اور صوفیانہ

مشرب رکھنے کے سبب سے خواجہ اجمیریؒ سے خاص عقیدت تھی۔ اور اسی عقیدت کا اثر تھا کہ آپ نے اپنے بچہ کا نام خواجہ پرشاد رکھا تھا، جو ہندو رانی کے بطن سے تھا......
فیاضی ان کی سرشت میں تھی۔ اور داد و دہش ان کی فطرت تھی۔ جیبیں خالی کرنے کے لیے بھرتے تھے اور سوچتے رہتے تھے کہ آج کس کو دوں، اور اس طرح دیتے تھے کہ ہاتھ کو ہاتھ کی خبر نہیں ہونے پاتی تھی۔ اور دے کر اس قدر خوش ہوتے تھے کہ جیسے انھیں ساری کائنات مل گئی۔ انکار کے مفہوم سے ناواقف تھے۔ ''نہ'' کے لفظ سے ناآشنا تھے اور دبی زبان سے بھی کوئی عذر کرنا نہ جانتے تھے، بلکہ سوال کرنے سے پہلے دیتے تھے اور اپنی شان کا لحاظ رکھ کر دیتے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی کے احاطہ میں غریب غربا کی براتیں ڈھول تاشوں کی صورت بے ہنگام کے ساتھ اس لیے گزرتی تھیں کہ دولھا دلہن کو شال دوشالے اڑھائے جاتے تھے۔ ہاتھوں میں اشرفیاں دی جاتی تھیں۔'' (ص:438)

جو لوگ شخصیتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو قطعاً غیر دلچسپ اور مایوس کن نہ پائیں گے۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال، بیگم صاحبہ بھوپال، نواب رام پور، مہاراجہ الور، سر فیاض علی خاں، سر اسرار حسن خاں، سر علی امام، سر اکبر حیدری، مہاراجہ پرشاد سے لے کر فانی بدایونی، نیاز فتح پوری، مولانا سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی تک پچاسوں بلکہ سیکڑوں نامور اور گمنام اور بدنام شخصیتیں ان صفحات میں زندہ چلتی پھرتی نظر آجائیں گی۔ کاش مصنف نے بار بار غیر متعلق بحثوں میں پڑجانے کے بجائے اپنی ذہانت اور طباعی رئیسوں اور تاجداروں کی اندرونی زندگیوں کی مصوری تک محدود رکھی ہوتی! کتاب اس وقت لاجواب ہو کر نکلتی اور اللہ مصنف کی عمر و ہمت میں برکت دے، تو یہ موقع اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ وہ یقین رکھیں کہ یہ کام ان کے سوا کسی دوسرے کے کرنے کا نہیں۔

صدق جدید، نمبر 6، جلد 6، 6 جنوری 1956

(104) حیات آفتاب

از مولوی حبیب اللہ خاں صاحب

475 صفحہ، مجلد، قیمت آٹھ روپیہ، دفتر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آنریبل صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کا شمار چوٹی کے مشاہیر علی گڑھ میں تھا۔ کالج و یونیورسٹی کے ساتھ اخلاص وانہماک کے لحاظ سے وہ دوسرے سرسید تھے۔ اور کانفرنس کو پھیلانے چمکانے ترقی دینے، رونق بخشنے میں محسن الملک ثانی تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں کے ایک اعلا مقرر ایک خوش تدبیر منتظم، قانون وتعلیمات دونوں کے ماہر، ایک نامور بیرسٹر، ایک مخلص وسادہ مزاج کارکن اور پختہ عقیدہ کے مسلمان، یہ ساری حیثیتیں ان کی ذات میں مجتمع تھیں اور اس لحاظ سے چاہیئے تھا کہ ان کی ایک مفصل سوانح عمری عرصہ ہوا مفصل ہو کر شائع ہو چکتی۔ مدت دراز سے یہ قرض علی گڑھ کے ذمہ چلا آرہا تھا۔ مرحوم کا انتقال جنوری 1930 میں ہوا تھا۔ 25 سال گزر جانے کے بعد اب خدا خدا کر کے یہ قرض جوں توں اتر پایا ہے۔

باب اول مختصر سا مرحوم کے خاندانی حالات پر ہے، باب دوم تین فصلوں میں منقسم، تعلیم وتربیت پر ہے۔ باب سوم، بیرسٹری اور اس میں ناموری پر ہے۔ باب چہارم ص: (45 تا ص: 97) علی گڑھ کالج کی خدمات پر ہے۔ باب پنجم (ص: 98-167) خوب مفصل اور تین فصلوں میں منقسم ان کی خدمات کانفرنس پر ہے۔ باب ششم کا عنوان ''معاشرتی اور عام تعلیمی خدمات'' ہے۔ باب ہفتم (ص: 192 تا ص: 232) ''سیاسی خدمات'' پر ہے۔ باب ہشتم کا عنوان ''صاحبزادہ۔ صاحب انڈیا کونسل میں'' ہے۔ باب نہم (ص: 301 تا ص: 104) مسلم یونیورسٹی کی وایس چانسلری کے عنوان سے قدرۃً سب سے زیادہ مفصل ہے۔ باب دہم ذاتی حالات پر ہے۔ باب یازدہم ''مذہبی عقائد وخیالات'' پر ہے۔ باب دوازدہم ''علالت اور وفات'' پر اور باب

سیزدہم مرحوم کی یادگار آفتاب ہوسٹل اور آفتاب ہال پر ہے۔

صاحب زادہ صاحب مرحوم باوجود انگریزیت سے بہت متاثر ہونے اور باوجود اپنی ''صاحبانہ'' تعلیم و تربیت کے تھے بڑے پختہ عقیدہ کے مسلمان اور اپنے آخر زمانہ میں تو انھوں نے نہ صرف داڑھی رکھالی تھی بلکہ کالج کی مسجدوں میں صبح تڑکے جاجا کر اذان بھی دینے لگے تھے اور ایک مرتبہ تو شاید اپنے سفر ولایت میں جہاز پر بھی اذان دی تھی اور نماز کے پابند شروع ہی سے تھے۔

کتاب پر مصنف کی حیثیت سے نام مولوی حبیب اللہ خاں صاحب (ولایت منزل علی گڑھ) کا درج ہے۔ جو مرحوم کے مخلص ترین اور قریب ترین رفیقوں میں تھے۔ اور یوں بھی اپنی ذات سے ایک پیکر اخلاص و شرافت ہیں۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ وہ پیشہ ور مصنف نہیں اور مسودہ کی ترتیب و تسوید میں (جیسا کہ ''عرض حال'' میں تصریح ہے اگرچہ کئی کئی ساتھ شریک رہے لیکن ان میں سے کوئی بھی مشاق اہل قلم نہ تھا۔ اس صورت حال کا اثر قدرۃً کتاب پر پڑا ہے۔ پھر بھی کتاب جیسی کچھ ہے اپنے معلومات و مندرجات کے لحاظ سے بہت غنیمت ہے اور تحریک علی گڑھ اور صاحبزادہ صاحب کی شخصیت سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

صدق جدید، نمبر 13، جلد 6، 24 فروری 1956

(105) عطاء اللہ شاہ بخاری

ازشورش کاشمیری صاحب

228 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ۔

(106) ظفر علی خاں

ازشورش کاشمیری صاحب

282 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ۔

دفتر ہفتہ وار ''چٹان'' میکلوروڈ لاہور (پاکستان)

پنجاب مرحوم یعنی جس پنجاب میں مشرقی اور مغربی ہندوستانی اور پاکستانی کی تقسیم وتفریق نہ تھی۔ اس نے دو لیڈر چوٹی کے دو مختلف بلکہ مخالف کیمپوں میں پیدا کیے تھے۔ دونوں کے رنگ بھی الگ الگ۔ ایک ''سرخی شفق کی طرح لالہ زار'' سرخ پوشوں کی فوج کا سالار۔ دوسرا اس نیلگوں گنبد دوّار کے ہم رنگ نیلی پوشوں کا فوجدار! نقطہ مشترک دونوں میں صرف بے پناہ جوش وخروش، دونوں جذبات کے بحر مواج، دونوں مخالف کے حق میں تیغ بے نیام!

شورش صاحب اپنی اصل وفطرت کے لحاظ سے بہ یک وقت دونوں کے خوشہ چیں۔ ایک کے اگر دلدادہ نیاز آگین تو دوسرے کے گویا ولی عہد و جانشیں! خاکہ کے لیے ان کے موقلم کو یہ دو صورتیں خوب ہاتھ لگ گئیں۔ ''صورتیں'' کیوں ان کے مذاق صنم پرستی کی رعایت سے ''مورتیں''!

دونوں کتابیں نہ تاریخ وتذکرے کے تحت میں آتی ہیں نہ سیرت وسوانح کی صف میں۔ دونوں بس خاکے ہیں، ہلکے پھلکے۔ بڑے تکلف سے کھینچے ہوئے، مگر ایسا تکلف کہ جس کی تہ میں تصنع نہیں اخلاص ہی کارفرما ہے اور جس کی بنیاد پُرکاری پر نہیں۔

شاید بھولے پن ہی پر ہے۔

شورش صاحب اور جو کچھ ہوں بعد میں ہیں پلیٹ فارم کے خطیب سب سے پہلے ہیں اور اس سے کوئی بڑا فرق ان کے ''آرٹ'' میں نہیں پڑتا کہ وہ کام بجائے زبان کے قلم سے لے رہے ہیں۔ بس اسی نقطۂ نظر سے دونوں ''خطابیے'' پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔

تحقیق و تنقیح کے مرحلوں۔ استناد اور تاریخیت کے جھمیلوں کو ان کے قلم کی نازک خرامیوں سے زیادہ مناسبت نہیں کہیں اس معیار سے آپ نے دیکھنا شروع کیا تو عجب نہیں کہ تخیل کے کیمرے کے زور قناعت سے کھینچے ہوئے فوٹو آپ کو ''کیری کچر'' ہی نظر آنے لگیں۔ مثال کے طور پر عطاء اللہ شاہ کا ص: 135 کھولیے اور وسط صفحہ میں سر ولیم میور کی ''لائف آف محمد'' کا تعارف پڑھیے اور پھر اصل کتاب کا (اگر وہ دستیاب ہو سکے) ذرا سرسری سا مطالعہ کر لیجیے! اور اسی قبیل سے اسی صفحہ میں یہ بیان بھی ہے کہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی نے اپنے ترجمہ القرآن میں اولوالامر انگریزی حکومت کی اطاعت ثابت کی ہے یہ ظلم ان مرحوم پر معمولی ظلم نہیں ۔ حد شقاوت تک پہنچا ہوا ہے۔ ستم ظریفی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ظفر علی خاں کا انتساب ایک ایسی ہستی کے نام کیا گیا ہے جس میں 'سیمابیت'' نام کو بھی نہیں، بلکہ جو سرتاپا متانت و استقامت ہے۔

صدق جدید، نمبر 32، جلد 8، 11 جولائی 1958

(107) میر کی آپ بیتی

از نثار احمد فاروقی صاحب

192 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

مکتبۂ برہان، جامع مسجد، دہلی-6

میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری ذکر میر اب کوئی ایسی غیر معروف کتاب نہیں۔ یہ اس فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ شستہ، شگفتہ، سلیس، بامحاورہ۔ کتاب بجائے خود جیسی بھی ہو، یہ ترجمہ دلچسپ و پر لطف ضرور ہے۔ نہ ٹھیٹھ لفظی، نہ نرامُر ادی اور بالحاصل دونوں کے بین بین- بلکہ دونوں کا ایک خوش گوار مجموعہ۔

کتاب سے میر کے ذاتی اور نجی حالات کے علاوہ (جو درویشوں وغیرہ کے ذکر میں شاعری کی حد تک مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں) وقت کی تاریخ پر بھی اچھی خاصی روشنی پڑ جاتی ہے۔ خصوصاً دہلی کے آئے دن کے انقلابات اور مسلسل خونریزیوں اور بدامنیوں پر مترجم نے حاشیے کثرت سے دیے ہیں ان سے تاریخی وضاحتیں خوب ہو جاتی ہیں اور بعض ان میں سے خوب مفصل ہیں۔ البتہ ابدالی کی مدح میں نہیں ذم و قدح میں ان کا قلم جس روانی سے چلا ہے۔ (ص:112-114) وہ ان کے بااحتیاط قلم سے حیرت انگیز ہے۔

مفصل فہرست مضامین بڑی سہولت پیدا کرنے والی ہے۔ اور ابتدائیہ بھی خوب ہے، مقدمہ، مالک رام صاحب کے قلم سے ہے اور اپنی جامعیت، معنویت، حسن بیان، سب کے لحاظ سے بجائے خود قابل دید ہے۔

مترجم و مرتب نے سنہ ہجری کے ساتھ ساتھ سنہ عیسوی کی تاریخیں دینے کا التزام بہت ہی اچھا رکھا ہے، لیکن ص:173 و ص:175 پر خدا معلوم کیا چوک ہوگئی کہ حافظ رحمت خاں کی شہادت کی تاریخ صرف سن عیسوی میں دی ہے اور نواب

شجاع الدولہ کی وفات کی صرف سنہ ہجری میں! - زبان صحیح و صاف ہے - صرف ایک جگہ ''ہم جلیسی'' اور ایک جگہ ''حیل حجت'' کا استعمال، کل یہ دو لفظ زرا کھٹکے، بہ حیثیت مجموعی، کتاب اردو کے ستھرے، پاکیزہ، شریفانہ ادبیات میں ایک معقول اضافہ ہے۔

صدق جدید، نمبر 38، جلد 8، 22/اگست 1958

(108) جلال لکھنوی

از ڈاکٹر محمد حسن صاحب

240 صفحہ، قیمت درج نہیں۔ انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی-1

پچھلے دور کے شاعروں میں جلال ایک مرتبہء امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی استادی سب کو مسلم ہے۔ اعلا فن دان ہونے کے علاوہ بڑے خوش گو بھی تھے، اور یہ جامعیت کمتر ہی کسی کے نصیب میں آتی ہے۔

پیش نظر کتاب ایک مقالہ ہے، جو محمد حسن صاحب ایم اے نے ''جلال لکھنوی۔ سوانح حیات کلام پر تنقید۔ انتخاب کلام پر'' ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا تھا اور اس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے سند مل گئی۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے لیے جو مقالے لکھے جاتے ہیں خصوصاً اردو، فارسی، عربی پر اور جن پر عموماً سند مل بھی جاتی ہے، وہ اپنا ایک مخصوص سانچا رکھتے ہیں۔ اور اس خصوصی وضع وقطع کی چھاپ اس مقالہ پر بھی لگی ہوئی ہے۔ اگر پیش لفظ میں تصریح نہ ہوتی، جب بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ ''مشک آن ست کہ خود ببوید۔ الخ''

کتاب چار حصوں میں ہے۔ ذاتی حالات، شاعری، زبان دانی، اور انتخاب کلام۔ پہلے تینوں حصے خود تین چار بابوں میں تقسیم ہیں۔

مصنف نے تلاش اور محنت سے یقیناً کام لیا ہے اور بہت کچھ ان اوراق میں وہ جمع کر دیا ہے جو کسی دوسری جگہ شاید نہ مل سکے۔ لیکن ایسی کتاب، اور وہ بھی جلال جیسے صاحب فن اور اہل زبان پر اچھی کتاب اپنے مولف سے تلاش وتعب کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کی طالب تھی۔

ایک نازک مرحلہ ایسی کتابوں میں معاصرین کا معاملہ ہوتا ہے۔ اپنے ہیرو کو ان سے بڑھایئے جتنا چاہے، لیکن اس کا لحاظ بھی اپنے امکان بھر رہے کہ ان

معاصرین کی اہانت و ہتک کا کوئی پہلو نہ نکلنے پائے۔ مولف اپنی کتاب کی زبان بھی پر غور و نظر ثانی کے بعد بہتر اور جلال کے شایان شان بنا سکتے تھے۔ تماشہ دیکھا کے بجائے ''تماشہ کیا'' نہیں کے موقع پر ''نہ'' اور ''کافی'' کا استعمال ''بہت'' کے معنی میں۔ یہ اس قسم کی اور بھی چند چیزیں طبع ثانی کے وقت توجہ کی محتاج ہیں۔

جلال پر اب بھی یہ کتاب اپنے رنگ میں شاید ایک ہی ہے۔

صدق جدید، نمبر 44، جلد 8، 3/ اکتوبر 1958

(109) تلامذۂ غالب

ازمالک رام صاحب۔ ایم اے

324 صفحہ، مجلد، قیمت ساڑھے سات روپے

مرکز تصنیف وتالیف، نکودر، پنجاب (ہند)۔ آزاد کتاب گھر، اردو بازار، دہلی۔

مالک رام صاحب اب غالب و غالبیات پر سند (اتھارٹی) کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُن کے قلم کا تازہ ترین افادہ تلامذۂ غالب ہے۔

موضوع نہ کسی شرح کا محتاج نہ تشریح کا، نام سے بالکل ظاہر ہے۔ کتاب غالب سے نسبت شاگردی رکھنے والے 146 شاعروں کے نام اور حالات کی جامع ہے۔ یہ خاصی بڑی فہرست بھی چاہے مکمل نہ ہوا! (اور مصنف نے دیباچہ میں کچھ ایسا لکھ بھی دیا ہے) تاہم کہیں اور تو اتنی بڑی فہرست بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کلام کے نمونے بھی ساتھ ساتھ درج ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ، اور رنگ کلام پر تبصرہ اس پر مستزاد۔ وہ بھی اکثر چنچا تلا، ماہرانہ۔ یہ تو رہا متن۔ اب اس پر اضافہ حاشیہ کی 29 شخصیتوں کا اور کیجیے۔ غالب یا غالب والوں سے کوئی نہ کوئی رشتہ اور رابطہ رکھنے والیاں۔ ان کی رنگا رنگی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ چند نام سن لیجیے۔

حضرت شاہ غوث علی پانی پتی۔ سرشانتی سروپ بھٹناگر، ذکی مراد آبادی، مائل دہلوی، مفتی آزردہ، مرزا قتیل، داغ، رسا رامپوری، خواجہ غلام غوث بے خبر۔

شاگردوں میں نام ایسوں کے بھی نظر آتے ہیں جو آگے چل کر خود بھی استاد بلکہ بعض تو استادوں کے استاد کہلائے، مثلاً شیفتہ، حالی، رشکی، مجروح، انور، سالک، سخن، اسمٰعیل میرٹھی، قدر بلگرامی، عزیز صفی پوری۔ اور ضمناً ایک انکشاف یہ بھی ہو رہا ہے کہ شاگرد سب مسلمان ہی نہ تھے خاصی تعداد میں ہندو بھی تھے۔ مثلاً شیو نرائن آرام، ہرگوپال تفتہ، جواہر سنگھ جوہر، بال مکند بے صبر، کوئی پندرہ نام تو صراحت کے

ساتھ آ گئے ہیں۔کلام کا انتخاب جو کتاب بھر میں پھیلا ہوا ہے۔عموماً و بیش تر خوب ہے اور مصنف کے ذوق سلیم کا آئینہ دار۔ اور پھر کلام پر جو تبصرہ کرتے گئے ہیں لطیف و سبک، دلکش و بلیغ، وہ تو وقت کے بہت سے پیشہ ور نقادوں کے لیے کام پورے سرمۂ چشم بصیرت کا دے سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ تنقید کا نام لے کر ایک اکھاڑا مجادلہ و مناقشہ کا قائم کر دیا اور بھاری بھرکم اصطلاحیں باہر سے لالا کر مضمون کو ایسا ثقیل در ثقیل کرتے چلے گئے کہ آخر میں وہ ایک گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔

ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

اور پڑھنے والا سر پیٹ کر رہ گیا، کہ اپنے پلّے تو کچھ بھی نہ پڑا۔ بجز چند فنی اصطلاحوں کے!

تصویروں کا اہتمام خصوصی بھی قابل ذکر ہے۔

سنہ و تاریخ کا التزام بھی قابل داد ہے۔ خصوصاً یہ کدو کاوش حتی الامکان سنہ عیسوی اور سنہ ہجری دوش بدوش چلیں! - اور لیجیے اس جرات مندی کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے کہ ''ہنگامہ 1857'' کتاب بھر میں ''ہنگامہ 1857 ہی ہے'' ''پہلی جنگ آزادی'' نہیں - اور عہد انگریزی کے خان بہادر، اور رئیس رجواڑے سب عزت و شرافت ہی کے جامے میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ''ٹوڈی'' اور ''ٹوڈی بچے'' اور غداران وطن کے پتھراؤ سے ان کے حلیے بگاڑ دیے گئے ہوں - مذہبی عقیدے بھی قسم قسم کے، قدرۃً معرض بیان میں آئے، مصنف کے رکھ رکھاؤ نے تعصب تو خیر دور کی چیز ہے، اتنا بھی پتا نہیں چلنے دیا ہے کہ خود ان کا گوشۂ چشم مسجد و مندر میں سے کس جانب ہے۔

سکتر کا لفظ انگریزی کے سکرٹری کی جگہ ہمارے قدیم ادب میں اچھا خاصہ چل پڑا تھا، مگر پھر جو زبان پر ''صاحبیت'' نے دھاوا بولا، تو ''سکریٹری'' کیا معنی ''سکرٹری شپ'' اور ''سکریٹریٹ'' سبھی اردو میں دھنس پڑے۔ مالک رام کا مالک بھلا کرے کہ انھوں نے ''سکتری'' کو پھر اس کی چھینی ہوئی جگہ پر بحال کر دیا۔ (ص: 22 مکرر) - تین سوا تین سو صفحہ کی اردو کتاب میں کل دو لفظوں کا استعمال ذرا غریب و

نامانوس سا معلوم ہوا:

(1) صفحہ 9، س۔ اور صفحہ 215 وسط میں ''ترجمہ'' تذکرہ یا سوانح عمری کے معنی میں۔

(2) صفحہ 218 (اخیر) ثمرہ یا حاصل کے بجائے نتیجہ اس فقرہ میں۔
''اس نکاح کا نتیجہ دو صاحبزادے تھے''۔

بہ حیثیت مجموعی کتاب ادبی، شعری، سوانحی اعتبار سے اگر قابل دید ہے تو سلاست بیان اور شرافت وسلاست ذوق کے معیار سے قابل تقلید۔

صدق جدید، نمبر 49، جلد 9، 6 نومبر 1959

(110) ابوالکلام آزاد

224 صفحہ مع متعدد تصاویر۔ قیمت......

پبلیکیشنز ڈویژن۔ منسٹری آف انفارمیشن (وزارت اطلاعات) نئی دہلی۔

کتاب پر مصنف یا مرتب کا نام درج نہیں۔ سرکار ہند کی وزارت اطلاعات کے شعبۂ اردو کی تیار کی ہوئی ہے۔ جس کے سرکردہ جگن ناتھ آزاد صاحب ہیں۔ [آزاد پر کتاب ایک دوسرے آزاد ہی کے قلم سے!]

کتاب کا کوئی مرتب ''کتاب'' نہیں۔ صرف متفرق مضامین مختلف قلموں سے لکھے ہوئے، اور متعدد دماغوں سے نکلے ہوئے، کا مجموعہ ہے، زیادہ تر نثر میں اور کچھ منظوم ــــ عقیدت کے ہاتھوں نے رنگ بہ رنگ پھولوں کو جوڑ کر ایک خوشنما و دیدہ زیب گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ ایک آدھ مضمون انگریزی سے ترجمہ ہو کر بھی آیا ہے۔ قدرتاً یہ کتاب، سیرت یا سوانح عمری کا کام نہیں دے سکتی۔ پھر بھی مرحوم کی زندگی کی جھلکیاں اچھی خاصی ان اوراق میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

مضامین سب کے سب معتقدوں اور مداحوں کے قلم ہی سے ہیں اور بعض شاید ایسے بھی ہیں۔ جو مولانا کی وفات کے معاً بعد تحریر ہوئے ہیں۔ اور اس لیے قدرتاً ان میں جذبات و تاثرات کی شدت بھی موجود ہے اور واقعات کی تحقیق و استناد کی طرف پورا التفات قائم نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً مہر صاحب کے قلم سے مولانا کی سیر چشمی اور خود داری کی مثال جو حکایت ایک رئیس کا عطیہ واپس کر دینے کی۔ صفحہ 155 تا صفحہ 157 بڑی تفصیل سے درج ہے۔ وہ مزید ثبوت کی محتاج تھی۔ 1912 میں جب یہ ذکر الہلال میں پہلی بار آیا تو اس وقت اس پر بڑی قیل و قال ہو چکی ہے ــــ الندوہ کی اڈیٹری کی حیثیت بھی تمام تر افسانوی ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شخص کی طرح مولانا کا بھی ایک دور آخر نو عمری اور نو مشقی کا بھی رہا ہے اور عمر و مشق کے اس دور میں الندوہ کی

مضمون نگاری ہی بڑے امتیاز و افتخار کی چیز تھی۔

بعض مضامین بڑے بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں۔ مثلاً ملیح آبادی صاحب کے قلم سے مولانا کا فقر و فاقہ پر، واقعی اب تک لوگ مولانا کی سیرت کے اس روشن و تابناک پہلو سے بے خبر تھے۔ حافظ علی بہادر خاں صاحب کا مضمون بھی۔ مولانا کی جیل کی زندگی پر بھی اپنی تصریحات سے اور اس سے بھی بڑھ کر بین السطور سے روشنی ڈالنے والا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، خان بہادر ظفر حسین خاں، محمد اجمل خاں صاحب کے مضامین اور حمیدہ سلطان صاحبہ کا مضمون بیگم آزاد پر، یہ سب پڑھنے کے قابل ہیں۔ حصۂ نظم میں یحییٰ اعظمی صاحب کا مرثیہ شاعرانہ اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ظفر حسین خاں صاحب نے نفسیاتی دقّت نظر سے کام لے کر مولانا کی سیرت کا جوہری خلاصہ ان لفظوں میں پیش کر دیا ہے کہ:

> ''غور کیجیے تو ان کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی ان کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا---- مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازے سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے۔ جنھوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صف اول میں کھڑا کر دیا۔ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت ان کی انشاء پردازی کی رہین منت ہے۔ اور یہی کہنا چاہیے ان کا اصلی جوہر ہے۔'' (صفحہ 19)

بالکل آخری صفحہ پر جو سادہ اور سنہ وار فہرست واقعات زندگی کی درج ہے وہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔ 1905 میں ازہر (قاہرہ) تعلیم کے لیے جانے اور 1907 میں وہاں سے واپس آنے کی مدیں تو بہر حال قابل اخراج ہیں۔ ہندوستان سے اس وقت باہر جانا ہی معرض گفتگو میں ہے۔ اسی طرح ابتدائی زمانے میں الندوہ میں مضمون نگاری اور اس زمانے کے بعد سہ روزہ وکیل (امرتسر) کی ایڈیٹری درج ہونے سے رہ

گئی ہے ___ تبصرہ نگار بہرحال مسلمان ہے اور اسے یہ دیکھ کر قدرتاً تاسف ہوا کہ کسی ایک مضمون نگار نے بھی مولانا کی دینی زندگی کا نقشہ، تفصیلات کیا معنی اجمالاً بھی پیش نہ کیا۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی ایک بہت بڑے حلقے کو اپیل کرنے والی ہے۔ اور یقین ہے کہ اس حلقے میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

صدق جدید نمبر 51، جلد 9، 16 نومبر 1959

(111) شاہراہ پاکستان
از چودھری خلیق الزماں

کتاب میرے پاس یا صدق میں تبصرہ و تعارف کے لیے موصول نہیں ہوئی محض اتفاقیہ ایک جگہ سے ہاتھ لگ گئی۔ پڑھ کے دل نہ مانا کہ صدق کی برادری کو اس کے ہلکے تعارف سے بھی محروم رکھا جائے .... کتاب کا نام ہے شاہراہ پاکستان اور مصنف ہیں چودھری خلیق الزماں یکے از بانیان پاکستان۔ ضخیم اور خوب مفصل۔ ضخامت 1113 صفحہ کی۔ قیمت مجلد 25 روپے۔ ناشر انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی۔

اس کا انگریزی ایڈیشن Path way to Pakistan کئی سال ہوئے دیکھنے میں آیا تھا اس سے کہیں زیادہ ضخیم و مفصل اور دلچسپ بھی اس سے کہیں زائد۔ آخر میں انڈکس نہیں ہے لیکن شروع میں فہرست مضامین اتنی طویل ہے کہ انڈکس کی ضرورت بھی چنداں باقی نہیں رہ پاتی۔ کتاب ایک ہی وقت میں چودھری صاحب کی اپنی سرگزشت بھی ہے اور ملک کی سیاسی و عصری تاریخ بھی۔ گویا 1907 سے لے کر اگست 1947 تک یعنی پاکستان وجود میں آجانے تک بلکہ 28 رجنوری 1948 کے اہم ترین واقعہ گاندھی جی کے قتل تک پاکستان کی حکومت یا اندرونی سیاست سے اس کا مطلق تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان ہی کی سیاست میں ختم ہوگئی ہے۔

ایک دلچسپ پیش لفظ اور دلچسپ تر افتتاحیہ کے بعد جس میں انھوں نے قوم وملت کو موضوع گفتگو رکھا ہے۔ شروع میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور اپنے شہر لکھنؤ کی ثقافتی و سیاسی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اور اس کے بعد براہ راست سیاسیات میں در آئے ہیں اور اس میں دونوں متوازی سیاستیں شامل ہیں ایک طرف مسلمانوں کی ملی سیاست، دوسری طرف عام ملکی و کانگریسی سیاست بھی۔ خدام کعبہ اور جمیعت

العلماء کا ذکر تو اجمالاً ہی آیا ہے۔ باقی علی گڑھ خلافت کمیٹی، کانگریس، سوراج پارٹی، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، مسلم یونٹی بورڈ، مسلم لیگ، مجلس احرار، ٹرکی کے طبی وفد، ولایت کے وفد، خلافت، لکھنؤ میونسپل بورڈ، انٹرم گورنمنٹ، کرپس مشن اور فیصلہ تقسیم ہند تک چھوٹا بڑا شاید ہی کوئی سیاسی موضوع ایسا ہو جس پر روشنی ان اوراق میں نہ ڈالی گئی ہو۔ اسی طرح شخصیتوں، گاندھی جی، سرسید، محسن الملک، وقار الملک، ہزہائینس آغا خاں، مہاراجہ محمود آباد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، شوکت علی، محمد علی، ان کی بیگم اور والدہ، ابوالکلام، تصدق احمد خاں شروانی، حسرت موہانی، جناح، لیاقت علی خاں، پنڈت موتی لال، جواہر لال نہرو، پٹیل، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، نواب حمید اللہ خاں، غلام محمد، سرعلی امام، نواب چھتاری، سر وزیر حسن، نسیم صاحب، وسیم صاحب، شاید کوئی اوسط درجہ کی بھی شخصیت چھوٹنے نہیں پائی ہے۔

کتاب حد درجہ دلچسپ ہے اور جس درجہ دلچسپ ہے اسی قدر پر معلومات بھی۔ کہنا چاہئے کہ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے مخالف و موافق سبھی کے پڑھنے کے قابل، نکتہ چینیاں تو سبھی پر ہیں، یہاں تک کہ مولانا محمد علی پر ان سے کہیں بڑھ کر خود مسٹر جناح پر، لیکن بڑی بات یہ ہے کہ قلم پر قابو ہر جگہ رکھا ہے اور کسی پر ذاتی حملہ کے تو قریب بھی نہیں گئے ہیں۔ ہندو لیڈروں میں دل کھول کر داد گاندھی جی کو دی ہے اور پھر پنڈت موتی لال کو بھی (جواہر لال نہرو کو نہیں) اچھا خاصا سراہا ہے۔ ذاتی حیثیت سے مولانا محمد علی کو بھی اونچا رکھا ہے اور ان کے اخلاص، اسلام دوستی، عشقِ رسولؐ کو خوب بیان کیا ہے لیکن سیاسیات میں ان کو اپنے امام کا درجہ نہیں دیا ہے------ اور اپنے اخلاص نیت کا یقین بار بار ناظرین کو دلایا ہے اور اس طرح کے فقرے جا بجا ملتے ہیں کہ کتاب بطور توشہ آخرت لکھی گئی ہے اور اس میں غلط بیانی سے ہر ممکن احتیاط کی گئی ہے"------ جزئیات کی تفصیل میں بعض جگہ نوبت ہندی کی چندی نکالنے کی آ گئی ہے۔

چودھری صاحب کوئی پیشہ ور مصنف نہیں اس لیے اسلوب بیان اور محاورات روزمرہ میں اگر جا بجا لغزشیں اور خامیاں نظر آئیں تو قابلِ نظر انداز کر دینے کے ہیں۔ اور شکر ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ املے کی غلطیاں البتہ ذرا تکلیف دہ ہیں مثلاً ''مسلح'' کے بجائے ''مصلح''۔

سیاسیات تو خیر مصنف کا فن ہی ہے۔ باقی اور چیزیں جو انھوں نے محض ضمناً ذکر کی ہیں مثلاً ہندو مذہب کے عقائد سے متعلق۔ ان میں بھی وہ محض اناڑی نہیں ثابت ہوئے ہیں------ کتاب کے بعض حصے خاصے دردانگیز اور موثر بھی ہیں۔

کتاب کا خاتمہ ڈرامائی انداز میں جس عبارت پر ہوا ہے وہ نہ قرآن مجید کی کوئی آیت ہے نہ مولانا روم کا کوئی شعر بلکہ مسلمانوں کے ایک معلوم ومعروف مہربان سردار پٹیل کا یہ قول جو انھوں نے 26/جنوری 1948 کو لکھنؤ کے ایک جلسۂ عام منعقدہ امین الدولہ پارک میں فرمایا تھا ''پاکستان کا بنانے والا اس شہر کا باشندہ تھا مگر ان کی امیدوں کے خلاف ان کو چھوڑ کر پاکستان چلا گیا''۔

صدق جدید نمبر 35 جلد 20 مورخہ 22/مئی 1970

(112) یادوں کی برات (از جوش ملیح آبادی)

(1)

جوش صاحب ملیح آبادی ثم پاکستانی کا شمار وقت کے مشہور بلکہ نامور شاعروں میں ہے اور زبان پر انھیں عبور ہی نہیں کہنا چاہیے کہ حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے۔ علاوہ شاعری کے لغت کا کام بھی اچھا خاصا کر سکتے ہیں بلکہ ایک بڑی حد تک انجام دے چکے ہیں، اب انھوں نے خدا معلوم کن نادان مشیروں کے کہنے سننے میں آکر اپنی ایک آپ بیتی ساڑھے پانچ سو صفحات کی ''یادوں کی برات'' کے نام سے لکھ کر شایع کر دی ہے...... یہ برات اگر ہے تو کسی شریف مہذب نستعلیق شہری کی تو نہیں البتہ اجڈ اور دیہاتی گنواروں کی تو ہو سکتی ہے جو ٹھرّا، دارو، مہوے کی شراب پیئے گالی بکتے، جھکتے چلے جاتے ہیں اور ان کے جسم ہیں ربوئے فحش کے بھبکے چھوڑتے جارہے ہیں۔ عین مین ایک دیہاتی فاحشہ اپنے خریداروں کے جمگھٹ میں ؎

آگے وہ اور پیچھے یار فوج کی فوج
دھیگا مشتی کسی سے گالی گلوج

''برات'' اگر اس کا نام ہے تو تف ہے ایسی برات پر...... موزوں نام ہوتا ''یادوں کی کوڑا گھار''۔

ابواب کتاب کی ترتیب نہ تاریخی ہے نہ منطقی نہ نفسیاتی بس جو واقعہ جہاں بھی یاد پڑ گیا بس وہیں اسے ٹانک دیا ہے حافظہ جوش صاحب کا کسی زمانے میں جیسا بھی رہا ہو اب اس سن میں تو شاید بادہ خواری کی برکت سے اچھا خاصا جواب دے چکا ہے اور نام شخصیتوں کے ہوں یا جگہوں کے ان کی مٹی اچھی خاصی پلید کی ہے۔ لکھنؤ کے دو پرانے ہوٹل امپیریل اور برلنگٹن لکھے ہیں۔ امپیریل کے نام سے تو کوئی ہوٹل اس وقت لکھنؤ میں نہ تھا، رائل البتہ تھا اور برلنگٹن نام بھی بہت بعد کو پڑا ہے۔ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت وہ سول اینڈ ملٹری ہوٹل تھا۔ شہر کی ایک معزز ہستی جوش

صاحب کے قلم ہجو رقم کا خاص ہدف رہی ہے مولوی نظام الدین حسن۔ یہ نام ہر جگہ ناظم (الدین حسن) کی شکل میں آیا ہے۔ وہ بیرسٹر نہ تھے، وکیل تھے اور نہ ان کی کوٹھی ہر وقت ''موکلوں'' سے گھری رہتی تھی...... حافظہ اب بغیر سہارے کے چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ نتیجہ دانستہ اور نادانستہ بے تحاشہ غلط بیانیوں کے باعث یہ نکلا ہے کہ تضحیک اکثر خود اپنے ہی اوپر پلٹ پڑی ہے اور دوسروں پر ٹھٹھے مارنے والا اور تالیاں پیٹنے والا خود ایک اضحوکہ بن گیا ہے۔

زبان بہ حیثیت مجموعی اچھی اور بہت اچھی ہے اور ان کے سے ادیب کے شایان شان، اور بعض ٹکڑے تو بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال...... لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے اور جو ٹکڑے خوش وقتی کے وقت میں لکھے ہیں وہ اختلال حواس کی نظر ہو گئے ہیں۔ جیسے کہ ہر شرابی اور نشہ باز کے ہونے بھی چاہئیں۔ ان پر بے تکلف حکومت، تصنع اور تکلف کی قائم ہو گئی ہے اور کہیں کہیں لفظ قلم سے غلط نکل گیا ہے۔ مثلاً ص ۲۹۵ پر بجائے نفس امارہ کے ''نفس لوامہ'' اور دھومیں کا قافیہ گھومیں۔ دھوم تو صحیح ہے لیکن اس کے جوڑ پر گھوم بطور اسم کے پڑھنا اور پھر اس کی جمع بنانا تمام تر من گھڑنت اور ایجاد بندہ اگرچہ گندہ ہے۔ ترکیبوں اور محاوروں میں کہیں کہیں تو بے شک جدت، ندرت، تازگی حلاوت ہے لیکن کہیں کہیں غرابت اور بھدا پن ہے مثلاً بارش کے لیے بجائے رم جھم کے ''روم جھوم'' یا پانی کا ''جھوم جھام'' کے برتا یا ہنیا پانی کے بجائے ''پیٹے کا پانی'' یا ''اندھیرے'' کی جگہ ''اندھیارہ'' یا گوڑیت (دیہاتی چوکیدار) کے بجائے گوڑ'' (ص 171)۔

متانت تحریر کا ابتدائی مطالبہ یہ ہے کہ مخالف اگر معزز ہے تو اس کا نام بے تمیزی سے نہیں تہذیب و شائستگی کے ساتھ آئے۔ اس دربار میں اگر ممتاز عالم اہل سنت مولانا عبدالشکورؒ آ جاتے ہیں تو اس طرح کہ گویا کوئی پیادہ ان کی گردن میں ہاتھ دیئے ہوئے۔

''مولوی عبدالشکور کے چندر گرگے''

''حکومت نے لکھنؤ کے ایک سنی مولوی عبدالشکور کو بھنڈی بازار پر مامور کر

دیا تھا اور اس غداری کے صلہ میں وہ گھر بیٹھے وظیفہ پاتے تھے۔"

یہ "رافضیت" ہوتو ہو۔ باقی کسی محض شیعہ یا امامیہ کی بھی تحریر نہیں ہوسکتی۔

قلم بے تحاشہ گالی بکنے کا آدی ہے اور جب کوئی جاندار گالی کھانے کو نہیں ملتا تو وہ کسی بے جان مثلاً موسم ہی پر ابل پڑتا ہے۔ موسم گرما کا ہر یالا ذرا ملاحظہ ہو:

"شیاطین کی آنکھوں کا تارہ، لو کا راج دلارا، الاؤ کا گہوارہ اور شعلوں کا فوارہ، خونی ریچھ۔ لاگو بھیڑیا اور بنڈیلا سور...... مغضوب، مبغوض، معتوب...... اس چنختے چمار موسم میں جب حرام زادی لو کے جھکڑ......" (ص 46)

یہ ادب و انشا کے سکے ڈھل رہے ہیں یا ملیح آباد کے خاں صاحب اپنی بد نصیب رعایا کی مرمت جوتوں سے کر رہے ہیں۔

فرشتوں کا ذکر جس ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے عجب نہیں کہ ابولہب کا ہم زاد آج جھوم جھوم پڑے۔

"ساتویں جہنم کے گندے فرشتے"۔ ص 46

کیا بلاغت ہے! مکرر ارشاد ہو۔

فحش پسندی، قلم کی ہر جنبش پر غالب ہے۔ شاعرانہ تشبیہ بھی سوجھتی ہے تو پھکڑ قسم کی پھبتی ہو کر، لکھنؤ کی نئی سواری رکشہ پر شاعر کو سخت پیچ و تاب ہے۔

[یہ رکشے] ایسے ہیں کہ اگر ان پر سکندر اعظم تک کو بٹھایا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے"۔ (ص 71)

انتہائی عظمت کے موقع پر نام سکندر اعظم کا ذہن میں آنا شاعر انقلاب کو مبارک ہو!

شاعر کے معتوبوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ کیا ہندوستان اور کیا پاکستان میں سر سید احمد خاں، آصف جاہ سابع، میر عثمان علی خاں، حیدری صاحب، ممتاز حسین، عبدالحق بابائے اردو، شان الحق حقی، فیلڈ مارشل ایوب خاں، الطاف گوہر وغیرہ۔ اور جو محبوب ہیں وہاں بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب سے بھی کوئی بڑا ہے۔ سب ان سے دبے ہوئے، لچے ہوئے، ان کے سامنے جھکے

ہوئے یہاں تک کہ جواہر لال نہرو کے سر پر بھی پرچم جوش صاحب کی انانیت کا لہرا رہا ہے...... اور کتاب میں جن انگنت شخصیتوں کا ذکر ہے ان میں مظلوم ترین اور صابر ترین شخصیتیں تو دو نظر آتی ہیں۔ ایک نظام دکن مرحوم اور دوسری جوش صاحب کی رفیقۂ حیات۔ جنھیں جوش صاحب بے شمار چرکے دے چکے ہیں اور جو جوش صاحب کی بے شمار جھوٹی قسموں کا یقین کر کے یا یقین نہ کر کے بہر صورت اپنی زندگی کے دن ہر شریف خاتون کی طرح خاموشی ہی کے ساتھ جوش صاحب کے ساتھ نباہ رہی ہیں۔

انانیت کے ساتھ دو زبردست عفریت یا کالے دیو کتاب کے صفحہ صفحہ پر موجود ہیں۔ ایک شراب نوشی دوسرے فحش کاری، شرابی ہونا تو گویا کسی درجہ کا عیب نہیں، اسلام کے دینی معیار کو چھوڑیئے۔ مسلمانوں کے دینی وثقافتی نقطۂ نظر سے بھی نہیں۔ اور شرابی ہو کر انسان مسلم معاشرہ میں بے کھٹکے اور بغیر کسی خوف و اندیشہ کے گزر سکتا ہے۔ شرابی صرف جوش صاحب ہی نہیں بلکہ فلاں دوست اور فلاں عزیز کہنا چاہیے کہ سب ہی اس حمام میں ننگے ہیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مسلم شریف برادری میں کوئی بے عزتی کوئی ذلت بھی شراب کے خم لنڈھانے میں ہو سکتی ہے۔ پھنکارتے جایئے پیالے پر پیالہ چڑھاتے جایئے۔

(2)

شراب نوشی سے بڑھ کر دوسرا عذاب جو جوش صاحب نے قوم وملت کے سر پر نازل کیا ہے وہ فحش کاری اور حرام کاری کا بے دھڑک اور بے جھجھک پروپیگنڈا یا پرچار ہے اور ڈھٹائی اس سلسلے میں اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ کئی صفحوں میں اپنی شوہر دار اور شادی شدہ داشتاؤں کے آدھے آدھے نام اور پتے تک لکھ ڈالے ہیں۔ فلاں گھر میں رات کے اندھیرے میں یوں پھاندا فلاں حویلی کے بالا خانے پر دربان یا مغلانی کو ملا کر یوں رسائی پیدا کی۔ خود ہی ایک جگہ مصنوعی غصہ کے ساتھ یہ لکھا ہے ''دولت والے شریف بہو بیٹیوں پر سانڈ کی طرح...... بیٹھتے ہیں'' خدا معلوم یہ فقرہ لکھتے وقت اپنی تصویر کہاں نظر سے غائب ہو گئی تھی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے مظلوم دلوں کی آہیں

اور کتنے مجروح دلوں کی کراہیں ان اوراق کو پڑھ کر بلند ہوں گی اور عرشِ الٰہی سے ٹکرائیں گی! کس کس فخر و تعلّی کے ساتھ اپنے ایک ایک معاشقہ کے جزیات کو بیان کیا ہے اور ایسے ایسے موتی پروئے ہیں کہ جاہلیتِ عرب کا بدنام سے بدنام شاعر اپنا منھ پیٹ کر رہ جائے گا!......اس کھلے ہوئے شہد پن اور اوباشی کو عشق سے تعبیر کرنا کیسا ظلم عظیم اس لفظ پر ہے۔ بے شمار نوجوان مرد اور عورتیں (جن میں شاعر صاحب کی پوتیاں اور نواسیاں اور آئندہ نسلیں بھی شامل ہیں) ان ملفوظات کو پڑھ کر کس قدر بگڑیں گی اور کس طرح درس عمل حاصل کریں گی؟ ان کی طرف کبھی شاعر صاحب کا ذہن گیا ہے!

انانیت، شراب نوشی، حرام کاری کی افراط کے بعد پھر جو جگہ باقی رہ گئی ہے وہ کذب بیانیوں اور جھوٹی قسموں کی نذر ہوئی ہے اور جھوٹی قسموں کو اس طرح سجا کر اور اس سج دھج کے ساتھ پیش کیا ہے کہ گویا یہ بھی کوئی دلکش اور دلپذیر فنِ لطیف ہے کہ نوجوانوں کو چاہیے کہ اس کی طرف اپنی جھولیاں لے کے دوڑیں اور زر بے بہا جتنا بھی مل جائے اس سے اپنی جھولیاں بھر لیں۔ زیٹ پر زیٹ یہ زٹل قافیہ، یہ رجز خوانی آج جو کچھ بھی کام دے جائے۔ ''کل'' جب کشف حقائق کا وقت ہوگا کچھ جوش صاحب نے سوچ رکھا ہے اس وقت کے لیے؟ کیا جواب ہوگا اس سوال کا کہ ہزاروں بے گناہ جو تمہاری اس تحریر سے بگڑے اور اپنی زندگی اس سے تباہ کر لی اس کی ذمہ داری کس پر ہے اور کون یہ سارا وبال بھگت کر رہے گا۔

شوخیاں سب ہی لڑکے کرتے ہیں اور علی گڑھ کے لڑکے تو اپنی شوخیوں کے لیے کچھ زیادہ ہی مشہور ہیں۔ اب ایک نمونہ جوش صاحب کی شوخی کا سنیے۔ خیر سے کچھ دن آپ نے علی گڑھ اسکول میں پڑھا ہے۔ کسی درجہ میں تھے کہ آپ سے اور سب پراکٹر مظہر علیم مرحوم سے کسی ناگفتہ بہ معاملے میں ٹھن گئی۔ آپ کو ایک شیطان ساتھی کے ساتھ مل کر یہ سوجھی کہ اپنے سب پراکٹر کے منھ پر پیشاب کر دیا جائے چنانچہ اس شیطانی سازش پر عمل ہوا اور ایک شب جب پراکٹر صاحب نیچے سو رہے تھے ان دونوں ساتھیوں نے کوٹھے کے پرنالے سے سیدھ باندھ کر ٹھیک ان کے چہرے کو گرم گرم

پیشاب سے غسل دے دیا اور جب صبح انہوں نے پرا کٹر (میر ولایت حسین مرحوم) کے یہاں فریاد کی تو جوش کے ساتھی صاحب صاف جھوٹی قسم ان کی صفائی میں کھا گئے ...... اس چرکییت اور اس صریح کمینہ حرکت کو آپ محض طفلانہ شوخی کہہ کر ٹال جائیں گے؟ دین و مذہب نہ سہی دنیا کی شرافت و اخلاق کی کسی بھی صورت میں اس کا جواز مل سکے گا۔

اور سنیے، علی گڑھ سے نکالے گئے۔ جب کچھ اور سن شریف بڑھا تو ایک شب میں دو بجے چوک سے اپنی روسیاہی سے فراغت کر کے دو ایک شہدے دوستوں کے ساتھ تانگہ پر واپس ہو رہے تھے۔ شیطان نے پٹی پڑھائی کہ اس وقت اپنے شناساؤں میں سے جن صاحب کا مکان راستے میں پڑے گا انھیں جگا کے گالیوں اور فحاشی سے ان کی تواضع کی جائے اور معاً تانگہ بھگا دیا جائے چنانچہ اس پر عمل ہوا اور مرزا محمد ہادی رسوا (جو جوش صاحب کے استاد بھی تھے) اور سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم وغیرہ پر جو کچھ گزرنا تھی وہ گزر کر رہی۔

واللہ اعلم کس مصلحت سے اپنی فلمی زندگی کے کارنامہ کی تفصیل جوش صاحب کے قلم سے رہ گئی۔ جب وہ ''من کی جیت'' میں پردۂ فلم پر آئے تھے اور ''ابھار'' اور ''پیار'' کی قافیہ سرائی کی بہار دکھاتے پھرتے تھے۔ کیا بہار ہوتی کہ جوش صاحب کے بزرگان کرام میں رسالدار فقیر محمد خاں گویا بھی ان کی ان سعادت مندیوں اور خوش اطواریوں سے خوب واقف ہو جاتے!

بین السطور میں دعویٰ علم کا اور فلسفہ دانی کا بھی کیا ہے اور رسولؐ اور اہل بیت کے عشق کے ساتھ ملا حیاں اللہ میاں پر بھی موجود ہیں۔ رسول کریم کی یہ خوب مدح سرائی ہے کہ آپ (نعوذ باللہ) اتنا سچ بھی بول نہ سکے کہ آپ کسی موجود شئے اللہ نام کے رسول ہیں۔ اعتراض وہی فرسودہ۔ عامیانہ، جاہلانہ کہ قادر مطلق و خیر مطلق اتنے شر اور اتنی بدی کو گوارا کیسے کر رہا ہے!...... گویا وہ حکیم مطلق ہے ہی نہیں، یا یہ کہ ہم نے اس کی ساری حکمتوں کا احاطہ کر لیا ہے...... اور ان پر آخر وہ دور کب اور کس سنہ میں گزرا ہے

جب انھوں سے علوم کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا تھا۔ فلسفہ وحکمت کی کون کون سی کتابیں کس زبان میں پڑھی تھیں۔ اس نشان دہی سے ان کے نیاز مندوں کو بڑی مدد مل جاتی۔

کتاب فنی اعتبار سے بھی کچھ یوں ہی سی ہے۔ ایک جگہ طلوع فجر کی منظر کشی کرتے ہیں۔

''تارے کانپ کانپ کر کجلائے چلے جا رہے ہیں۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنوئیں سے نکل کر جگمگا رہا ہے......
چڑیاں چہکنے، ڈالیاں لچکنے اور مرغان سحر بانگ دینے لگے۔ کعبہ نور میں اذان ہونے لگی''۔ (ص44)

یہ عجیب سوء مشاہدہ ہے۔ چڑیوں کا چہکنا، ڈالیوں کا لچکنا اور مرغ کا اذان دینا، یہ سب قرص آفتاب کے بلند ہونے سے کہیں پہلے ہو چکتا ہے......اور پھر مرغان سحر کی خالص فارسی ترکیب میں ان کا بانگ دینا اس سے عجیب تر بانگ دینا تو اردو والے مرغ کا کام ہے۔ فارسی میں ''مرغ'' پرندہ کے لئے عام ہے اور اس کا ترجمہ چڑیوں سے ہوگا نہ کہ مرغوں سے۔

جوش تشبیہات کے بادشاہ ہیں۔ لیکن وہی جب تک تشبیہ سادہ اور مفرد ہو۔ تشبیہ مرکب یا تشبیہ در تشبیہ میں وہ الجھ کر رہ جاتے ہیں اور معنویت عبارت کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک جگہ تعارف مرزا جعفر علی خاں اثر صاحب کو کرا رہے ہیں۔ تعارف کی کرُم دُھڑم سنئے:

''قلزم انسانیت کے منارۂ ضوبار، منبر انتقاد کے خطیب اعظم ہندزبان کے قاضی القضاۃ'' (ص366)

اور یہ سب تمسخر میں نہیں عین موقعِ عظمت وعقیدت پر۔

کتاب جیسی کہ وہ ہے اسے لکھ کر جوش نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا نہ اپنی ذات کے ساتھ نہ اپنے خاندان اور بستی والوں کے ساتھ، نہ اپنی عفت مآب خاتون کے ساتھ (جن ایک تصویر بھی خواہ مخواہ دے دی ہے بلکہ اپنے ساتھ کم وبیش

ان کو بدنام ہی کیا ہے۔ نام روشن کرنے والی کتاب اس کو کسی معنی میں بھی نہیں کہہ سکتے۔کاش یہ کتاب جوش نے اپنے شاعرانہ کمالات پر لکھ دی ہوتی اور اس میں اپنے جتنے مناقب چاہتے بھر دیتے۔اپنی تعلیوں کی لے کتنی ہی بلند سے بلندتر رکھتے اور ''کلیم'' کے سابق ایڈیٹر کی حیثیت سے جتنی چاہتے'لن ترانیاں بگھارتے۔وہ کتاب پسند آتی یا نہ آتی ''گوارا'' تو بہر حال ہو جاتی۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کی شکل دیکھتے ہی نہ صرف بےزاری اور نفرت پیدا ہو بلکہ ساتھ ہی غصہ بھی آ جائے۔

جوش صاحب میرے لیے اجنبی و بیگانہ نہیں۔وہ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں اور عزیز سے میرے مخلصانہ تعلقات تھے۔وہ حضرت اکبرؒ کے نیاز مندرہ چکے ہیں(اگر چہ کتاب میں کہیں ان کا ذکر نہیں) اور ان کے میرے بہت سے احباب مشترک ہیں۔وہ مرزا محمد ہادی رسوا کے پڑھائے ہوئے ہیں اور مرزا صاحب میرے بزرگ کرم فرماتے۔میں جوش کی نجابت،شرافت کا ہمیشہ قائل رہا اور وہ مجھ سے بھی مدتوں بطور ایک خورد(جونیئر) کے ملتے رہے،غرض کہ ان کے متعدد رشتے اور واسطے مجھ سے ہیں اور ان کے بہت سے حق وحقوق ہر پہلو سے قائم ہیں۔ان کے خلاف کچھ لکھتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے اپنا والا میں نے اس کا اہتمام رکھا ہے کہ اس انتقادی تحریر میں بھی کوئی ناانصافی ان کے ساتھ نہ ہونے پائے۔انھیں یقیناً اپنی بے راہ روی اور اس کی اہمیت واشدیت کا آج احساس نہیں ہے۔

مقالہ کا عنوان میں نے ایک گندی کتاب رکھا ہے آپ چاہیں تو اسے ''ایک ننگی کتاب'' بھی کہہ سکتے ہیں۔اچھا ہوتا اگر جوش صاحب اس کا نام فحشیات جوش رکھ دیتے کوئی نہ کوئی صاحب جوش صاحب پر ریسرچ ضرور ہی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں گے۔ یہ مجموعہ ہاتھ آ جانے سے ان ریسرچ اسکالر صاحب کا کام خوب نکل جائے گا۔

صدق جدید نمبر 35،36 جلد 22 مورخہ 21،28/جنوری 1972

صنف ادب (شاعری)

(113) مسدس حالی صدی ایڈیشن

حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی۔

مولانا حالی صد سالہ یادگار کے غلغلہ سے ملک کی فضا ابھی گونج رہی ہے اس سلسلے میں حالی کے مشہور و مقبول مسدس کا بھی یہ خاص ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت سب نفیس و خوشنما، تقطیع مختصر، مجلد، سب سے پہلے مرتب ڈاکٹر عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی کا دیباچہ اس کے بعد سرسید کے خط کا عکس، اقبال کے قطعہ کا عکس، پھر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی وغیرہم متعدد مشاہیر ادب کے قلم سے مقدمات و تقریظات۔ اور زربفت میں گاڑھے کا پیوند ایک تقریظ مدیر صدق کے قلم سے بھی ہے۔ پھر حالی کی تصویر، ایک عکس تحریر۔ نئے اور پرانے دونوں دیباچے اصل مسدس، ضمیمہ وغیرہ آخر میں مشکل اور نامانوس الفاظ کی فہرست اور بڑے سائز پر ایک نقشہ دنیائے اسلام کا۔

مسدس اپنی فرط شہرت سے نہ کسی تعریف کا محتاج ہے نہ تعارف کا۔ یہ ایڈیشن خاص تیاریوں کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس میں صحت اور حسن طباعت دونوں کا امکانی لحاظ رکھا گیا ہے۔ ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ ایڈیشن قابلِ قدر ہے۔ قیمت جو کچھ بھی ہو مناسب ہی ہوگی۔

صدق نمبر 21 جلد نمبر 1 مورخہ یکم دسمبر 1935

(114) کلیات سلطان محمد قلی شاہ

مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور

(115) کلیات سراج

مرتبہ سید عبدالقادر سروری

کتاب گھر خیریت آباد، حیدر آباد

دکن کی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات اپنے ہاں کی علمی و ادبی تاریخ کو جس قابل رشک طریقہ سے زندہ کر رہی ہے اس کا تازہ نمونہ دکن کے دو قدیم شاعروں کی کلیات کی اشاعت ہے محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کا اور سراج کا بارھویں صدی کا تھا۔

دونوں کلیات کے مرتبوں نے کام چونکہ کسی تجارتی غرض کے ماتحت نہیں بلکہ دلی شوق کے جذبہ صادق سے کیا ہے اس لیے کاوش و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

کلیات محمد قلی شاہ کے 382 صفحات تو محض مقدمہ مرتب کی نذر ہیں باقی 368 صفحات میں شاعر کی نظمیں، غزلیں اور متفرق اصناف سخن۔ کلیات سراج کا مقدمہ بھی 128 صفحات کی ضخامت کا ہے اس کے بعد شاعر کا کلام ہے۔ پہلے مثنویاں وغیرہ ہیں۔ اور پھر غزلیں زبان سراج کی پرانی اور متروک ہو چکی ہے پھر بھی اتنی زائد پرانی نہیں ہوئی ہے مرتب کے حواشی سے فی الجملہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ قطب کی زبان بہت ہی پرانی دکھنی ہے، اس کے لیے فاضل مرتب کے حواشی کافی نہیں۔ کلام صرف طلبہ فن کے کام کا رہ گیا ہے۔ فاضل مرتب کا ذہن ادھر نہیں گیا اور جانا تھا بھی مشکل کہ جو الفاظ اور ترکیبیں ان کو معمولی معلوم ہو رہی

ہیں وہ عام ناظرین کے لیے کتنی سنگلاخ ثابت ہونگی ڈاکٹر زوراور پروفیسر سروری دونوں کی زندگیاں ہمارے نوجوانوں کے لیے قابل رشک اور قابل تقلید ہیں سالہا سال سے کس انہماک، یکسوئی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کئے ہوئے ہیں اور ان کی ہمتین کس سرگرمی کے ساتھ اس میدان میں اور ایک نئی راہ عمل اپنے لیے ڈھونڈتی رہتی ہیں۔لکھائی چھپائی دونوں کتابوں کی بہت صاف و روشن ہے۔کلیات سلطان جس اعلا اہتمام کے ساتھ چھپی ہے اس کے لیے تو بے اختیار لفظ ''شاہانہ'' استعمال کرنے کا جی چاہتا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر ہے بھی تو بادشاہ کا کلام۔رہی قیمت کی ظاہری زیادتی کو سمجھ لیجیے کہ یہاں بھی وہی ''شاہی'' اور ''شاہانہ'' کا تلازمہ چل رہا ہے۔

صدق نمبر 17 جلد 7 مورخہ 25/اگست 1941

(116) نغمہ زندگی

از سید فضل احمد کریم فضلی

انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی

کتاب کہیے یا ننھے منے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ اردو دیوان ہے ایک آئی سی ایس شاعر کا اور مجموعہ ہے ایک ''آکسن'' کے اردو کلام کا ...... اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز۔ جدت ندرت صرف اس حیثیت سے کب ہے؟ قدرتاً نظر سب سے پہلے فہرست پر پڑی اور پہلا عنوان ''تصویر شاعر'' نظر آیا ورق الٹا لیکن این! تصویر کہاں؟ کسی نے تصویر والا صفحہ پھاڑ تو نہیں ڈالا! جی نہیں۔ صفحہ سالم لیکن درج بجائے تصویر کے صرف ایک شعری تصویر! لاحول ولاقوۃ! کیا دھوکا ہوا۔ آگے چلیے دوسرا عنوان ''دیباچہ'' اچھا صاحب دیباچہ تو پڑھنے میں آئے گا لیکن توبہ، اب کی پھر وہی دھوکا! دیباچہ القط! اور اس کے عذر میں دو شعر درج! غرض مصنف اور ریونگار کے درمیان آنکھ مچولی شروع ہوتی ہے۔ شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم پر مات دیتا اور بھولا ناقد ہے کہ برابر مات پر مات کھاتا چلا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہو گیا وہی ردیف وار اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں کہ لیجیے 88 ص آ گیا اور اب دو بدو ہونے لگی فارسی کے استاد منوچہری سے۔

92 ص پر غزلوں کا جلسہ ختم 95 ص سے نظم خوانی کی محفل آراستہ۔ کہیں کہیں رباعیاں ہیں کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم ''آکسفورڈ'' میر حسن کی بدر منیر کے وزن پر۔ آکسفرڈ کی سرگزشت اور ''آکسن'' کی خود گزشت خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا!

وہی روانی بے ساختگی، شوخ بیانی وہی رمز و کنائے، وہی حرف و حکایتیں جو

مثنوی کی جان ہوتی ہیں۔ غرض بجز عریانی وفحش نگاری کے اور سب کچھ سب سے بڑی اور شاعر کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم نظم وہ بھی مثنوی ہی ہے۔

عنوان ہے ''فلم کا جادو'' یہاں پہنچ کر شاعر نرا شاعر نہیں رہتا واعظ وخطیب بھی بن جاتا ہے۔ وعظ وخطابت سینما کی ہجو میں نہیں۔ اچھی پاکیزہ مذہبی اصلاحی انقلابی فلم سازی کی حمایت میں! رند میں محتسب کی شان، زبان شاعرانہ لیکن تیور مصلحانہ۔

شاعر نے شہد کی مکھی بن رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے کن کن کلیوں کا چوسا ہے۔ اقبالؔ کا اثر سب سے بڑھ کر نمایاں شروع میں بھی وسط میں بھی آخر میں بھی۔ لیکن اپنی خودی کو لیے دیے ہوئے اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کئے ہوئے۔ رنگ میں کسی کے بھی نہیں سب سے آزاد، بس اپنے ہی اوپر اعتماد۔ یہ ہنر نہیں ریویو نگار کی نظر میں عیب ہے صلاحیتیں اب بھی موجود ہیں خدا کرے عمر میں اضافہ اور مشق میں پختگی کے ساتھ نظر بھی حکیمانہ وعارفانہ ہوتی جائے، شاعری تمامتر ایمانی وعرفانی بن جائے اور حضرت اقبال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے حضرت فضلی پورے 'اقبال مند' ہو جائیں۔ اور زبان؟ وطن کے لحاظ سے پنجابی اور مسکن کے لحاظ سے بنگالی بھلا کیسے ممکن ہے کہ اتنی شاعری صحیح اردو میں کر جائے؟ نکتہ چینی کی نگاہ اس تلاش میں دوڑی، پھری، گھومی لیکن بجز 95 کے آخری شعر کے شاید کہیں بھی جگہ نکلنے اور رکنے کی نہ پائی۔

صدق نمبر 48 جلد نمبر 7 مورخہ 13 اپریل 1942

(117) رنگ محل از ساغر نظامی

ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد

حسب تشریح سرورق یہ ساغر نظامی ادارہ اشاعت اردو حیدر آبادی رومانی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے ساغر صاحب کا ایک خاص رنگ ہے اور وہ رنگ خوب جانا ہوا پہچانا ہوا ہے۔ نازک اتنا کہ مفصل تحلیل اور مبسوط تنقید کا بار شاید اٹھا نہ سکے۔

ساغر کو غالباً اپنے تغزل کی قدر نہیں لیکن جو شاعر اس قسم کے شعر کہہ سکتا ہے۔

جھک کر یہ کیا کہا نگہ شرمسار نے — پھر میری عرض شوق میں پیدا ہیں جرأتیں

ورنہ ساز اک تار بے آواز ہے — تم جو چھیڑو مسکرا کر ساز ہے

ساز کا حاصل شکستِ ساز ہے — ٹوٹ کر ساغر بنا کرتا ہے دل

جوانی نہیں زندگانی لٹا دی — ترے نام پر نوجوانی لٹا دی

ہم ان کو خیالوں میں بھی رسوا نہیں کرتے — دل سے بھی غم عشق کا چرچا نہیں کرتے

احساس کرم حسن میں پیدا نہیں کرتے — ہم ان سے ستم کا بھی تقاضا نہیں کرتے

ہم نے بھی شوق دید میں دل کو نظر بنا دیا — جو زعم حسن میں رخ سے نقاب اٹھا دیا

شاعر اگر اپنی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتا تو اس سے بڑھ کر خود ناشناس اور کون ہوگا؟ اور ترقی پسند تو شاید انہوں نے بننا چاہا بھی مگر نہ بن سکے۔ 41-15

دیباچہ خیر ساغر کہتے جیسا بھی ہوں پڑھتے یقیناً بہت خوب ہیں ان کی آواز ان کے انداز ان کے تیوران کا ترنم بجائے خود ایک دلکش غزل ہیں اور وفور تاثر میں کسی کا خیال لفظ اور معنی کی طرف جانے ہی کب پاتا ہے؟ کاش ان میں یہ قدرت ہوتی کہ اپنے کلام کو چھپوانے کے بجائے ہمیشہ زبان سے سناتے ہی رہتے۔

صدق نمبر 29 جلد 9 22 رنومبر 1943

(118) دیوان نظیر اکبر آبادی

مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب

انجمن ترقی اردو دہلی

میاں نظیر اکبر آبادی اردو کے دور سوم کے شعراء میں شہرت رکھتے تھے۔ اپنے دور کے عوام میں تو جیسی مقبولیت ان کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی کو ہوئی ہو۔ ان کی کلیات جواب تک موجود و معروف تھی۔ بیشتر نظموں ہی پر مشتمل تھی۔ غزلیات اس میں گنتی کی چند تھیں۔ حال میں ملک کے نامور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی ہمت نے تلاش کر کے ان کے ایک چھوڑ دو دو دیوان پردۂ خفا سے ڈھونڈھ نکالے تلاش سے بھی بڑھ کر قابل داد ان کی وہ محنت ہے جو انہوں نے اس کی تصحیح و تدوین پر صرف فرمائی۔ مزید برآن ادھر ادھر سے نظیر کا جو کلام انہیں دستیاب ہوا۔ اس کو بھی ایک ضمیمہ کی شکل میں دیوان کے ساتھ ملحق کر دیا۔ اس طرح نظیر اکبر آبادی کی غزلوں، رباعیوں اور مثنویوں کا نایاب ذخیرہ اردو ادب کے قدر دانوں کے سامنے آ گیا۔ قابل دید خود مرزا صاحب کا مبصرانہ مقدمہ ہے۔

جس کا بڑا وصف زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ اس کا توازن اور رائے کی متانت ہے۔ نہ مدح میں افراط نہ تنقید میں غلو۔ افراط و تفریط دونوں سے احتیاط نظیر کے متعلق جتنی کتابیں شایع ہوئیں یا جن تذکروں میں ان کا حال بیان ہوا وہ منصفانہ اور بے لاگ ہی نہیں 'بے نظیر' بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہر دیوان کے شروع میں مفصل فہرست غزلیات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں۔

صدق نمبر 29 جلد 9 مورخہ 22 نومبر 1943

(119) گلبانگ حرم
از حمید صدیقی
دانش محل لکھنؤ

زائر حرم شاہد حمید لکھنوی کے نام کا جزو بن چکا ہے یہ ان کے ہاتھ کا گلدستہ نعت ہے خوش رنگ خوشنما، خوشبودار شروع میں تقریظ امجد حیدر آبادی کے قلم سے ہے وہ کتاب پر ایک جامع تبصرہ کی حیثیت رکھتی ہے ایک تقریظ جگر کے قلم سے بھی ہے۔ پیش لفظ مدیر صدق کے قلم سے ہے اور وہ حسب ذیل ہے۔

حمید لکھنوی زائر حرم کے نام سے مشہور ہیں یہ لقب ان کے لیے اسم با مسمی ہے۔ زیارت حرم ان کے رگ رگ میں بس گئی ہے "قال" سے گذر کر "حال" بن چکی ہے۔ کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے کبھی کبھی ان سطور کے راقم آثم کی نظر سے گزرا۔ ممکن نہ ہوا کہ جب کبھی نظر پڑی کلام کو بے پڑھے چھوڑ دیا ہو۔ کشش ہی کچھ ایسی ہے۔"

بحریں عموماً رواں وشگفتہ زبان صاف وسادہ، مضمون اغراق وغلو سے پاک۔ کلام جان دار ایسا گویا صفحہ کاغذ پر چھپا ہوا نہیں زندہ شاعر کی زباں سے ترنم کے ساتھ ادا ہو رہا ہے اور دل کا شوق ہے کہ امڈا پڑ رہا ہے۔ نعت گو اردو میں بہت سے ہوئے ہیں اور ہیں۔ کم ایسے ہوں گے جو ایسا ذوق سلیم رکھتے ہوں اور اتنے ادب شناس دربار نبوت کے ہوں۔ جہاں نہ دوسرے انبیاء کرام سے تقابل نہ ان حضرات کے لیے شائبہ توہین کہیں سے نکلے گا۔ نہ دنیا کے اس سب سے بڑے مزکی ہادی متقی کے حق میں کوئی مدحیہ کلمہ رکیک یا بازاری انداز کا ملے گا اور نہ نعوذ باللہ استخفاف یا سوء ادب کا کوئی نشان کعبۃ اللہ وشعائر دین کے حق میں پایا جائے گا۔ یہ وصف عام نہیں خاص، معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔

مسودہ کی صورت میں جو مجموعہ اور ان کا جا بجا نظر سے گزرا اس میں دو چار

مقامات شاعر کی نظر ثانی کے محتاج نظر آئے ان پر نشان لگا کر شاعر کو توجہ دلا دی گئی، ان کی سلامت ذوق سے توقع ہے کہ اشاعت کے وقت تک یہ کانٹے بھی پھول بن چکیں گے۔ حب نبی و عشق رسول کے دعویداروں کے لیے خدا کرے یہ کلام نمونہ معیار اور دلیل راہ کا کام دے۔ محبت نام بے قیدی کا نہیں پیغمبر ﷺ کے ساتھ عشق مترادف ہے اصلاً ان کے پیام کے ساتھ عشق کا۔

صدق نمبر 1 جلد 10 مورخہ یکم مئی 1944

(120) کیفیہ

از پنڈت برج موہن ناتھ کیفی

انجمن ترقی اردو دہلی

کیفی صاحب دہلوی اردو کے کہنہ مشق لکھنے والے اور استادانہ معلومات رکھنے والے اہل قلم ہیں یہ مجموعہ ان ایک عمر کی ادبی، انشائی اور نحوی تحقیق کا گویا نچوڑ ہے اور کتاب کی حیثیت ایک لسانی کشکول کی سی ہے جس میں صرف، نحو، عروض، قافیہ معانی بیان، املا اور تاریخ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل کا بیان آ گیا ہے۔

کتاب متفرق معلومات کے لحاظ سے اچھی ہے اور تاریخ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل کا بیان آ گیا ہے۔ کتاب متفرق معلومات کے لحاظ سے اچھی ہے۔ اردو کے ہر طالب علم کے مطالعہ میں آنے بلکہ رہنے کے قابل اور طلبہ سے مراد محض مبتدی ہی نہیں منشی فاضلوں کو بھی ان صفحات میں بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی اور مطالعہ کا وقت ضائع نہ جائے گا۔ البتہ یہ بھی ظاہر ہے کہ پنڈت صاحب کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے قاعدے، ضابطے، کلیے، ہر جگہ صحیح اور کافی نہیں ان کی تنقیدیں اور ترمیمیں بجائے خود محتاج تنقید ہیں اور علم و ادب کی دنیا میں یہی ہوتا ہی آیا ہے۔

نقائص کلام و اغلاط کی مثالیں دینے میں کیفی صاحب مختلف ادیبوں، شاعروں اہل قلم کے نام لیتے گئے ہیں۔ یہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ خصوصاً بعض جگہ نکتہ چینی حرف گیری کے اور اصلاح زبان زبان پکڑنے کے مرادف ہو گئی ہے۔ اصلاح و تصحیح کا کام بغیر کسی تصریح کے بھی ہو سکتا تھا۔ مصنف کی بے پناہ تنقید کی زد میں نذیر احمد حالی اور مولانا ابوالکلام سے لے کر نگار لکھنوی اور زمیندار لاہور تک سب ہی اچھے برے زندہ اور مرحوم بڑے اور چھوٹے آ جاتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جلال لکھنوی پر عنایت کچھ زیادہ ہے۔ عجب نہیں جو عالم برزخ سے اس وقت صدا آ رہی ہو

ع قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے۔

پختہ کار و پختہ قلم فاضل مصنف معاف فرمائیں کہ '' شترگربہ '' جس سے انہوں نے بچایا اور ڈرایا ہے خود ان کی تحریر بھی اس کا شکار ہونے سے نہ بچ سکی کہیں تو عربیت کی وہ جزالت وغرابت کہ دہلی کے کشمیری پنڈت پر دیوبند یا فرنگی محل کے مولوی مولانا کا گمان اور کہیں جو ہندی نوازی کی لہر آئی تو اولڈ بوائے کی جگہ زبان '' پاٹھک '' پر کھلنے لگی۔ کیفی صاحب کے استادفن ہونے میں کلام نہیں لیکن ضروری نہیں کہ جو ادیب گر ہو وہ ادیب بھی ہو۔ کتاب ان کی مفید کارآمد معلومات افزا، بہر صورت ہے۔

صدق نمبر 3 جلد 10 مورخہ 16 مئی 1944

(121) ذکرِ جمیل

از ماہر القادری صاحب

نفیس اکیڈمی، حیدر آباد۔

ماہر القادری صاحب کا کلام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا کلام یوں بھی اچھا اور پڑھنے کے قابل ہوتا ہے اور پھر یہ تو نعتیہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا۔ بعض نظموں کے عنوانات اور مضامین بالکل تاریخی ہیں اور کلام بہ حیثیت مجموعی ایسا ہی ہے جیسا ایک بیسویں صدی کے مومن شاعر کے قلم سے ادا ہونا چاہیے۔ دیباچہ کے بعض فقرے اور منظومات کے بعض بعض شعر بہت مؤثر اور دلگداز ہیں۔ البتہ کہیں کہیں جوشِ عقیدت ایک محتاط اور بیدار دیباچہ کے باوجود ہوش و علم پر غالب آ گیا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد سب ایک لمبے غلط نامے کے باوجود پسندیدہ ہیں۔

صدق نمبر 45 جلد 10 مورخہ 16/ مارچ 1945

(122) لہو ترنگ

ازسکندر علی وجد

عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد (دکن)

وجد صاحب حیدر آبادی جامعہ عثمانیہ کے بہترین فرزندوں میں سے ہیں اور خود تو پرانے نہیں لیکن ان کی شاعری کی عمر خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ کلام ان کا عرصہ سے دیکھنے میں آرہا ہے------ شاعری کی فطرت لے کر آئے ہیں۔ خود وجد ہیں تو کلام وجد آفریں۔

''لہو ترنگ'' کا لفظ اقبال کے ایک شعر سے لیا گیا ہے اور خود اقبال کا رنگ ہے کہ کتاب کے صفحے صفحے سے پھوٹا نکلتا ہے------- کتاب کلیات وجد ہے یعنی ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نظمیں صفحہ 128 تک اس کے بعد غزلیں۔ کل اشعار کا مجموعہ ایک ہزار سے زائد۔ دیباچہ تک منظوم ہے۔ نظمیں کوئی 55-50 کی تعداد میں ہوں گی۔ عنوانات کسان، ایک قلی سے لے کر اقبال اور محمد علی تک ہیں۔ اقبال والی نظم تو معمولی ہے البتہ شاعر کے پورے جوہر محمد علی والی نظم میں کھلے ہیں۔ دو ایک بند ملاحظہ ہوں:

نفرت ازلی تھی تجھے دینار و درم سے جھپکی نہ کبھی آنکھ تری جاہ و حشم سے

سر جھک نہ سکا سطوتِ اسکندر و جم سے بجلی تھی زباں آگ برستی تھی قلم سے

تحریر سے تھا رنگ عیاں قلب تپاں کا

تقریر میں تھا سوز مجاہد کی اذاں کا

یہ تیسرا بند تھا اب پانچواں بند ملاحظہ ہو۔

کرتے ہی رہے نیش زنی ارزل و اشرار غازی ہوا سامان سفر باندھ کے تیار

اسباب تھا قرآن و دلِ ریش و تنِ زار مونس تھی ولائے خلفِ حیدر کرار

در پیش نیا معرکہ، کرب و بلا تھا

بے خوفِ اجل مرد خدا مست چلا تھا

غزلوں کی تعداد کوئی چالیس کے قریب ہوگی اکثر چلی ہوئی شگفتہ بحروں میں اور مشہور استادوں کی زمین میں۔ غزلوں کا مرقع نظموں سے کم تر نہیں کچھ بڑھا ہی ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے جوش و مستی کے سیلاب کو بار بار روک کر حدود و قیود کے اندر رکھنا چاہ رہا ہے۔

کہیں کہیں کسی لفظ یا ترکیب پر ممکن ہے نکتہ چیں انگلی رکھ دے مثلاً صفحہ 62 پر ''دوستانہ پیدا کرنا'' یا صفحہ 110 پر ''دل پر دم''۔ لیکن معصوم کون سا شاعر اور ادیب ہوا ہے یا ہو سکتا ہے؟ شاعر کی داد کے لیے یہ کافی سے زائد ہے کہ وہ شاعر فطری ہے آورد نہیں آمد کے بل پر چل رہا ہے اور اس کا دل و دماغ دونوں مسلمان ہیں اور اس کی زبان اہل زبان کی ہے۔

صدق نمبر 2 جلد 11 مورخہ 16 / مئی 1945

(123) نقشِ امروز

مجموعۂ کلام علی اشرف صاحب

عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد (دکن)

کتاب کا آغاز فہرست عنوانات کے بعد جوش ملیح آبادی کے پیش لفظ اور قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی کے مقدمے سے ہوتا ہے اس لیے ذہن میں قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر صاحب کوئی ترقی پسند قسم کے شاعر ہوں گے مع تمام ترقی پسندانہ خصوصیات کے، لیکن کتاب کے سرسری ہی مطالعہ کے بعد یہ بدگمانی دور ہو جاتی ہے۔

اشرف صاحب یقیناً اُس معنی میں ترقی پسند ہیں نہیں جس میں یہ لفظ عام طور پر چل رہا ہے نہ قدم قدم پر ''بھوک''، ''پیٹ''، ''روٹی'' کی تکمیں دیں نہ ''جنسی بھوک'' کی ناقابلِ ذکر و ناقابلِ نقل عریانیاں نہ بات بات پر ''سرمایہ دار'' مردود کو کوسنے اور گالیاں، نہ مذہب اور حق تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں------- جب یہ کچھ بھی نہیں تو پھر آخر کوئی اس پر ''ترقی پسندی'' کا اطلاق کیسے کر دے۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ نظمیں اور غزلیں۔ نظمیں 152 صفحہ تک آئی ہیں اور باقی صفحوں میں غزلیں دو ایک غزلیں نظموں کے حصہ میں بھی گھس آئی ہیں------ اشرف کی شاعری یقیناً شریفوں کی شاعری ہے۔ کلام شریفوں کی محفل میں پڑھے جانے کے قابل۔ طرز و انداز میں وہ جوش سے خاصے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ (جوش کے الحاد اور بے نوازی سے نہیں جوش کے شاعرانہ کمالات سے) اور تغزل میں تو کہیں کہیں استاد جوش حضرت عزیز لکھنوی کا بالکل پرتو پڑ گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

اٹھوا دیا تھا کل جسے محفل سے آپ نے آج آ کے اس غریب کی میت اٹھائیے!

حصہ نظم میں اگر تاریخیں پڑی ہوتیں تو بہت خوب ہوتا۔ مثلاً نظم بنگال صفحہ 81-84 پر قحط بنگال کا سنہ درج ہونا ضروری تھا۔ نظم زمانہ صفحہ 46-49 میں جہاں یہ سب پیشگوئیاں ہیں کہ اب ''زنجیرِ غلامی'' کٹ جائے گی اور'' طائر مجبور'' اب دام سیاست میں پرافشاں نہ رہے گا۔ اور'' آئندہ یہ طنطنہ عظمت سلطاں نہ رہے گا''۔ وہاں قطعہ کا آخری شعر یہ ہے ۔

ہو جائیں گے دل جلوہ عرفاں سے درخشاں　　دنیا میں کوئی منکرِ یزداں نہ رہے گا

ایک نظم حسین ابن علی کی نذر ہے اور ایک سلطان الہند کے حضور میں۔ دو نظموں ایک دیوالی دوسری شہنشاہ اکبر سے طبیعت ذرا کھٹکی۔ خدا کرے یہ دونوں اشرف کے ابتدائی دور کی ہوں۔

زبان حتی الامکان بہت صحیح رکھنے کی کوشش کی ہے کہیں کہیں بعض ترکیبیں اور بعض محاورے نظر ثانی کے محتاج رہ گئے ہیں مثلاً

مجھ پہ ستم کئے ہیں وہ عبرت و اعتبار نے
اتنی بھی اب سکت نہیں بارِ غم اٹھا سکوں

عبرت و اعتبار کا ستم کرنا سمجھ میں نہ آیا یا مثلاً:

میں ہوں گدائے بے نوا مجھ کو وہ جام ہو عطا
عقل سے پھر نہ جا سکوں، ہوش میں پھر نہ آسکوں

'ہوش میں آنا' تو ٹھیک ہے لیکن عقل سے جانا محل نظر ہے۔

بہرحال اشرف صاحب ہر طرح سے ہونہار ہیں اور اچھی ادبی صلاحیتوں کے مالک۔ اس طرح کی خامیاں سب کے کلام میں ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ مشق وفکر سے گھٹتی جاتی ہیں اور مٹتی جاتی ہیں۔

اقبال کے رنگ میں وہ ملت و امت کی بہترین خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اللہ کرے ان کا ''فردا'' ان کے امروز سے بہتر اور روشن تر و مبارک ہو۔

صدق نمبر 22 جلد 11 مورخہ یکم ستمبر 1945

(124) طوفان محبت

از ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ بہادر)

کتاب خانہ، عابد روڈ، حیدر آباد (دکن)۔

اردو میں اچھی مثنویوں کے دن معلوم ہوتا تھا اب گزر چکے ہیں اور سحر البیان (میر حسن)، گلزار نسیم، زہر عشق اور ترانۂ شوق کے بعد اب خیال میں بھی نہیں آتا کہ کوئی اور مثنوی ایسی ہو سکے گی۔ سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی احمد علی شوق قدوائی کی ترانۂ شوق تھی اس کی تصنیف و اشاعت کو بھی 50-60 سال کا عرصہ گزر چکا۔ اتنے سنائے کے بعد اس نئی مثنوی نے وہ بھولا ہوا خواب یاد دلا دیا۔

طوفانِ محبت شاعر کی (مصنف رسالہ بدیہہ گوئی) 25 سال کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ دیر آید درست آید کا صحیح نمونہ۔ ہوش صاحب سنا تھا کہ بڑی شوخ اور چلبلی طبیعت کے مالک اور بڑے جلد باز ہیں۔ اس مثنوی کے آئینے میں تو بڑے بھاری بھرکم متانت مجسم اور شاعر سے بڑھ کر حکیم نظر آرہے ہیں!------ پارہ جب کشتہ بن جائے تو اس میں اب سیلانیت اور سیمابیت کی تلاش ہی کیوں کیجیے۔"

طوفانِ محبت کا نام ہی طوفان ہے اس مثنوی میں طوفانیت تو نام کو بھی نہیں۔ اس میں تو کشتیٔ نوح کا سا امن ہے، سکون ہے، تحفظ و سلامتی ہے، تاروں بھرے آسمان کا سا سکون ہے، چاندنی رات کی سی ٹھنڈک ہے------ ڈھائی ہزار سے زائد اشعار ہیں اس رنگ کو زبان کی صحت، سلاست، شگفتگی کے ساتھ قائم رکھنا مہارتِ فن کا کمال ہے۔

قصہ کا زمانہ آج سے 80-90 سال قبل یعنی انیسویں صدی کے وسط کے معاً بعد کا ہے۔ ساگر کے ایک بڑے تاجر سرفراز نامی کا اکلوتا ہونہار اور سعادت مند لڑکا کامران اپنے والدین کی اجازت سے لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ ہندوستان بھر کا چکر

لگا کر بحری سفر میں اس کا جہاز تباہ ہو جاتا ہے۔ اتفاقاتِ وقت اسے ایک نوجوان حسین لڑکی تک پہنچا دیتے ہیں جو کچھ سادھوؤں کی قید میں ہے۔ سادھو جب شراب میں بد مست و غافل ہو جاتے ہیں تو کامران اس حسینہ کو آزاد کر کے اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ لڑکی اپنی مصیبت کی داستان بیان کرتی ہے اور اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے ایک بڑے مسلمان رئیس کی صاحبزادی ہیں جو محض سوئے اتفاق سے اس عالم میں پہنچ گئی۔ دونوں دکھیارے اپنی حالت پر روتے ہیں اور پھر تدبیر سوچتے ہیں آخر میں یہ سب بچھڑے ہوئے اپنے اپنے والدین سے ملتے ہیں اور لڑکی (رشک قمر) کی شادی کامران کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یہ بہت ہی ناتمام سا خلاصہ ہے اصل مثنوی میں ایک دوسرا ضمنی قصہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

آغازِ کتاب میں تصویرِ مصنف کے بعد 12 صفحہ کا ایک دیباچہ خود مصنف کے قلم سے ہے اور دوسرا 12 صفحہ کا مقدمہ نیاز فتح پوری صاحب کے قلم سے۔ دونوں خاصے دلچسپ اور بڑی روان اور سلیس عبارت میں بلکہ ہوش صاحب کا دیباچہ تو اس سب کے علاوہ رنگین و بصیرت افروز بھی۔ اور عبارت میں جا بجا محمد حسین آزاد کے رنگِ انشاء کا نمونہ-------- صرف ایک ایک لفظ دونوں صاحب کے پاس نگاہِ تنقید کو کھٹکا۔ صفحہ 4 پر ہوش صاحب کے ہاں ہم جلیس اور صفحہ 14 پر (وسط صفحہ) نیاز صاحب کے ہاں بجائے نہیں لکھی تھی کہ نہ لکھی تھی۔

پلاٹ عاشقانہ ہونے کے باوجود فاسقانہ نہیں۔ کتاب بے تکلف چھوٹے بڑے ہر ایک کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔ اور جا بجا حکمت و معرفت کے درس سونے میں سہاگہ۔ مطلع کا آغاز یہ شعر ہے۔

بہ نامِ خدائے کمال آفریں جلیل و جمیل و جمال آفریں

تین صفحوں میں 24 شعروں تک یہی مضمونِ حمد چلا گیا ہے اور انہیں کے درمیان یہ جاندار اور جان آفریں شعر

اسی نے کیا پردۂ غیب چاک امینِ ازل ہو گئی مشتِ خاک

مناجات کے معاً بعد محبت کی زمزمہ سنجی شروع ہو جاتی ہے اور اب زبان اخلاص یوں گویا ہوتی ہے۔

غمِ دل میں یارب لطافت بھی دے محبت جو دی ہے مودت بھی دے
مودت جو روحِ عبادت بھی ہو مودت جو اجرِ رسالت بھی ہو

بعض بعض شعر تو ایسے رواں سبک اور بے تکلف نکل آئے ہیں کہ ضرب المثل بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

نہ جانے حیا آکے کیا کہہ گئی کھڑی تھی جہاں بس کھڑی رہ گئی
اسے دہر کی پاسبانی ملی دلوں پر اسے حکمرانی ملی

کتاب ادبی اخلاقی ہر اعتبار سے سند ہے کاش ہماری یونیورسٹیاں اور کالج ایسی کتابوں کو نصاب میں جگہ دینا سیکھیں۔ مصنف سے شکایت صرف ایک ہے۔ صفحہ 240 پر جہاں شریف رئیس زادی خود اپنے گھر سے بے گھر ہو رہی ہے وہ موقع بہت درد کا تھا سرسری گزر جانے کا نہ تھا۔ تنہا وہی کتاب کو انتہائی درد انگیز بنانے کے لیے کافی تھا۔

صدق نمبر 42 جلد 12 مورخہ 27 دسمبر 1946

(125) لاجونتی

از سرشانتی سروپ بھٹناگر

25۔تغلق روڈ، نئی دہلی۔

سرشانتی سروپ بھٹناگر ہندوستان کے ایک نامور سائنٹسٹ اور ماہرِ کیمیات کی صفِ اول میں ہیں۔ خیال بھی نہیں ہوسکتا کہ انھیں شاعری اور پھر اردو شاعری سے کوئی مناسبت ہوگی چہ جائیکہ وہ خود شعر کہتے ہوں۔ پیشِ نظر کتاب اس خیال کی عملی تردید میں ان کے کلام کا اردو مجموعہ ہے۔ ایک مختصر دیوان بلکہ کلیات۔

سرشانتی قوم کے کائستھ ہیں اور کائستھوں کا تعلق اردو بلکہ فارسی کے ساتھ کوئی نیا نہیں قدیم اور گہرا ہے اور پھر سرشانتی تو اس کے علاوہ غالب کے مشہور و محبوب شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے ہیں -------- یہ دونوں خصوصیات سامنے رکھ لیجیے حیرت ہلکی ہوجائے گی مگر جائے گی ہرگز نہیں۔ کیمیاگر کی شاعری ہے ہر حال میں ایک اعجوبہ چیز! ------ مجموعہ کے شروع میں متعدد اہلِ قلم کے قلم سے دیباچے، مقدمے، تقریظیں ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سرتیج بہادر سپرو، خواجہ محمد شفیع دہلوی، خواجہ حسن نظامی وغیرہ۔ بعض یقیناً بہت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ۔ بعض سرے سے غیرضروری۔

نفس کلام نرم گرم دونوں قسم کا ہے، گرم زیادہ نرم کم۔ بیشتر حصہ پڑھنے داد دینے کے قابل، کچھ حصہ خاموشی سے گزر جانے کے قابل اور ایسا کوئی نہیں جو رد کئے جانے یا ورق الٹ دینے کے قابل ہو۔ تشبیب کے حصے میں کلام کا رنگ قدرتاً عاشقانہ ہے لیکن فاسقانہ کہیں بھی نہیں۔ شاعر ہر حال میں شریف سنجیدہ خود دار ہے، رند، اوباش، کمینہ کسی ایک جگہ بھی نہیں۔ تبصرہ کا عنوان اگر کلام کے اعتبار سے ''کیمیاگر کی شاعری'' تھا تو صاحب کلام کے اعتبار سے ایک ''شریف شاعر'' ہونا چاہیے تھا۔

مجموعہ ایک طرح کا کشکول ہے۔ تغزل کا حصہ تو کچھ یوں ہی سا ہے۔ مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں واقعاتی لیکن نہ ایسی کہ خشکی کی حد تک پہنچ جائیں بلکہ طرز ادا کے لحاظ سے سب کے سب جذباتی، شاعر پورا عاشقِ صادق ہے لیکن عشق کی بازاری بیسوا کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی محترم رفیق حیات کے ساتھ جو دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہیں۔ ساری کتاب شروع سے آخر تک اسی داستان دردسوز فراق سے رنگین ہے ------- شاعر ہندو ہے کلام ہندی اور ہندوانہ تلمیحات سے لبریز ہے لیکن نشو ونما یقیناً نیم اسلامی ماحول میں ہوئی اس لیے مسلم تخیلات کی کارفرمائی بھی کثرت سے نظر آ رہی ہے۔ لاجونتی انھیں داغِ مفارقت دے جانے والی خاتون کا نام ہے ان کے مرثیہ میں نوحہ گر شاعر کہتا ہے۔

صدا بلند ہوئی آئیں لیڈی بھٹناگر ہیں چندر گپت کے کنبہ کی دختر نیک اختر
بصد ادب تھے فرشتے کھڑے ادھر ادھر یہ حکم تھا کوئی تکلیف نہ ہو ذرہ بھر

کیمیا گر فرنگی علوم وفنون میں ڈوب کر بھی فرنگ زدہ نہیں اسے اپنی مشرقی شرافت وعصمت عزیز ہے۔ وہ خاتون ہند کو فرنگی تیتریوں سے بالکل مختلف دیکھنا چاہتا ہے۔ صفحہ 40-45۔ اور وہ زن فرنگی کے فریبِ محبت سے بھی خوب آگاہ ہے۔ صفحہ 161-165۔ خیر یہ تو پھر ایک معاشری جزئیہ ہے۔ بڑی اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ نامور سائنٹسٹ (مشہور فلسفی اقبال کی طرح) نہ ملحد ہے نہ مشکک، نہ دہری نہ لاادری بلکہ ٹھیٹھ خدا پرست ------- کاش ہمارے ہاں کے نوجوان فلسفہ کا صرف نام سن لینے اور سائنس کی صرف شدبد جان لینے والے اس مثال سے فائدہ اٹھائیں! ایک نظم خدا کے عنوان سے صفحہ 17-23 اور دوسری کیمیا وفلسفہ صفحہ 24-25 کے عنوان سے دونوں پڑھنے کے قابل ہیں۔

متعدد نظمیں سیاسی رنگ کی بھی ہیں اور ان میں ایک آدھ تو بالکل اقبال کے ابتدائی نقش قدم پر۔ مثلاً جشنِ فتح صفحہ 166-167 جس کی ترکیبیں تک اقبال کے ''نیا شوالہ'' سے ماخوذ ہیں اور انہیں میں ایک آدھ ایسی بھی آ گئی ہے جو سرشانتی کے

عام مرنجان مرنج و صلح جو مسلک کے منافی ہے مثلاً مریض ہر دل عزیز صفحہ 153-160 - یہ نظم اس صورت سے اگر دینی ہی تھی تو کم از کم اس پر تاریخ نظم درج کر دینا تھی۔ 1946 کی دنیا 1920 کی دنیا سے کتنی مختلف ہو چکی ہے۔ بھائی شوکت کا ذکر اس میں جس عنوان سے آیا ہے وہ اس وقت تو محض مزاح سمجھا جا سکتا تھا لیکن آج کثرت سے مسلمان ناظرین اس تکلیف دہ طنز کو تعریض سمجھیں گے۔

اردو لفظوں کے ساتھ متعدد ہندی نظمیں بھی ہیں۔ اردو کے بعض مفرد الفاظ کی صحت تلفظ ایک دو لفظ کی صحت، محاوروں اور بعض مرکبات کی صحت ترکیب پر نگاہِ نکتہ چیں دو چار جگہ رکی۔ لیکن جس کتاب کو خواجہ محمد شفیع دہلوی جیسے اہل زبان بے تکلف پاس کر رہے ہوں اس کے کسی مقام پر حرف رکھنا ہے بڑی ہمت و جسارت کی بات۔

صدق نمبر 45 جلد 12 مورخہ 17 / جنوری 1947

(126) جہانِ آرزو

از جناب آرزو لکھنوی

24 صفحات قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے

نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدر آباد۔

آرزو کا شمار اس وقت لکھنؤ کے دبستانِ فن میں سے ہے۔ یہ ان کی غزلوں کا ایک تازہ مجموعہ ہے۔ وہ ایک خاص رنگِ مستحسن کے مالک ہیں۔ ان کے کلام کا تعارف کرانا ع

سورج کو چراغ ہے دکھانا

اس مجموعہ میں 183 مستقل غزلیں ہیں اور ایک غزل عجیب حسنِ صفت کے ساتھ میر کی غزل پر بصورتِ تضمین ہے۔ شروع میں ایک مناجات اور دو نظمیں ایک ''شاعر'' پر اور ایک ''غزل'' پر۔ شروع ہی ایک دیباچہ 6-7 صفحات کی ضخامت کا حقیقتِ شاعری پر قابلِ دید ہے۔

غزل کے نمونے کے لیے ذیل کے اشعار پڑھ لیجیے جو اتفاق سے سامنے آ گئے اور بلا کسی تلاش اور سعی انتخاب کے درج کئے جا رہے ہیں۔

کون دیوانہ کہے عشق کے دیوانے کو — گرتے تو دیکھا نہ کبھی شمع پہ پروانے کو

میری آزاد خیالی سے ہوا تنگ جہاں — روز ڈھونڈا کیا دل اک نئے ویرانے کو

چاک دامانی یوسف کو ہنسی میں نہ اڑا — کہیں دہرا نہ دے کوئی اس افسانے کو

پوچھنے ہی پہ ہے گر ضد تو سنو میں بھی صاف صاف — ہاں اسی راز کی قسم ہاں تم ہی دل کے رازا ہو

یا در امید بھی ہے درِ فتنہ کا جواب — باز کرو تو بند ہو بند کرو تو باز ہو

بات وہ ایک ہی سہی شان محل تو ہے — لب پہ وہ آئے شرح حال دل میں رہے تو راز ہو

گاہے قیام گاہ قعود گاہ رکوع گاہ سجود — براہ طلب میں ہر قدم شکر نماز ہو

دل نہ ہوا غریب کا کوئی کھلونا ہو گیا   روگ لگاؤ آپ ہی آپ ہی چارہ ساز ہو

لکھنؤ کی استادانہ شاعری کے لطیف و دلکش نمونے اب آرزو کے سوا شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آئیں گے۔

صدق نمبر 6 جلد 12 مورخہ 18/ مئی 1946

(127) کلیات ولی

مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

انجمن ترقی اردو، دہلی۔

ولی دکنی کے نام سے شعر و شاعری کی دنیا میں کون واقف نہیں؟ کئی سال کا عرصہ ہوا ان کا کلیات انجمن ترقی اردو نے احسن مارہروی کے زیر اہتمام شایع کرایا تھا اس کے بعد اور بہت سے نئے معلومات ہاتھ لگے۔ نئے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ یہ نیا ایڈیشن اردو کے پرانے معلّم اور نئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے زیر اہتمام پریس سے باہر نکلا ہے اور اس کی سعی کاوش اور حسن ذوق دونوں کا ظہور اس سے پوری طرح ہو رہا ہے۔

اس ایڈیشن میں شروع کے 40 صفحوں میں پہلے آٹھ صفحے کا ایک ضروری اور کارآمد دیباچہ ہاشمی صاحب کے قلم سے ہے پھر ایک مقدمہ ولی کی شاعری پر مقدمہ نگار کے نام کی تصریح کے بغیر 16 صفحے کا دلچسپ اور پر مغز ملتا ہے اور اس کے بعد ولی کی زبان کے عنوان سے ایک مضمون کوئی 14 صفحے کا ڈاکٹر عبدالستار صدیقی استاد عربی الہ آباد یونیورسٹی کے قلم سے اور اپنے لسانی معلومات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

اصل کلیات 358 صفحات میں آیا ہے چھوٹی بڑی غزلیں 456 کی تعداد میں صفحہ 276 تک آئی ہیں اس کے بعد فردیات، رباعیات، قصائد و مثنویات وغیرہ کا سلسلہ ہے مفید حاشیے شروع سے آخر تک جا بجا ملتے ہیں۔ 20 صفحہ کے ضمیمہ میں وہ کلام درج ہے جس کا انتساب ولی کی طرح مشکوک ہے۔ سب سے آخر میں 20 صفحہ کی ایک فرہنگ ہے۔ اس فرہنگ کی تمہید اور اردو کے طلبہ کے لیے نفع سے خالی نہیں۔

ولی کا کلام اب زبان کی کہنگی کے باعث ہر شخص کے پڑھنے کا نہیں۔
صرف طلبۂ زبان کے کام کا ہے انجمن نے اس کو اس شان و اہتمام سے شایع
کر کے خدمت فن کا حق ادا کر دیا ہے۔ دیباچہ و مقدمہ وغیرہ کل ملحقات طلبۂ فن
کے لیے بصیرت افروز ہیں۔

صدق نمبر 22 جلد 12 مورخہ 19/ جولائی 1946

(128) نشاط خاطر

از خواجہ حمید

حمیدیہ دواخانہ، کٹرہ بوتراب خاں، لکھنؤ۔

شعر و سخن کا دلچسپ مرقع اور خوش رنگ گلدستہ ہے۔ سرورق پر نام ایک ہی شاعر کا ہے لیکن دراصل دو خوش فکر شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔ ایک مرحوم و نامور استاد مرزا ثاقب ہیں اور دوسرے ان کے شاگرد خواجہ حمید الدین حمید۔ استاد کا کلام شاگرد کا انتخاب کیا ہوا اور شاگرد کا کلام استاد کا صاد کیا ہوا------انتخاب کی ندرت و طرفگی بجائے خود ایک شاعرانہ جدت اور قابل داد! یہ حمید صاحب وہی ہیں ''پرواز خیال'' اور حمید کے سو شعر والے۔ خواجہ عزیز لکھنوی مرحوم و مغفور کے پوتے۔ اور شاید سنی الکشن بورڈ کے صدر بھی۔ اور مرزا ثاقب اپنی فرط شہرت سے ادبی اور شعری حلقوں میں ہر تعارف سے بے نیاز------دونوں کے منتخب کلام کا مجموعہ قند مکرر کا مصداق صفحہ 12 تک عرض حال اور مقدمہ صفحہ 14 سے صفحہ 34 تک کلام ثاقب اور صفحہ 39 سے صفحہ 52 تک کلام حمید۔ پڑھیئے اور لطف اٹھایئے۔ ثاقب کے شعر ایک دو نہیں متعدد ایسے ہیں کہ ان پر نظر جہاں ایک دفعہ پڑی جس جم جاتی ہے۔ اور جی میں آتا ہے کہ بار بار پڑھے جایئے۔ نمونہ حاضر ہے۔

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے — ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی تو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

نزع ایک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مر جانے کا

حمید صاحب کے ہاں درد کی کسک اتنی نہیں۔ اس کی کو وہ رنگین بیانی اور زور

تخیل سے پورا کر لینا چاہتے ہیں۔ ہلکا سا نمونہ اس کا بھی ملاحظہ ہو۔

دکھاتی ہے چشم یقیں کیسے کیسے — خزانہ لیے ہے زمیں کیسے کیسے
تعجب ہے اب تک خدا کو نہ پایا — کیے سجدے تو نے جبیں کیسے کیسے
دکھائے زمانے کو دنیا کے نقشے — اجل نے دمِ واپسی کیسے کیسے

کہیں کہیں حمید صاحب کی حقیقت بیانی نے شعریت کا ساتھ چھوڑ بھی دیا ہے۔ ایک جگہ اعلان نون کی ضرورت محسوس ہوئی اس شعر کے دوسرے مصرعے میں۔

سناتا ہوں اب داستانِ محبت — توجہ کی امید ہے سامعین سے

لیکن اگر ثاقب صاحب نے اسے پاس کر دیا ہے تو بس یہ ٹھیک ہی ہوگا------ استادوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ثاقب صاحب پختہ اثنا عشری تھے اور حمید صاحب ماشاءاللہ زبردست چار یاری ہیں لیکن ادب کے دستر خوان پر جب بیٹھے تو ایسا ایک دوسرے سے گھل مل کر رہے جیسے دودھ میں شکر، کشمیری چائے کی پیالی میں بالائی!------- یا ایک ہی شعر کے دو مصرعے!

صدق نمبر 12 جلد 13 مورخہ 25/ جولائی 1947

(129) آئینہ

کلام اصطفا خاں اصطفا لکھنوی

کتب خانہ اصطفا، حنا بلڈنگ، لکھنؤ۔

شروع میں اظہار خیال زائر حرم حمید صدیقی کی زبان سے ہے ہلکے پھلکے شیریں وسبک انداز میں ان کی نعتیہ نظموں ہی کی طرح دلکش و پر کیف۔ پھر مقدمہ نکہت شاہجہانپوری کے قلم سے ہے۔ ذرا ضخیم سا اور جا بجا ثقیل سا۔ مختصر ہوتا تو خوب تر ہوتا۔ اس کے بعد چند صفحات حالات اصطفا بزبان اصطفا کی نذر ہیں۔ یہ آپ بیتی لطیف تر ہوتی اگر صریح تر ہوتی۔ اس تصریح کے بعد کہ گیارہ سال کے سن میں گلستاں و بوستاں کے پڑھنے میں کچھ جی نہ لگا۔ جب یہ خشک حقیقت اجمال کے ساتھ منظر کے سامنے آتی ہے کہ چودھویں سال کے بعد یوسف زلیخا شروع کرائی گئی تو پڑھنے والے کا ذہن کئی خلا محسوس کرنے لگتا ہے------- بجائے سکندر نامہ بادشاہ نامہ یا قصائد عرفی کے یوسف زلیخا کے سبق چودھویں سال کے سن میں اور وہ بھی لکھنؤ کے ماحول چوک کے گردونواح میں۔ یہ متن مجمل تو ایک شرح مفصل کا محتاج تھا۔

صفحہ 42 کے مقابل مصنف کا فوٹو ہے سیاہ داڑھی کی نورانیت ایک حاجی و زائر کا نقشہ تو بے شک دکھا رہی ہے لیکن شاعرانہ ذہانت کی چمک کا رنگ جو اصل صورت کا جزو ہے تصویر سے اڑا ہوا ہے اور اکثر فوٹو شخصیت کے خط و خال کی تصویر کشی میں ناکام رہتے ہیں۔

اصل کلام صفحہ 47 سے آخر تک ہے کئی حصوں میں منقسم۔ پہلا حصہ حمد و نعت کے لیے وقف اس کا عنوان معارف ہے۔ دوسرا حصہ بجائے خود دو حصوں میں تقسیم ہے عکس مجاز (کلام دور اول) اور عکس فطرت (کلام دور دوم) کے نام سے۔ ان میں عاشقانہ کلام غزلیات وغیرہ ہیں۔ چوتھا عنوان جلوۂ رنگ و بو ہے اس کے تحت میں سفر

نامہ یورپ، حسن بے نقاب، بادہ شبینہ وغیرہ متعدد نظمیں ہیں۔ آخری عنوان خیاباں خیاباں کے ماتحت رباعیاں، قطعات، عیدیاں، سہرے وغیرہ متفرقات ہیں۔ اصطفا بہ حیثیت مجموعی ایک خوش گو شاعر ہیں حمد یا توحید کے رنگ میں ابتدا کے یہ دو شعر کافی ہیں۔

وہم و خیال سے بھی وراء الوراء ہیں آپ جو کچھ کوئی سمجھ سکے اس کے سوا ہیں آپ
ہر شئے میں ہر مقام میں جلوہ نما ہیں آپ حیراں ہے میری عقل کہ کیا ہیں آپ

نعت گوئی کا مرحلہ دشوار گزار ہے شاعر کے جذبات عقیدت جا بجا حقیقت نگاری پر غالب آگئے ہیں مثلاً مدینہ کی ایک ایک گلی کا طبقات جنت سے برتر ہونا صفحہ 51۔ حسین ابن علیؓ کا سردار شہداء کونین ہونا صفحہ 151۔ قدم مبارک پڑنے سے پتھر کا موم بن جانا صفحہ 56۔ آپ کا دونوں عالموں کا مالک ہونا وغیرہ۔

اور یہ شعر ؎

بیاں شان و جبروت کا اور کیا ہو بڑی سب سے ہے بارگاہِ مدینہ
خداوند کا نبی جانتا ہے صفحہ 57
ہے علماء کے دین کی بھی تعظیم واجب صفحہ 58

صفحہ 62 سے صفحہ 116 تک دور اول کا عاشقانہ کلام اوسط درجہ کا ہے کوئی ترتیب معلوم نہیں ہوتی کہیں کہیں مصرعہ میں تعقید رہ گئی ہے مثلاً اللیل کی نظر میں تفسیر پھر رہی ہے۔ صفحہ ۱۰۷۔ صحیح ترکیب نظر میں واللیل کی تفسیر پھرنا تھی۔ کہیں کہیں شعر کا مضمون اعتقادی حیثیت سے سخت قابل اعتراض ہو گیا ہے مثلاً

جنت کی آرزو ہے نہ دوزخ کا خوف ہے دل میں مرے کثافت بیم در جا نہیں
صفحہ 109

دور دوم کا کلام نسبتاً غنیمت ہے۔ لکھنؤ میں رہ کر پہلوئے ذم سے بچنا بہت ضروری تھا۔ ذیل کے شعر میں آشنائی جس سیاق میں آیا ہے وہ خاصہ پہلو ذم کا رکھتا ہے۔

نام تو لکھوا لیا ہے آشناؤں میں ترے ایک جھٹک ہے شرط لیکن آشنائی کے لیے

صفحہ 124

صفحہ 231 پر اسی پہلوئے ذم کی ایک فاحش مثال ایسی آگئی ہے کہ اس تبصرہ میں نقل ہونے کے قابل نہیں۔۔۔۔۔۔۔ لکھنؤ کے مشاعرہ میں شاعر اگر زبان سے ایسا مصرعہ ادا کر دے تو پھر عمر بھر شہر میں منھ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

چھوٹی بحروں میں جو غزلیں اس حصے میں ہیں وہ عموماً اچھی ہیں صفحہ 260-259 پر ''حسن بے نقاب'' کے عنوان سے جو مسلسل نظم جوبن کے قافیہ کے ساتھ ہے اس میں لفظ ''جوبن'' ہر جگہ اپنے عامیانہ معنی ہی میں آیا ہے ورنہ اس کے دوسرے معنی رونق یا بہار کے بھی ہیں۔ ''فریفتہ ہے خود اپنے نگار جوبن پر'' اس مصرعہ میں کھلی ہوئی تعقید ہے۔

صفحہ 173 پر ایک رباعی کا شعر ہے۔

برحق ہے اصطفا یہ حدیث نبوی من مات من العشق فقدمات شہید

اسے موزوں کرنے سے قبل یہ تحقیق کر لینا ضروری تھا کہ آیا یہ حدیث نبوی ہے بھی؟

صدق نمبر 4 جلد 15 مورخہ 27/ مئی 1942

(130) مسدس بے نظیر

از جان صاحب ریختی گو۔ مرتبہ محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری

صفحات 130+43، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ چار آنے

اثر رامپوری خسرو باغ روڈ، رامپور، (یو پی)

جان صاحب لکھنوی مشہور ریختی گو کو زمانہ اب بھول چلا تھا۔ اثر رامپوری نے ان کا یہ غیر مطبوعہ مسدس چھاپ کر پھر ان کے نام کو کچھ دن کے لیے پڑھے لکھوں میں زندہ کر دیا۔ اصل نظم تو کل 43 صفحوں میں آ گئی ہے، وہ بھی بہ کثرت اور بعض بڑے لمبے حاشیوں کے بعد۔ ورنہ شروع کے 130 صفحہ تو مرتب صاحب کے بڑے پُر معلومات اور مفصل مقدمہ کے لیے وقف ہیں۔

نظم کی شان نزول یہ ہے کہ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والیِ رامپور (متوفی 1887) نے جو بڑے گہرے مذہبی اور دیندار ہونے کے ساتھ بڑے زندہ دل و شوقین مزاج بھی تھے اپنے جلوس کی یادگار میں ایک سالانہ میلہ کی طرح ڈالی یہ 22 سال جاری رہا اور رامپور ''دارالسرور'' کے مشہور باغ بے نظیر میں لگتا تھا۔ نواب صاحب کا دربار شاعروں کا ملجا و مرجع تھا۔ اور ان درباری شاعروں میں اسیر، امیر مینائی، داغ، جلال، کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب (1810 تا 1886) بھی تھے، یہ نظم انھیں جان صاحب کی کہی ہوئی اس میلہ کی تعریف میں ہے۔ نظم میلہ قایم ہونے کے دوسرے سال 1866 میں کہی گئی، شاعر کی عمر اس وقت 56 سال کی تھی۔ نظم مسدس کی شکل میں ہے۔ مسدس کا قلمی نسخہ رامپور کے سرکاری کتاب خانہ میں محفوظ تھا، اب 84 سال بعد پہلی بار چھپ کر منظر عام پر آ رہا ہے۔

مسدس یقیناً اپنے زمانہ میں بہت پسند کیا گیا ہوگا۔ اور اس وقت معرکۃ الآرا سمجھا گیا ہوگا۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں اور صفتیں موجود ہیں جن کی قدر لکھنوی شاعری کے اس دور اور اس درباری ماحول میں خاص طور پر ہونا چاہیے تھی۔ وہی

زبان، وہی انداز بیان شاعر کے وہی تیور، شاعری کے وہی ٹھاٹھ اور ریختی کی وہی رعایتیں اور تلازمے۔ ایک بند جو حلوائی کی دوکان سے متعلق ہے ملاحظہ ہو، میٹھی میٹھی باتوں میں رس کس غضب کا گھول دیا ہے۔

حلوائیوں کے تھالوں کی کثرت سے جا بجا
دوکان اے ''بی خرما'' ہے ''لکھ پیڑے'' سے سوا
حلوائی ''پوری'' بات بھلاکر نے پائے کیا
اے ''برفی'' جان ہوں جہاں گاہک ہزار ہا
ایسا نہ ہوگا مصر میں بازار وہی گرم
مصری ''بنات'' پوچھ کہ آتی ہے مجھ کو شرم
خوش ہیں ابال ''دودھ'' کی صورت میں لا رہیں
اور کھٹے میٹھے بول بھی اپنے سنار ہیں
ہے عشق تو حسن کا ''ضامن'' بنا رہیں
بالائی بالا دل میں ہیں نقشے جمار ہیں
''میٹھی'' زباں ''دہی'' سے سوا ایسی بولی ہے
جو بات گھوسنوں کی ہے ''مکھن کی گولی'' ہے

اسی طرح 103 بندوں میں خدا معلوم کتنے پیشہ وروں، دوکانداروں، گویوں، سازندوں، طائفوں، شاعروں اور عہدہ داروں کا ذکر کر گئے ہیں اور میلہ کا پورا نقشہ اپنی شاعرانہ تخیل اور مبالغہ آرائی کے ساتھ کھینچ گئے ہیں۔ 84 سال کے انقلاب در انقلاب کے بعد نظم میں وہ لطف آج کیسے باقی رہ سکتا تھا۔ تاہم مسدس بالکل بے جان اور مردہ آج بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور مرتب نے اپنی والی تو پوری کوشش کر ڈالی ہے کہ نظم کو جاندار اول سے آخر تک بنا دیں۔

اصل مسدس 43 صفحوں میں آ گیا ہے اور وہ بھی مرتب کے بہ کثرت اور خفی قلم کے حاشیوں کے بعد۔ باقی 130 صفحہ اثر صاحب کے مقدمہ کی نذر ہیں! ۔سن کر بدگمانی نہ کیجیے کہ اتنی ضخامت محض طوالت بیان اور درازنفسی کی کرامت ہے۔ ایسا نہیں

ہے مرتب نے مقدمہ کو ہر ہر پہلو سے دلچسپ اور زیادہ سے زیادہ پُر معلومات بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

مرتب کا ادبی ذوق ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ اور ان سے اس کی توقع بیجا نہیں کہ آیندہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس سے بہتر اور برتر کسی کام میں صرف کریں گے، تاہم اگر اسی کا دوسرا ایڈیشن نکالنے کا وہ ارادہ رکھتے ہوں تو معروضات ذیل کو اپنی یادداشت میں کہیں ٹانک لیں:

(1) شاعر کی زبان اب قدرے پرانی ہو چکی ہے اور اس کہنگی کا اثر جا بجا نمایاں ہے۔ مرتب کو ایسے ہر موقع پر حاشیے دینے تھے۔ مثلاً ''(رنڈی)'' کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اکثر جگہ یہ تشریح ضروری تھی کہ قدیم محاورہ میں یہ طوائف یا کسبی کے معنی میں نہیں۔ بلکہ عورت کے مرادف، روزمرہ کے مقابل تھا۔ یا ممدوح کی مدح میں جو یہ مصرعہ ہے ''زیبا ہیں سوا منگیں غلو پر شباب ہے'' (بند 15) یہاں غلو پر یہ نوٹ دینا تھا کہ موجودہ اردو میں یہ لفظ محل مدح پر نہیں۔ محل ذم پر آتا ہے۔ اسی طرح بالائی بالا (18 بند) پر یہ نوٹ دینا ضروری تھا کہ صحیح ''تلفظ'' بالا ہی بالا ہے، لیکن عورتوں اور عوام کی زبان پر ''بالائی بالا''، علیٰ ہذا اسی بند 75 میں ''ضامن'' پر یہ نوٹ دینا تھا کہ یہ وہ چیز ہے جس سے دہی جمایا جاتا ہے عوام کے تلفظ میں ''جامن'' وغیرہ۔

(2) کہیں کہیں تاریخی غلطیاں بھی رہ گئیں ہیں۔ صفحہ 103 پر شیخ وحید الزماں مرحوم کے حالات درج ہیں ان کا موضع ''چلاداں تھانہ کربلاواں'' اور اس سے متصل جو بجنور ہے۔ وہ قصبہ ہے نہ کہ ضلع اور مضافات لکھنؤ میں سے ہے، (مشہور لیڈر چودھری خلیق الزماں کا بھی وطن یہی چلاواں بجنور ہے)۔

(3) کلام کی شرح میں کہیں کہیں چوک ہوگئی ہے۔ ص:120-127 پر بھنگنوں کے سلسلہ میں ''جھاڑ و تارا'' کی تشریح ضروری ہے۔ ''جھاڑو تارا'' عوام اور عورتوں کی بولی میں دُمدار ستارے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ''گوگا'' ایک اصلی یا فرضی شخصیت کا نام ہے جسے مہترا اپنا پیر یا بزرگ مانتے ہیں۔

صدق جدید، نمبر 1، جلد 1، 8 دسمبر 1950

(131) اردو

از جگن ناتھ صاحب آزاد

24 صفحہ، قیمت چھ آنے، دہلی کتاب گھر، دہلی۔

نثر نہیں نظم ہے۔ ایک ہندو شاعر کی زبان سے چند سال قبل کی کہی ہوئی، لیکن حال میں دھرائی ہوئی شاعر اب لاہوری نہیں 1947 کے خونیں واقعات کے بعد سے دہلوی ہیں۔ اپنا لٹا پٹا تحریری سرمایہ وطن سے لا سکے ہوں یا نہیں لیکن بڑی بات یہ ہے کہ اپنی شرافت کا سرمایہ تمام تر لیتے آئے ہیں۔ کلام آپ سنیں گے؟

سنا ہے ہند پر یوں حکمراں تھی آلِ تیموری
کہ ملک ایک جسم تھا اور اس میں جاں تھی آلِ تیموری
یہ تھا دور آدمیت کا شرافت کا مروّت کا
وطن میں یہ زمانہ تھا، زمانہ امن و راحت کا
ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں
کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستان میں پیار کی رسمیں
اکٹھے ہندو، مسلم شریکِ حکمرانی تھے
وطن کے پاسباں مل جل کے محوِ پاسبانی تھے

اللہ اللہ! یہ الفاظ اور یہ خیالات ایک ''شرنارتھی'' کی زبان سے 1950 میں!۔

دوسرا بند ملاحظہ ہو۔

ادھر بھی ایک تمدن تھا ادھر بھی ایک تمدن تھا نظر آیا وطن کی سرزمیں پر ایک حسیں نقشہ

نہ کیوں اس گلستاں میں ارتقا کے پھول پیدا ہوں
جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدن کار فرما ہوں
جہاں علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی

حکومت کی زباں تھی فارسی، اور ملکی زباں ہندی
عنا دل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں
اضافہ ہو رہا تھا اس طرح دونوں زبانوں میں

آگے ذکر ہے کہ دونوں سے مل جل کر بلکہ گھل مل کر نئی زبان اردو پیدا ہوئی۔
بند کے بند اگر نقل ہوتے گئے تو کتاب میں پڑھنے کے لیے رہ ہی کیا جائے گا!

کتاب منگا کر پڑھیے اور اسے دوسروں کو سنائیے۔ شاعر کی شرافت اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ چوم چوم لیے جائیں۔

ایک مختصر پیش نامہ قاضی عبدالغفار صاحب کے قلم سے ہے۔

صدق جدید، نمبر 14، جلد 13، مارچ 1951

(132) ہفت رنگ

از عرش ملسیانی

192 صفحہ مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ، ''رہنمائے تعلم'' بک ڈپو، مفتی والان دہلی۔
(پاکستان میں: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، دفتر ''رہنمائے تعلم'' رام گلی نمبر 3، لاہور)

اردو کے شاعروں اور خوش گو شاعروں کی تعداد ہندوؤں میں اب بھی موجود ہے۔ اور اس طبقہ کے ایک ممتاز فرد عرش ملسیانی (نائب ایڈیٹر 'آج کل') ہیں ہفت رنگ ان کا پہلا دیوان ہے۔ صوری اعتبار سے چھوٹا، معنوی حیثیت سے بڑا۔ قامت میں کہتر، قیمت میں بہتر۔

عرش کی مناسبت 'فلک' سے ظاہر ہے اور آسمان کے بھی چوں کہ سات طبقہ ہیں شاید اسی مناسبت سے یہ دیوان عرش بھی قوس و قزح بنا ہوا سات رنگ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

پہلا رنگ ''خون آدم'' (17-64) ہے اس کی بسم اللہ اقبال کی ایک فارسی رباعی سے ہوتی ہے۔ کوئی 16 نظمیں اس میں مسائل حاضرہ پر ہیں۔ اس کی ایک نظم اشرف المخلوقات کا نمونہ ـ

اے حال پریشانِ جہاں دیکھنے والو — اے نبضِ جوانانِ جہاں دیکھنے والو
دیکھو تو زرا یہ قفس و دام کی دنیا — آزار کی دنیا غم و آلام کی دنیا
تہذیب پہ تخریب ستم توڑ رہی ہے — ہمت ہے کہ ہر گام پہ جی چھوڑ رہی ہے
یہ ٹینک یہ بم اور یہ توپوں کے دہانے — بے مہری انسان کے سناتے ہیں افسانے
خونخواریِ انسان کی یہ گھاتیں ہیں قیامت — اس اشرف مخلوق کی باتیں ہیں قیامت

دوسرا رنگ نوائے عشق (ص: 65 تا 112) کے نام سے تغزل کا ہے۔ اس کی ایک جھلک ـ

اب وہ کرتے ہیں مری غمخواریاں — ہوگئیں آسان سب دشواریاں

عرضِ واجب سے بھی رکھا ہے نیاز مجھ کو لے ڈوبیں مری خود داریاں
تم نے یہ کیا اپنے دل میں ٹھان لی کیوں ہیں میری اس قدر دلداریاں
ان سے ملتا ہے قناعت کا سبق ایک نعمت ہیں مری ناداریاں
کوششِ اظہارِ غم بھی ضبط بھی آہ یہ مجبوریاں ، مختاریاں!

تیسرا رنگ ''واردات'' (ص:114:128) کے زیر عنوان ہے۔اس آپ بیتی کے ٹکڑے میں شاعر نے حسن بشری اور حسن قدرت دونوں سے متعلق اپنے تجربات وتاثرات کی داستان سنائی ہے۔

چوتھے رنگ کا عنوان سوز وگداز (ص:130 تا 144) ہے اور اس کے تحتانی عنوانات ''بیوہ کی فریاد'' ''محبوب کا آخری خط'' ''سہاگن بیوہ'' وغیرہ ہیں۔

پانچواں رنگ ''متفرقات'' (ص:145-160) کا ہے۔اور اس میں کچھ سیاسی رنگ کے نعرے ہیں۔معتدل قسم کی سوشلزم کی تائید۔

چھٹا رنگ ''خرابات'' (ص:162-176) کے عنوان سے خمریات پر ہے اور کتاب کا شاید سب سے پھیکا حصہ یہی ہے۔عجب نہیں کہ محض تبصرہ نگار کی بدذوقی اس کی ذمہ دار ہو۔

ساتویں رنگ کا عنوان گیت (ص:172 تا 192) ہے۔''کسان کا گیت'' ''پن گھٹ'' ''ہمارا دیش'' وغیرہ۔اور اس کے بیش تر حصوں میں زبان قدرۃً دیہاتی استعمال کی گئی ہے۔

عرش صاحب نہ دہلی کے ہیں نہ لکھنؤ کے۔پنجاب کے ہیں اور پنجاب میں بھی دیہات کے۔حیرت ہے کہ وہاں رہ کر انھیں اردو فارسی آمیز اردو کے صحیح استعمال پر اس قدر قدرت کیسے حاصل ہوگئی۔پھر فنی اعتبار سے بھی دیکھیے تو کلام الگ پختہ اور حافظ و اقبال سے تو انھیں خاص عقیدت معلوم ہوتی ہے۔کسی سے ہیٹے وہ اب بھی نہیں اور کچھ روز میں مزید مشق و پختگی کے بعد تو عجب نہیں کہ استادوں کی صف میں نظر آنے لگیں۔

صدق جدید، نمبر 19، جلد 1، 6/ اپریل 1951

(133) کشکول مجذوب:

از خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوبؔ

ضخامت 288+6 صفحات، قیمت چھ روپے

کتب خانہ امداد الغربا، متصل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، (یو پی)

ماضی قریب کے شعراء میں خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ خاص رنگ کے مالک۔ آپ شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب خلفاء میں تھے، اور اپنے مرشد کے عاشق زار، ان کے فیض صحبت سے کلام جو پہلے ہی پر کیف اور وجد انگیز تھا اور زیادہ پُر کیف اور عاشقانہ سے بڑھ کر عارفانہ ہوگیا۔ شاعر کا تخلص پہلے حسن تھا، مرشد کے ارشاد کے مطابق اسے مجذوب سے بدل دیا۔ مرشد کے یہاں انھیں وہی درجہ حاصل تھا جو حضرت نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں امیر خسروؒ کو حاصل تھا۔ اسی بنا پر آپ کو خسرو بارگاہ اشرفی کہا جاتا تھا۔

حضرت مجذوب نہایت ذہین و پر گو شعراء میں تھے، لیکن کلام میں بلا کی جاذبیت تھی۔ سخت سے سخت زمینوں میں ان کی روانی طبع جان ڈال دیتی تھی۔ موجودہ مجموعہ ان کے مکمل دیوان کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ مرتب کو جس قدر کلام جہاں سے بھی مل سکا اسے انھوں نے کشکول کے نام سے شایع کردیا۔ پورے دیوان کا مسودہ کہا جاتا ہے کہ مرحوم کے صاحبزادوں کے پاس موجود ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ ان کے کون سے مصالح اس کی اشاعت میں مانع ہیں۔

اس کشکول کی ترتیب یوں ہے اولاً حمد و نعت، بعد ازاں غزلیں ردیف وار نظمیں، قند پارسی کے عنوان سے فارسی کلام اس کے بعد اشکہائے عقیدت (مرثیے)، حقائق و بصائر پر مشتمل یہ قطعات جس کا خاص جزء تعلمات اشرفیہ منظوم ہیں۔ اور آخر میں 16 صفحات کا ضمیمہ جس میں حضرت مجذوب کی بعض مشہور و معروف نظمیں نئی

روشنی، نعرۂ جانباز وغیرہ شامل ہیں۔ مجذوب کا کلام شروع سے آخر تک جاذب قلب ہے۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑگئی لو شمع محفل کی | پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی
خلاصہ مجھ سے سن لے کوئی آداب محبت کا | دعائیں دل میں دینا ظلم سہنا، بے زباں رہنا
کیا کہوں دنیا میں کیوں کر رہا | عمر بھر جینا مجھے دوبھر رہا
کبھی نظر میں جمال تیرا کبھی نظر میں جلال تیرا | بس اب ہے دل اور خیال تیرا کسی کا اس میں گزر نہیں ہے
وہی بزم دوعالم مری تنہائی ہے | خانۂ دل میں عجب انجمن آرائی ہے
ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی | اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تعلیمات اشرفیہ منظوم کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہاں جام یہ جام اس کی محبت کے پیے جا | دل سے لگائے ہوئے نام اس کا لیے جا
ذکر میں اور فکر میں دن رات لگا رہ | انجام کو چھوڑ اس پہ، خود اپنی بنی کیے جا

صدق جدید، نمبر 22، جلد 1، 12 رمئی 1951

(134) فانوس

کلام شفیق صدیقی جون پوری

176 صفحہ، قیمت دو روپیہ، دفتر بزم ادیق واخبار ''نئی دنیا'' جونپور (یوپی)

جونپور کا نام قدرۃً حفیظ جونپوری کی یاد دلاتا ہے۔ یہ وہیں کے ایک مشہور خوش گوشاعر شفیق کے کلام کا مجموعہ ہے۔ شفیق غزل کے بھی شاعر ہیں اور ملی شاعر بھی۔ اور یہ دونوں رنگ ملے جلے ان کے اس مجموعہ میں موجود ہیں۔ جوان ہونہار فرزندِ دل بند کی وفاتِ حسرت ناک کی چوٹ بھی کھائے ہوئے ہیں۔ اور شروع کے چند صفحہ اس ماتم کی نذر ہیں۔

کتاب کا بیشتر حصہ غزلیات کے لیے وقف ہے۔ رباعیاں، قطعے اور دوسری نظمیں، خانگی، سیاسی وقتی عنوانات پر بھی خاصی بڑی تعداد میں ہیں۔، رنگ تغزل کا نمونہ یہ ہے۔

کفر و ایماں کے فسانے نہیں درکار مجھے
چاہیے ذرۂ درد ''دل عطّار'' مجھے
جرم بخشیں کہ نہ بخشیں یہ شرف کیا کم ہے
کہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گنہگار مجھے
میں نے بھی سارے زمانہ کو فراموش کیا
جب سے تو بھول گئی اے نگہ یار مجھے

شفیق کا شمار کہنہ مشق اور محتاط شاعروں میں ہے۔ وہ زبان، فن، جذبات عموماً تینوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور تصوف کی چاشنی سے بھی ناآشنا نہیں۔ شروع میں ایک بڑی مفصل تحریر ''مقدمۂ شعروادب'' کے عنوان سے ہے، جو کسی قدر منتشر ہونے کے باوجود پُر معلومات اور ادب آموز ہے۔

غزلیں بیشتر عام عاشقانہ رنگ کی ہیں۔ لیکن اس قسم کے شعر بھی جا بجا غزل کے درمیان آگئے ہیں۔

چل اے مزدور ملت گولیوں کی سنسناہٹ میں
شہادت جھوم اٹھے کاندھوں پر نعش پائمال آئے

قطعات کے حصہ میں ایک قطعہ بیگم مرحومہ مولانا محمد علیؒ کی وفات پر ہے۔

اے مقتدائے قوم کی بیگم تجھے سلام
عظمت شناس سارۃ و مریمؑ تجھے سلام
نازاں ہیں تیری ذات پر احرار ملک وقوم
ہندوستان کی خالدہ خانم تجھے سلام

اس میں سارۃ و مریمؑ تو بے شک معروف و معلوم ہستیاں ہیں، لیکن خالدہ خانم پر تعارفی حاشیہ ضروری تھا، اگر ترکیہ کی خالدہ ادیب خانم مراد ہیں، تو ان کے اس درجۂ عظمت میں کلام ہے کہ بیگم مرحومہ کو ان سے تشبیہ دی جائے۔

شروع میں فہرست مضامین ہونا ضروری تھی۔

صدق جدید، نمبر 14، جلد 2، 7/ مارچ 1952

(135) ترجمانِ اسرار

از آنریبل جسٹس شیخ عبدالرحمٰن صاحب

124x48 صفحہ، مجلد مع گردپوش، طباعت ٹائپ میں۔ قیمت تین روپیہ
مکتبۂ کاروان، ایبک روڈ، انارکلی، لاہور۔

یہ اقبالؒ کی مشہور اور ابتدائی مثنوی اسرارِ خودی (فارسی) کا منظوم اردو ترجمہ ہے، پنجاب ہائی کورٹ کے ایک فاضل جج اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے قلم سے، اقبال کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد اسی اسرارِ خودی سے پڑی اور اس لیے اس کا اردو میں منتقل ہوآنا اردو خوانوں کے حق میں بہرحال ایک نعمت اور اردو ادبیات کے سرمایہ میں بہرصورت ایک اہم اضافہ ہی سمجھا جائے گا۔ باقی ہے یہ کہ شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں تقریباً ناممکن ہے، تاوقتیکہ مترجم خود بھی اسی پایہ کا شاعر نہ ہو۔ اور بجائے ترجمہ کرنے کے اصل کلام کو سامنے رکھ کر اپنی زبان میں شعر اسی زور و شور سے کہہ دے، مترجم غریب کا علم و فضل ہرگز کافی نہیں، اصل سوال تو کلام کے تاثیر و تاثر کا ہے جو ناقابلِ انتقال ہے۔

فاضل مترجم اپنی جگہ پر بڑے عالم و فاضل ہوں گے۔ کلامِ اقبال کو سمجھے بھی خوب ہوں گے (اور مترجم انگریزی ڈاکٹر نکلسن سے تو وہ یقیناً زاید کلامِ اقبال کو سمجھے ہیں)، ترجمہ میں احتیاط بھی بڑی برتی ہوگی، وقت بھی بہت صرف کیا ہوگا، یہ سب کچھ سہی، اور اس سب کا اجر بھی انھیں ملنا یقینی ہے، لیکن اب اسے وہ غریب کیا کریں کہ ان کے کلام میں رس زرا سا نہیں۔ اور صفحہ کے صفحہ پڑھتے جایئے وجد و حال کی کیفیت ایک بار بھی طاری نہ ہوگی۔ حالاں کہ اصل مثنوی کا ایک صفحہ بھی کیف و حال سے خالی نہیں! ۔عشق و مسائلِ عشق پر مقالۂ تحقیقی تیار کردینا اور ہے اور عاشق ہونا کچھ اور، گنجایش اگر ہوتی، تو اصل و ترجمہ دونوں سے متعدد مثالیں نقل کر کے بات اور زیادہ

واضح کردی جاتی۔

ایک عرض گستاخانہ کی ضرورت بے ادب تبصرہ نگار کو محسوس ہو رہی ہے۔ اردو محاورات کی باریکیوں پر پورا عبور اہل زبان کی صحبت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ فاضل مترجم کو ادھر مزید توجہ کی حاجت تھی ''نری مٹی کو پیر روم نے اکسیر کر ڈالا'' ص:7 ''مرے خامہ کو اس نے شاخِ نخلِ طور کر ڈالا'' ص:13، اب کیا عرض کیا جائے کہ فعل ''کر ڈالا'' مدح کے ان دونوں موقعوں پر زبان کے ذوق سلیم کو کس قدر کھلتا ہے! یا اس قسم کے مصرعہ:

قلم میرے نے رازِ نہ فلک سب کر دیئے افشا (ص:12)

جگر اپنے کو تو بیگانۂ محشر سے ٹکرا دے (ص:9)

یہاں پر جو بیتی ہے اس کے شانِ خیبر کی (ص:72)

جو اپنے تاک سے ہو بادۂ روشن کا متلاشی (ص:72)

تو اے جو مثلِ گل نازک بدن سے سنگ خارا ہو

تری بنیادِ دیوارِ چمن کا تب سہارا ہو (ص:73)

''کوئی ہے اور''؟ کا نعرہ تھا تیغ اپنی کو سکھلاتا (ص:97)

نہاں ہے تیری نظروں سے مگر چشمِ سینہ تیری (ص:105)

چنارِ پُر شکوہ کو دیکھتی ہے آنکھ حیرت سے (ص:18)

ہمیشہ جلتے رہنا قسمتِ پروانہ میں آیا

مگر جلنے کا عذر اس نے ضیائے شمع میں پایا (ص:19)

اب کیا کہا جائے کہ لکھنؤ، دہلی کے ادبی و شعری حلقوں میں کس نظر سے دیکھے جائیں گے۔

ان معروضات سے مترجم کی محنت و جانفشانی کی کسی طرح سے تحقیر و بے وقعتی ہرگز مقصود نہیں۔ اردو خوانوں کا وہ طبقہ جو اقبال کے محض مطالب کلام کو سمجھ لینا چاہتا ہے۔ ان کے لیے یہ خشک و بے جان کتاب بھی بالکل کافی ہے۔ افسوس صرف

اس کا ہے کہ اس کوشش میں کسی اچھے شاعر یا زبان داں کو شامل نہ کرلیا گیا۔ اور پاکستان میں یقیناً ایسے حضرات کی کمی نہیں۔ کراچی میں ماہر القادری ہیں اور خاص لاہور میں سالک صاحب ہیں شوکت تھانوی ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اُس وقت یہ چیز ہی کچھ اور ہوتی۔

شروع میں 4 صفحہ کا دیباچہ مترجم کے قلم سے ہے۔ اور 40، 42 صفحہ کا لمبا چوڑا مقدمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے قلم سے۔ یہ مقدمہ گو دلچسپ و سلیس ہے، پھر بھی عوام کے کام کا نہیں۔ صرف اونچے تعلیم یافتہ ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک شکایت ناشر سے: فہرست مضامین کی غیر موجودگی ناقابل معافی ہے۔ کاغذ، چھپائی، وغیرہ قابل داد، طباعت لیتھو میں نہیں ٹائپ میں ہے، ناظرین اس کو خیال میں رکھیں۔

صدق جدید، نمبر 16، جلد 2، 21/ مارچ 1952

(137) نقدِ رواں

از چودھری جگت موہن لال رواں آنجہانی ایڈوکیٹ

ضخامت 24+138 صفحہ۔ افسوس ہے کہ کتاب پر نہ قیمت درج ہے نہ ملنے کا پتہ۔

ضلع اوناؤ کے چودھری جگت موہن لال رواں بی اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ۔ چند سال قبل اردو کے ایک اچھے شاعر تھے۔ بیچارہ کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ اور زیادہ شہرت و امتیاز حاصل کر لیتے۔ کالجی تعلیم لکھنؤ میں پائی، اور یہیں شاگردی عزیز لکھنوی کی اختیار کی۔ رباعیات و غزلیات کے مجموعے شاید اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مثنوی انتقال کے کئی سال بعد اب نکلی ہے۔

نقدِ رواں کی ترکیب کچھ دلنشیں نہ ہوئی۔ غالباً ''سکہ رواں'' کے معنی میں ہے دیباچہ 8/7 صفحہ کا نواب جعفر علی خاں اثر کے قلم سے ہے خدا معلوم ان کی نظر کیسے اس بارہ میں چوک گئی۔ اس کے بعد 14 صفحہ کی مفصل ''تقریظ'' بابو کرشن سہائے ہتکاری وحشی کانپوری کے قلم سے ہے جس میں کتاب کا پورا تعارف آ گیا ہے اس کے بعد اصل مثنوی شروع ہوئی ہے اور اچانک بغیر کسی عنوان افتتاحی کے شروع ہو جاتی ہے۔ صفحہ 6 سے عنوانات شروع ہوتے ہیں اور ختم کتاب تک چلتے ہیں۔ لیکن چوں کہ کوئی فہرست مضامین کسی قسم کی بھی موجود نہیں، اس لیے یہ تقسیم ابواب و عنوانات پڑھنے والے کے کچھ زیادہ کام نہیں آتی۔ صفحہ 123 پر دفعۃً ایک عنوان ''دفتر ہشتم'' نظر پڑتا ہے۔ ''دفعۃً'' اس لیے کہ اس سے قبل نہ کہیں دفتر اول ملتا، نہ دفتر دوم، نہ دفتر ہفتم تک کوئی اور دفتر! ۔غرض یہ ہے کہ جن صاحبوں نے مسودہ کو ایڈٹ کیا ہے انھوں نے اپنی بے پروائی یا ناکردگی سے وفات یافتہ مصنف کے حق میں ذرا بھی انصاف نہیں کیا، بلکہ سرتاسر ظلم ہی کیا ہے۔

مثنوی عاشقانہ نہیں عارفانہ ہے۔ گل و بلبل کی حکایتیں نہیں۔ مہاتما گوتم بدھ

کے حالات وتعلیمات منظوم ہیں۔ اور مثنوی کی بحر بھی شاعر نے وہ رکھی ہے، جسے مولانائے روم کے مشہور عالم مثنوی، مضامین، تصوف وعرفان کے لیے مخصوص کر چکی ہے۔ یعنی فاعلات ''فاعلات'' فاعلات۔ اس بحر کا انتخاب وجد انتخاب اور پھر شاعرانہ انکسار یہ ساری داستان خود شاعر کی زبان سے سنیے۔

کی نگاہ نکتہ رس نے منتخب
داستان گوتم عالی نسب
سامنے اب دوسری مشکل یہ تھی
نظم ہو کس بحر میں یہ مثنوی
بحر گلزار نسیم نکتہ داں
یا حسن کی مثنوی سحر البیاں
یا کہ وہ جس کی ہے اک عالم میں دھوم
شاہکار طبع مولانائے روم
آخر کار آ کے عاجز میں نے کی
پیروی مولوئ مثنوی
سب سے مشکل امرِ تقلید زباں
میں کہاں فخر زباں دانی کہاں

گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات ایک خشک سا موضوع ہے۔ اسے دلچسپ و عام پسند بنانا آسان نہیں۔ رواں نے محض اپنے حسن بیان کے زور سے کلام میں روانی بلکہ خاصی حد تک رنگینی پیدا کر دی ہے۔ ''عشق کا وصف ان کی زبان سے سنیے اور ممکن ہو تو مثنوی مولانائے روم کا بھی وہ مشہور مقام ذہن کے سامنے لے آیئے۔

شاد باش اے عشق سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے وہ اے نخوت وناموس ما
اے تو افلاطون وجالینوس ما

روان صاحب اس کوچہ میں آکر یوں رواں دواں ہیں ۔

عشق جانِ آرزو جانِ وفا
عشق ہی تکمیل ایمان وفا
عشق ہی سرتا سر کار حیات
عشق ہی نقاد اسرارِ حیات
عشق ہی نبض بہار زندگی
عشق ہی آئینہ دار زندگی
عشق ہی سر منزل بود و نبود
عشق ہی سرمستی کیف وجود
عشق ہی شمع بساط اہل دل
عشق ہی وجہ نشاط اہل دل (ص:29)

کلام میں جا بجا فارسیت نمایاں ہوگئی ہے۔ مثلاً رانی جسودہا کی ہجراں نصیبی کا ایک منظر ۔

ہر نظر اک شرح وردِ اشتیاق
ہر تصور ایک تصویرِ فراق (ص:100)

اس غم نصیب کی آواز کے ذکر میں ۔

موج نور آئینہ سوزِ فراق
جلوہ ریزِ شعلہ ہائے اشتیاق (ص:105)

جشن عقد کے موقع پر خیموں کی آراستگی کی ذیل میں ۔

پوستین و شاخہائے بے شمار
حاصل سرگرمیِ سیر و شکار (ص:45)

ایک اور موقع ۔

راحتِ مردان، سکون مستعار
مکر زن ایک بحر ناپیدا کنار (ص:4)

لیکن یہ رنگ ہر جگہ نہیں بہت سے شعر صاف سادہ و سلیس ہیں۔ مثلاً:

کوچۂ الفت کی راہیں اور ہیں
دلنوازی کی نگاہیں اور ہیں (ص:31)
جو بھی لڑکی امتحاں میں آئے گی
کچھ نہ کچھ انعام لے کر جائے گی ،،
یہ بھی گر تدبیر خالی جائے گی
اور کچھ صورت نکالی جائے گی (ص:32)
یوں نگاہوں سے نگاہیں مل گئیں
جس طرح جائیں دو بچھڑے کہیں (ص:34)
آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے
تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے (،،)

اردو لفظوں کی فارسی ترکیب (اضافت کے ساتھ) کا عیب عام ہے اچھے اچھے نامور شاعر اور ادیب اس میں مبتلا۔ اس سے یہ مثنوی بھی خالی نہیں مثلاً ''رقص مور'' (ص:30) ''دعوت شادی'' (ص:45) 'شادی' اس معنی میں اردو ہے۔

ایک آدھ جگہ اردو محاورہ کی صحت بھی نظر ثانی کی محتاج رہ گئی۔ اور نظر ثانی کا موقع ہی جواں مرگ شاعر کو کب ملا جیسے اس شعر کا دوسرا مصرع۔

پہلے اس کوشش میں سرگرداں رہا
رات دن غلطاں رہا پیچاں رہا

''غلطاں و پیچاں'' محاورہ میں ایک ساتھ آتے ہیں لیکن اس ترکیب کو تو ذکر مستقل ''پیچاں رہنے'' کا استعمال زرا نامانوس سا ہے۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی ایک اچھے اور ہونہار شاعر کی قابل قدر کاوش اور قابل داد کوششوں کا نمونہ ہے۔

صدق جدید، نمبر 31، جلد 2، 4/ جولائی 1952

(137) تجلیات

از مولانا ضیاء احمد صاحب ضیاء ایم۔اے

64 صفحہ قیمت درج نہیں۔آزاد کتاب گھر کلاں محل۔دہلی

ضیاء بدایونی علی گڑھی کا نام اب نعتیہ اور مذہبی نظمیں کہنے والوں میں نامانوس یا غیر معروف نہیں۔ ہر رسالہ انھیں چھاپنا اپنے لیے باعث فخر و مسرت سمجھتا ہے۔ان کا ایک پرانا مجموعہ کلام آج سے 25 سال قبل 1928 میں تذکار سلف کے نام سے نکلا تھا۔اور اس پر مدیر صدق (سچ مرحوم) نے اپنی تقریب میں یہ لکھا تھا۔

''مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص تھے، جنھوں نے آج سے پندرہ سال قبل اس قسم کا سلسلہ نظم اردو میں صحیح اصول پر شروع کیا اور سرور کائنات صحابۂ کرام و مشاہیر تاریخ اسلام کے بیسوں واقعات دلکش انداز میں نظم کر ڈالے۔مرحوم کے بعد ان کے تتبع میں کہنے والے متعدد پیدا ہوئے۔لیکن اس طرز میں اس رسالہ کے مؤلف سے زیادہ کامیاب میں نے اب تک کسی کو نہیں پایا۔انھوں نے نہ صرف نوعیت عنوانات میں بلکہ انداز بیان نشست الفاظ، بحور نظم، مصرعوں کی ترکیب، غرض ہر شے میں مولانا شبلی کا پورا چربا اتار لیا ہے۔اور اس کامیابی پر وہ مستحق تہنیت ہیں''۔

وہی نظمیں مع اور نظموں کے اضافہ، 25 سال بعد اس نئے نام سے شائع ہوئی ہیں۔اور اب داد کی کچھ اور زیادہ ہی مستحق ہوگئی ہیں۔

نظمیں چھوٹی بڑی بہت سی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔افسوس ہے کہ اس پر نہ نمبر پڑے ہیں نہ شروع میں کوئی فہرست مضامین ہے اور مرتب ظہیر احمد صدیقی ایم۔اے۔ اپنا فرض شاید اس قدر سمجھے کہ بغیر خود محنت کیے ہوئے صرف اصل منظومات کاتب کو نقل کے لیے دے دیں۔تنوع کا اندازہ ان عنوانات سے ہوگا: خلق عظیم، الفقر فخری، عدل فاروقی، اسوۂ حسینی۔بعض مرثیہ مشاہیر عصر کے ہیں۔مثلاً اقبال، حسرت

موہانی، اور مولانا عبدالماجد بدایونی کی وفات پر ماتم۔ نظمیں عموماً اردو ہی میں ہیں۔ لیکن ایک نظم ماتم اقبال، فارسی میں بھی ہے۔ اور اردو نظموں میں بھی عربی و فارسی مصرع بلکہ کہیں کہیں پورے شعر کا شعر۔ جا بجا اور بے تکلف آگئے ہیں۔ بعض جگہ آیات قرآنی کی کہیں بجنسہ کہیں خفیف تصرف کے بعد، تضمین بھی خوب آگئی ہے۔ مثلاً

آبیاری سے انھیں کی ہے ریاض اسلام مورد انبعته الله نباتا حسنا
صبغه الله ومن احسن منه صبغة رنگ میں اپنے وہ رنگ لے تو مقدر کے نثار

شاعری اور حسن بیان و زبان کا نمونہ دیکھنا ہو، تو عنوان ''نذر عقیدت'' کے ماتحت یہ چند شعر پڑھ لیجیے۔

جمع ہیں سبطِ مصطفیٰ تجھ میں صفات سروری شان و شکوہِ جعفری جاہ جلال حیدری
راہ خدا میں گھر دیا سجدۂ حق میں سر دیا نام وفا کا کر دیا تو نے زہے دلاوری
باغ رسول کے ثمر کان بتول کے گہر تیرے وجود پاک پر ختم ہے پاک گوہری
تجھ میں عجب ثبات ہے غیر میں کب یہ بات ہے خلق میں تیری ذات سے معجزہ ء پیمبری
تھے کئی اور نیک نام کس سے ہوا مگر یہ کام ہے یہ عزیمت اے امام تیری دلیلِ برتری

نمونہ محض شاعری و رنگ کلام کے اعتبار سے پیش کیا گیا کتاب العقائد کے کسی باب کی حیثیت سے نہیں...... آخر میں کچھ متفرق نظمیں بھی ہیں اور خاتمہ پر سعدی کے مشہور قطعہ ''جمال ہم نشیں'' کا اردو منظوم ترجمہ۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 4، یکم جنوری 1953

(138) اجالے

از انجم فوقی بدایونی

46 صفحہ مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپیہ آٹھ آنے، نظامی پریس بدایوں۔

بدایوں کو شعر و ادب سے قدیم مناسبت چلی آرہی ہے۔ ماضی قریب میں اس کی ایک روشن مثال فانی بدایونی کی ذات ہوئی ہے۔ انجم صاحب بھی اسی مردم خیز خاک کی پیداوار ہیں۔ اور یہ ان کے کلام کا تازہ مجموعہ ہے --- کلام کل 64 صفحہ کے اندر آ گیا ہے اور 80 صفحہ مقدمہ، پیش لفظ، تبصرہ وغیرہ کے لیے وقف ہیں! پہلے ڈھائی تین صفحہ کی ''عرض مرتب'' شاعر کے چھوٹے بھائی کی طرف سے، دو صفحہ کا انگریزی میں FOREWORD سشن جج شری برج نارائن کے قلم سے۔ پھر ایک بڑا طویل مقدمہ ایک ایم، اے، ال، بی، وکیل صاحب کا لکھا ہوا یا ان سے لکھوایا ہوا ہے۔ اس کے بعد 10 صفحہ کا تبصرہ ایک ہم وطن شری راو ہارمن جوش کی طرف سے ہے جس میں یہ ساری اطلاعات درج ہیں، کہ بمبئی کے فلاں ویکلی نے فلاں سنہ میں اور بھوپال کے فلاں ماہنامہ نے فلاں سال کے فلاں مہینہ میں، اور دہلی کے فلاں رسالہ نے فلاں زمانہ میں شاعر صاحب کے کلام پر رائے یوں اور یوں ظاہر کی تھی!

وکیل صاحب عدالتی مقدموں کے عادی، جب ان سے اس ادبی و شعری مقدمہ کی جبری فرمائش ہوئی، تو ان بیچاروں نے اپنا یہ بیان بھی صاف صاف دے ڈالا۔

''اس سوال کے جواب میں کہ مقدمہ کس کا ہوگا، انگلیاں میری جانب اٹھنے لگیں۔ ہزار عذر کیے کہ میں ہمہ وقت مصروف انسان جسے وکالت کا پیشہ مرنے تک کی فرصت نہ دے، کس طرح اس فرصت طلب خدمت کی حامی بھرلوں لیکن جو انگلیاں اٹھ چکی تھیں انھوں نے سمت بدلنے سے انکار کر دیا، اور باوجود عدیم الفرصتی اور کم

مائیگی علم و ہنر کے اس بارگراں کے لیے مجھے خود کو تیار کرنا ہی پڑا......میں نے یہ خدمت خود اپنے ذمہ نہیں لی۔ بلکہ مجھ پر یہ جبراً لادی گئی ہے'' (12)

اس جبری مقدمہ کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو ہے کہ اس میں انجم صاحب کو خواہ مخواہ اور بالکل بلاضرورت کہیں فانی سے اور کہیں اصغر سے اور سب سے زیادہ غالب سے بھڑایا گیا ہے---تعارف کی اتنی ساری کوششیں بھی جیسے ناکافی تھیں۔اس لیے شاعر کے ایک نہیں دو دو فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں!......اس سے تو وہ پرانے شاعر غریب۔تعلی و خودستائی کے لیے بدنام، بہت غنیمت تھے، جو اپنے دیوان پر لمبی لمبی تقریظ دل پذیر اور قطعات تاریخ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے لکھوالیا کرتے تھے۔

انجم ایک ہونہار شاعر ہیں۔ان کا کلام واقعی لطیف و مزہ دار ہے ان کے کلام کے لیے خود انھیں یا ان کے دوستوں کو اتنے اشتہاری تکلف'' اہتمام اور طمطراق کی خواہ مخواہ کیا ضرورت تھی---مشک اپنی خوش بو خود دے رہا ہے۔عطار کے ڈھول پیٹنے نے سلیم الطبع گاہکوں اور قدر دانوں کو قریب نہیں بلایا، کچھ ان کا دل کھٹا ہی کر دیا ہے، نئے شاعر کو شروع میں اگر کسی سہارے کی ضرورت تھی، تو کسی مستند ادیب سخن سے دو چار صفحہ کا تعارفی مضمون لے لینا بالکل کافی تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

پہلے میں نے صبح سے پوچھا تمہیں پھر شام سے | اس لیے دونوں کو نسبت ہے دل ناکام سے
مٹ نہیں سکتی محبت مرگ بے ہنگام سے | میں پکارا جاؤں گا برسوں تمہارے نام سے
تغافل اور پھر وہ بھی مجھ ہی سے | سلام ایسی ادا کو دور ہی سے
تیری خاطر خدائے زندگی سے | بجز غم اور کیا مانگوں خوشی سے
خوابِ غفلت بھی طلسمِ شبِ تنہائی ہے | جاگ اٹھا ہے زمانہ مجھے نیند آئی ہے
حسن خود منتظرِ چشمِ تماشائی ہے | منظرِ عام پر آنا میری رسوائی ہے
دل میں دنیائے محبت کو لیے بیٹھا ہوں | بزم کی بزم ہے تنہائی کی تنہائی ہے
حسن تماشا عشق جنوں | ایک روش پر دونوں کیوں

پھیر لو نظریں لیکن یوں پھر نہ کوئی امید کروں
حاصل دنیا تم ہی سہی غور کرو تو میں بھی ہوں

یہ دس شعر یقین ہے کہ شاعر کا عام رنگ سخن دکھانے کے لیے بالکل کافی ہو جائیں۔ انجم کا اپنا ایک مستقل رنگ سخن ہے۔ وہ کسی کے مقلد جامد نہیں۔ پھر بھی ایک حد تک انھیں مناسبت فانی و اصغر سے ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب عام دستور کے مطابق ردیف وار حروف تہجی کے حساب سے نہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخی اعتبار سے ہو اگر یہ ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا۔ شروع میں ایک طویل غلط نامہ درج ہے۔ لیکن عجیب نہیں جو کچھ غلطیاں ان کے علاوہ بھی رہ گئی ہوں۔ انجم کا کلام محض الفاظ کا کھیل تماشا نہیں معنویت بھی ساتھ ساتھ ہے، اور جا بجا وحدت الوجودی تصوف کے مقامات کی ترجمانی۔ بحیثیت مجموعی، فضا کی اس تاریکی میں یہ صالح و صحت مند ادبی تخلیق قابل قدر و مستحق داد ہے۔

صدق جدید، نمبر 31، جلد 4، 2 جولائی 1954

(139) روح کلام غالب

از مرزا عزیز بیگ صاحب

نظامی پریس، بدایوں۔

کتاب کا نام خود ایک شاعرانہ معمہ ہے اور نام سے کتاب کی نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ کتاب دراصل دیوان غالب کی شرح ہے ایک بالکل نئے انداز کی۔ مرزا سہارنپوری مرحوم (متوفی 1920) اپنے استاد سوزاں کے واسطے سے غالب کے شاگرد تھے۔ گو اپنی زندگی میں شعر و شاعری میں کوئی خاص شہرت حاصل نہ پائی۔ لیکن ایک کام ایسا عجیب کر گئے جو ان کے سوا اور کسی سے نہ بن پڑا۔ کیا کیا کہ غالب کا دیوان سامنے رکھ کر اس کی ہر غزل کو مخمس کر دیا یعنی ہر شعر پر اپنی طرف سے تین تین مصرعوں کی تضمین کر دی۔ کلام غالب کی یہ ایک بالکل اچھوتی خدمت ہے۔

کل غزلیں 136 ہیں جن پر یہ تضمین کی گئی ہے۔ آخر کی دو ایک غزلیں ایسی ہیں جو مطبوعہ دیوان غالب کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتی ہیں۔ تضمین کوئی آسان کام نہیں اور پھر غالب کے سے نکتہ ور کے کلام کی روح تک پہنچنا اور پھر اس کے رنگ میں ملا دینا تو کارِ دارد۔ تضمین خمسہ کی جان تیسرا مصرعہ ہوتا ہے اور کم از کم اس تیسرے مصرعہ کی حد تک تو مرزا اکثر کامیاب رہے ہیں۔

نمونہ ملاحظہ ہو غزل 40 ردیف ز زمین جہاں عزیز ایمان عزیز۔

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز.. کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز کیوں کر اس بت سے رکھوں جاں
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مشکل اس کا ہے نکلنا دل سے ہے تعلق بھی بلا کا دل سے

تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے

ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

شروع میں ایک دلچسپ مقدمہ نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی مرحوم ایڈیٹر ذوالقرنین کے قلم سے ہے اور مرزا مرحوم کے حالاتِ زندگی ان کے ایک عزیز قریب کے قلم سے۔ بہتر یہ ہوتا کہ ان حالات کے ضمن میں مرزا کے کلام کے کچھ نمونے بھی دے دیئے گئے ہوتے۔

صدق نمبر 4 جلد 16 مورخہ 26/مئی 1950

(140) کلیات ولی

مرتبہ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی

49+32+54 صفحات قیمت پانچ روپیہ، انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ۔ کراچی (پاکستان)

ولی جو ایک زمانہ میں اردو شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے تھے، اور اب بھی ان کا شمار اردو کے قدیم ترین شاعروں میں ہے۔ یہ ان کے کلیات اردو کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اور یہ سید نورالحسن ہاشمی ایم اے (لکھنؤ) پی ایچ ڈی (علیگ) کا مرتب کیا ہوا، جو اس قسم کے کاموں کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1927 میں احسن مارہروی مرحوم کا ترتیب دیا ہوا نکلا تھا۔ دوسرا ایڈیشن 1945 میں موجودہ ایڈیٹر کا ایڈٹ کیا ہوا شائع ہوا اور اب یہ تیسرا ایڈیشن 1954 میں اچھے خاصہ ترمیم وحک و اضافہ کے بعد نکلا ہے۔ ولی کے کلام پر رائے زنی کا یہ موقع نہیں۔ یہ مختصر تعارف تو صرف اس تیسرے ایڈیشن کا کرنا ہے۔

دوسرے ایڈیشن کے مقابلہ میں اس میں مثنوی قصیدہ ترجیع بند، مخمسات، رباعیات کی تعداد کچھ گھٹ گئی ہے۔ پچھلے ایڈیشن کی املائی غلطیوں اور بے ترتیبوں کی اصلاح بھی ایک حد تک اس میں کردی گئی ہے۔ اور ولی کا جو جدید حاصل شدہ کلام اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس کی توضیح بھی مرتب نے اپنے مفصل دیباچہ میں کردی ہے۔ مرتب کا اپنا دیباچہ اس ایڈیشن میں 9 صفحہ کا ہے...... باقی مقدمہ اور ضمیمہ کلام اور فرہنگ الفاظ مانوس وغیرہ تو طبع ثانی میں بھی تھے۔

دیباچہ میں ہندوستانی زبان وادب کے ایک مشہور فرنگی محقق بوم ہارٹ کی بھی ''تحقیق'' کا بڑا دلچسپ ذکر آ گیا ہے۔ اس کا خلاصہ سننے کے قابل ہے۔ کلیات کے دو قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہیں صاحب موصوف نے ان میں سے ایک نسخہ سے متعلق لکھا ہے کہ اس میں دو قصیدے شاعر نے اپنے گجراتی دوستوں

اور عزیزوں کے فراق میں لکھے ہیں --- حالاں کہ اس میں سے ایک قصیدہ صاف در بیت مدح بیت الحرام ہے۔ اور اس کے اشعار میں کھلے ہوئے مضمون اس قسم کے موجود ہیں، کہ جو کوئی صدق دل سے بیت حرم کو دیکھ لے اس پر قیامت میں آتش دوزخ حرام ہوگی۔ یا یہ کہ سارے اہل زمین واہل سما اس کے مشتاق رہتے ہیں وغیرہا ''صاحب'' نے محض یہ دیکھ کر اس میں فراقیہ مضامین ہیں یہ سمجھ لیا کہ ان کا تعلق شاعر کے وطن ہی سے ہوگا!

دوسرے نسخہ سے متعلق موصوف نے نکتہ آفرینی یہ کی ہے کہ اس میں ایک منظوم خط ''دریا حسن'' کے نام ہے...... اس نکتہ کی کائنات کل اتنی ہے، کہ اس نسخہ میں جہاں متفرق اشعار (فردیات) دیے ہیں۔ وہاں اتفاق سے پہلے شعر کا مصرعہ ہے۔

یاد میں تجھ قد کی اے دریائے حسن

یہی 'دریائے حسن' صاحب کی تحقیق میں کسی کا نام ''دریا حسن'' بن گیا ہے! اور چوں کہ اس کے معاً بعد کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔

لکھتا ہوں میں شکستہ خط سے نامہ

صاحب کے ذہن اخاذ نے نتیجہ یہ نکال لیا کہ یہ ایک ''منظوم خط'' انھیں دریائے حسن کے نام ہے! --- فرنگی فاضلوں نے جتنی محنت مشرقی علوم کے حاصل کرنے میں صرف کی ہے۔ اس سے انکار یا ان کوششوں کی تضحیک ہرگز مقصود نہیں۔ بے شک ان لوگوں نے بہ حیثیت مجموعی بڑے بڑے کام کر دکھائے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہمارے ہاں کے جو لوگ اس طبقہ کے ہر فرد کو تقریباً معصوم اور ان کی ہر بات کو تحقیق پر آخری لفظ سمجھتے ہیں۔ بہتر ہے کہ کبھی کبھی ان حقائق پر بھی نظر کر لیا کریں۔

کتاب لیتھو میں نہیں۔ ٹائپ میں چھپی ہوئی ہے۔ اور کثرت اغلاط ان لوگوں کی رائے کی تردید کے لیے کافی ہے۔ جو لیتھو کی چھپائی کو غلطیوں کا اصل ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں فہرست مضامین کا فقدان بری طرح محسوس ہوتا ہے۔

صدق جدید، نمبر 45، جلد 4، 22 / اکتوبر 1954

(141) بھگوت گیتا منظوم یا نسیم عرفاں
از منور لکھنوی

257 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپیہ، آدرش کتاب گھر، بلبلی خانہ، دہلی۔

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی ثم دہلوی محض ایک پشتینی اور خاندانی شاعر نہیں۔ اپنی ذات سے بھی ایک کہنہ مشق اور خوش گو شاعر ہیں۔ غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ ہر صنف کلام پر انھیں قدرت حاصل ہے اور اس کا ثبوت وہ بار بار پیش کر چکے ہیں۔ گیتا کا شمار دنیا کی مشہور ترین کتابوں میں ہے۔ منور اس کا منظوم اردو ترجمہ اپنے دلی عقیدت کے جذبہ سے متاثر ہو کر کئی سال قبل شائع کر چکے ہیں۔ اور اب تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد یہ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے۔ پہلے ایڈیشن کا بھی ذکر خیر ان صفحات میں آچکا ہے۔

مثنوی کی بحر گلزار نسیم و ترانۂ شوق کی ہے۔ اور شاعر کا کمال یہ ہے کہ گیتا جیسی ٹھوس اور عرفانی کتاب کے بھی ترجمہ میں شاعری کی لطافت پوری کی پوری باقی رکھی ہے۔ شروع ہی کے دو ایک بند ملاحظہ ہوں۔ راجہ دھرتراشٹر کے پوچھنے پر وزیران کے سامنے نقشۂ جنگ یوں پیش کرتا ہے۔

(7) اے رہبرِ جادۂ حقیقت اے مرشدِ حلقۂ ارادت
ننگ ناموس کے نگہباں اے نازشِ دہر و فخرِ دوراں
اب اپنی طرف کا حال سنیے ذکرِ اہل کمال سنیے
ہیں فوج میں کون کون سردار کرتا ہوں بیان میں سلسلہ وار

(8) خود آپ ہیں رہنمائے ممتاز \ بھیشم جی ہیں شجاع و جانباز
ماہر فن جنگ میں کون ہے \ نامی ہے دلیر اسکے
کرپل آچارج مردِ میدان \ دشمن کا ہے جن سے تنگ امکاں

اشوتھاما ن و کرن رندھیر جیوٹ کی ہے سو مدت تصویر

(10) بھیشم ایسا سپاہ سالار میری افواج کا ہے سردار
حیرت سے انھیں ہر ایک ہے تکتا ان کو نہیں کوئی جیت سکتا
تھوڑا لشکر غنیم کا ہے جاری حکم اس میں بھیم کا ہے
ہمت ہے ابھی سے پست اس کی آسان ہے بہت شکست اس کی

(11) جو امر تھا وہ کر چکا عرض عم سب کے لیے ہے اب یہی فرض
ادنیٰ ، اعلیٰ ، سپاہ ، سردار ہو جائیں پے ستیز تیار
ہمت باندھیں دلیر بن جائیں لڑنے پر جب آئیں شیر بن جائیں
ہم آپ انھیں کا دم بھریں سب بھیشم کی حفاظت کریں سب

اور نکتہ چینی پر کوئی آ ہی جائے تو ظاہر ہے کہ کس بشر کا کلام اس سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ شاعر یا ادیب بڑے سے بڑے ہوں بہر حال لغزشیں سب سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ لازمۂ بشریت ہے...... گیتا کو اور بھی کئی صاحب اردو میں اپنا چکے ہیں، لیکن ہر پھول اپنی اپنی الگ خوشبو رکھتا ہے، اردو بیزاری اور اردو کشی کے اس دور میں بھی شریف ہندوؤں کی جماعت تو بدستور خدمت اردو میں لگی ہی ہوئی ہے۔

شروع میں مصنف کی تصویر کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، سید سلیمان مرحوم، ڈاکٹر بھگوان داس وغیرہم کی رائیں اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔

صدق جدید، نمبر 5، جلد 7، 30 دسمبر 1955

(142) چشمِ غزال
از فضل احمد کریم فضلی صاحب

130 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، مطبوعہ ٹائپ، قیمت تین روپیا آٹھ آنہ، اردو مرکز گنپت روڈ، لاہور۔

''میں مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ، تعارف وغیرہ کا قائل نہیں'' (ص:29) اور بے شک ایسے شاعر کو قائل ہونا چاہیے بھی نہیں، جو کچھ دوسرے نثر میں کہتے یا کہنا چاہتے ہیں، یہ سب شعر ہی شعر میں کہہ گئے ہیں...... مجموعۂ کلام کا نام ''چشم غزال'' ہے اور سرورق کے بعد ہی نظر کا استقبال یہ شعر کرتے ہیں۔

کیا کہوں کیفیت چشمِ غزال حسنِ سادہ اس کا ہے ضرب المثل
شوخ بھی معصوم بھی مغموم بھی یوں سمجھیے جیسے فضلی کی غزل

اور پھر اس کے بعد۔

پھر بھی جی میں ہے بنوں اہل ہنر میں گو خستگیِ اہل ہنر دیکھ رہا ہوں
دل پھر بھی وہی لعل و گہر ڈھال رہا ہے گو خاک میں سب لعل و گہر دیکھ رہا ہوں

یہ بھی ہولی اور آگے چلیے۔

بات دل کی نہ کبھی ختم ہوئی بات میں بات نکلتی آئی

معمّا اب بھی نہ حل ہوا ہو، تو ذرا اس ''زہر خند'' کو سنتے چلیے۔

ایک ذی علم دوست ہیں میرے تبصرے لکھ چکے ہیں بہتیرے
یوں لگے مجھ سے آپ فرمانے ''کچھ کہوں گر نہ تو برا مانے
تیرا حسن بیاں مجھے تسلیم تیرا لطف زباں مجھے تسلیم''
لیکن اس کا بھی کچھ کیا ہے خیال ....
اب ہے معیار فن کا اور ہی کچھ ....

اب زمانہ فن برائے فن کا، شعر برائے شعر کا نہیں، اب

فن برائے پرو پیگنڈا ہے پروپیگنڈے کا دور دورا ہے

اور راز کی بات کان میں سننے کے قابل یہ ہے کہ

جو کہو بات ہو وہ شعر بدوش جوش زا، جوش ریز ، جوش فروش
کچھ کرو انقلاب کی باتیں خوب ہوتی ہیں خواب کی باتیں
چاہیے کچھ نہ کچھ تو عریانی بے تکا یہ حجاب کیا معنی
اس سے ہوتے ہیں مشتعل کمسن کمسنوں ہی کے آج کل ہیں دن

آگے سارا کلام اسی متن کی شرح ہے۔ اسی مبتدا کی خبر...... فضلی کا پہلا مجموعۂ کلام نغمۂ زندگی کے نام سے مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے اور اب یہ دوسرا مجموعہ ادھر 10، 12 سال کے کلام کا نکلا ہے۔ یہ اس وقت بھی بڑے مزے کے کہنے والے تھے اور اب تو قدرۃً کلام میں پختگی اور زیادہ آ گئی ہے۔ حیرت اس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے، کہ آئی، سی، ایس۔ اور حکومت پاکستان کا ایک اعلا افسر اب تک اتنا ستھرا، لطیف اور پاکیزہ مذاق سخن کیسے قائم رکھے ہوئے ہے۔

انھیں کے الفاظ میں

''اس مجموعہ میں 40، 45 غزلیں 10، 12 نظمیں۔ چند قطعات اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ یہ میری گزشتہ 11، 12 سال کی شاعری کا قریب قریب پورا سرمایہ ہے''۔ (ص:129)

غزلیں کس انداز کی ہیں۔ اس کے لیے یہ ہلکا پھلکا سا نمونہ کافی ہوگا:

ترے ہی لیے تھی تری بن گئی غرض زندگی کام کی بن گئی
تری یاد دل میں چھپائے رہے یہاں تک کہ وارفتگی بن گئی
عجب چیز ہے دل کا سوز و گداز مری زندگی زندگی بن گئی
ستم تھی وہ فضلی ترے دل کی چوٹ جو ہونٹوں تک آ کر ہنسی بن گئی

فضلی جس طرح انتہائی خوشی کے وقت بھی قہقہہ لگانا نہیں جانتے صرف ایک ہمہ وقتی مسکراہٹ پر قناعت کرتے ہیں۔ اسی طرح انتہائے غم میں بھی وہ بین اور فغاں

سے اجنبی ہیں۔ دوسروں کے دل میں درد پیدا کرا کے اپنے آنسو کچھ پی سے جاتے ہیں۔ خاتمہ کتاب کا عنوان ''قائداعظم کی وفات پر'' ہے۔ اور اس گھڑی ان کا قلب محزون غلو و مبالغہ سے ناآشنایوں عبرتوں کے موتی سمیٹتا ہے۔

یاں احتشام قیصرو کسریٰ بھی ہیچ ہے یاں شوکت سکندر و دارا نہیں ہے کچھ
جب چاہے ہم سے لے لے وہ اپنی امانتیں جو کچھ ہے سب اسی کا ہمارا نہیں ہے کچھ
کیوں کر نہ خم بھلا سر تسلیم کیجیے حکم خدا کے سامنے چارا نہیں ہے کچھ
جب سب سہارے ٹوٹ گئے تب کھلا یہ راز اس کے سوا کسی کا سہارا نہیں ہے کچھ
اے زہرغم تجھے کوئی کب تک پیا کرے مانا کہ ہم کو گوارا نہیں ہے کچھ

شعروشاعری کو بدنام کرنے والے ہر زمانہ میں بہت سے رہے ہیں، اب بھی بہت ہیں۔ نیک نام کرنے والے تھوڑے ہی سے ہیں اور اسی اقلیت کے ایک نمایندہ جناب فضلی ہیں......۔ کتاب کے شروع یا آخر میں کسی قسم کی فہرست یا اشاریہ نہ دینا، یہ البتہ ان کی ایک ستم ظریفی ہے اور بیسویں صدی کے ناظرین کے ساتھ ایک ظالمانہ قسم کا مذاق!

صدق جدید، نمبر 6، جلد 6، 6 جنوری 1956

(143) ذوق جنون

از آل احمد صاحب سرور

250 صفحہ، مجلد مع گردپوش، قیمت چار روپیہ، ادارۂ فروغ اردو، 37 امین آباد پارک لکھنؤ۔

سرور صاحب بدایونی شاعری سے زیادہ اپنی نقادی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔غزلوں اور متفرق نظموں دونوں کا۔ گزرے ہوؤں کی بولی میں ''کلیات'' کہہ لیجیے۔(دیوان کا نام تو اب بھی پھر کہیں نظر آ جاتا ہے۔'کلیات' کو تو کوئی اتنا بھی نہیں پوچھتا)......شاعری کی نقادی کا پرانا نام سخن فہمی تھا اور سخن فہمی اور سخن گوئی دو الگ چیزیں ہیں۔دونوں میں علاقہ لازم وملزوم کا سا نہیں۔

کتاب کا نام ذوق وجنوں (عطف کے ساتھ) نہیں۔''ذوقِ جنون'' (اضافت کے ساتھ) ہے اور دونوں کے درمیان فرق محض حرفی بلکہ محض لفظی ہی نہیں معنوی ہے۔

کتاب پر خاصہ مفصل مقدمہ ''میری شاعری'' کے عنوان سے خود مصنف کے قلم سے ہے، جس میں وہ اپنی زندگی اور شاعرانہ زندگی دونوں پر تبصرے کر گئے ہیں اور کہیں کہیں اس ''درتعارف خودی گوید'' میں شاید بے اختیارانہ شاعری بھی کرتے گئے ہیں......ریڈیو میں کبھی کبھی ایک مصرع طرح آتا ہے'' کلام شاعر بہ زبان شاعر'' اور اس میں خوب طبع آزمائی ہوتی ہے۔اس مقدمہ کا عنوان بھی کچھ اسی وزن وقافیہ میں ہوسکتا تھا۔''نقد شعر بر کلام شاعر''۔

کتاب کا تعنون وادی گنگ وجمن کے نام ہے۔اور بجائے خود بہت معنی خیز ہے۔سرورق کے بعد ہی اقبال کا ایک فارسی شعر درج ہے، جس سے یہ نکلتا ہے کہ سرور صاحب کو بہ ایں ہمہ جنون ودیوانگی ''پاس گریباں''، یعنی اپنے اوپر قابو بھی حاصل ہے......اور شاعر نے یہ رائے جو اپنے متعلق قائم کی ہے، اور کرانا چاہی ہے۔کلام

سے بھی بڑی حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاعر کو اپنے وطن سے بڑی محبت ہے۔ لیکن یہ محبت اندھی نہیں حسن و جمال کے ساتھ ساتھ وہ چہرے کے داغ بھی دیکھ لیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں۔

لہک لہک کے چلی بادِ صبح آزادی — خزاں کا راج مگر پھر بھی اس چمن میں رہا
سیاہی ایک گئی اور دوسری آئی — کوئی نہ کوئی اندھیرا ہی انجمن میں رہا
کہاں سے پہنچا کہاں بڑھ کے کاروانِ حیات — یہ دیس کشمکشِ شیخ و برہمن میں رہا
بہار آئی تو کس درجہ سوگوار آئی — جنوں رہا بھی تو بس چاک پیرہن میں رہا

(ص:37)

شاعر ''ترقی پسندی'' کا داعی ہے۔ لیکن ''جمہور کے غم میں'' بھی وہ ''میر و غالب'' کے ''شگوفوں'' کو بھول نہیں گیا ہے۔ اور اپنی تہذیب کا بھی نقش قدم اسے یاد ہے۔ نئے علی گڑھ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور — اس میں سوزِ عرب و حسنِ عجم یاد رہے
کاروانِ منزلِ نو کے لیے ہم گرم سفر — اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور — میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے
محو ہوں عظمتِ شاہی کے حسیں افسانے — گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے

(عظمت پر یاد آیا کہ عربی میں بہ تحریک ''ظ'' ہے، لیکن اردو میں اب بے تکلف بہ سکون ''ظ'' سے خاص و عام سب کی زبان پر ہے۔ اس لیے اردو میں یہی تلفظ جائز سمجھنا چاہیے)

سرور صاحب نظم گوئی میں ایک خاص رنگ رکھتے ہیں، جو اور کچھ ہو یا نہ ہو پختہ ضرور ہے۔ اور ان کا رنگ تغزل بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ بس پھیکا ہی پھیکا ہے غزلوں کی تعداد اس مجموعہ میں اچھی خاصی ہے اور ایسے جاندار شعر کسی ایک آدھ جگہ نہیں بلکہ جا بجا برابر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

عشق کا رنگ آزمانے کو　　موت کے بھیس میں حیات آئی
دیدۂ شوق نے ایک رنگ جما رکھا ہے　　ورنہ آئینہ رخسار میں کیا رکھا ہے
سو حجابات کیے میری نظر نے حائل　　حسن نے گرچہ ہر ایک پردہ اٹھا رکھا ہے
دولت درد ملی، دیدۂ بیدار ملا　　لوگ کہتے تھے غم عشق میں کیا رکھا ہے
تیرے مستوں کو غرض دیر و حرم سے کیا تھی　　دل لگی کے لیے ایک شغل لگا رکھا ہے
منزل کی یہ کشش تھی کہ بڑھتے چلے گئے　　ہر گام پر لٹے ہوئے گو کارواں ملے
آج جو ہے خلشِ دل کبھی ایسی تو نہ تھی　　ہر ادا آپ کی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
چاندنی کس کے تصور کی در آئی اس میں　　زندگی پیار کے قابل کبھی ایسی تو نہ تھی

جگر کی یاد اور غالب کے احترام میں جو پیش کش کی گئی ہے وہ بجائے خود قابل قدر ہے اور دل کو یہ اطمینان دلاتی ہے کہ سرور صاحب اپنے لکھنؤ اور اپنی دہلی سے کچھ نسبت ابھی بہر حال قائم رکھے ہوئے ہیں اور ''ترقی پسندی'' کے ''کعبہ'' میں بیٹھ کر بھی حق صحبت اہل کنشت کو ابھی تک بھول نہیں بیٹھے ہیں۔

صدق جدید، نمبر 26، جلد 6، 25 مئی 1956

(144) گفتنی و نا گفتنی

از شورش کاشمیری صاحب

272 صفحہ مجلد مع گرد پوش، قیمت چار روپیہ، دفتر ہفتہ وار چٹان، 88 میکلوڈ روڈ لاہور۔

شورش کاشمیری کی نثر کی طرح ان کی نظم بھی اب کسی طویل تعارف کی محتاج نہیں، پڑھے لکھوں کے حلقہ میں خاصی معروف و متعارف ہو چکی ہے اور اس نے تبصرہ نگار کے کام کو بہت ہلکا کر دیا ہے۔

شورش آدمی طبیعت دار و موزوں طبع ہیں۔ ذکی و ذہین ہیں، شوخ مزاج و شوخ نگار ہیں اور یہ سارے وصف ان کے کلام سے پھوٹے پڑتے ہیں۔ لیکن وہ جس درجہ کے شاعر ہیں اس سے کچھ بڑھ کر خطیب ہیں۔ اور شاید اس سے بھی کچھ بڑھے ہوئے صحافی ہیں۔ ان کی شاعرانہ ذکاوت ان کی خطابت و صحافت کے دہرے دہرے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ صلاحیتیں ان میں ادبی و شعری اعلا درجہ کی موجود ہیں، لیکن کاش اسی مناسبت سے صحبت و تربیت بھی اعلا درجہ کی مل گئی ہوتی!

پیش نظر کتاب ان کا دیوان نہیں کہنا چاہیے کہ کلیات ہے۔ (اب کلیات ہی کی اصطلاح کو سمجھنے والے کتنے باقی رہ گئے ہیں) یعنی اس کے اندر ان کی غزلیں نظمیں، سب ہی کچھ ہیں۔ ملی جلی ہوئی۔ ایک دوسرے سے دست گریباں اور سب کے شروع میں ان کے قلم سے ایک بانکا مقدمہ ہے۔ مرصع زبان میں اور ''گفتنی و نا گفتنی'' کے دو حصوں میں بٹا ہوا...... لفظ بانکے پر چونکئے نہیں، خود مقدمہ نویس کا پورا عکس اس آئینہ میں آ گیا۔ نہ ہوا ایک صدی قبل کا لکھنؤ عجب نہیں کہ شورش صاحب شہر کے نامی گرامی بانکوں میں شمار ہوتے۔ نہ ہوا چند صدی پیشتر کا عہد ''شویلری'' Chivalry کا یورپ شورش بہ حیثیت ایک نائیٹ (Knight) کے اپنا نام تاریخ میں چھوڑ جاتے!

ان کا جوش ترنم یقیناً کسبی نہیں فطری ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ جہاں تک

زبان وانداز بیان کا تعلق ہے لکھنؤ کے لوچ پر پنجاب کا مردانہ زور غالب ہے۔ اور وہ جہاں غزلیں بھی سناتے ہیں۔ تیور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا رجز پڑھ رہے ہیں! - ان کی خطابت ان کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ان کا تغزل کسی عاشق زار کا نہیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ''فکر سخن'' کے لیے گوشۂ تنہائی کبھی تلاش کیا ہو، اور اسے خود کبھی گنگنایا ہو۔ یہ ہر جگہ محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے کڑک کڑک کر اپنا کلام دوسروں کو سنا رہے ہیں۔ ان کے سامنے نمونہ داغ و میر تو خیر کیا ہوتا اقبال و حسرت موہانی کا بھی نہیں۔ ظفر علی خاں اور آغا حشر کاشمیری جیسے دبنگ اور کلّے ٹھلّے کے شاعروں کا ہے۔ انھوں نے اگر کہیں مرثیہ گوئی پر توجہ کی ہوتی، تو میر انیس سے کہیں زیادہ مرزا دبیر کے قریب ہوتے۔

طبعی طراری شوخ مزاجی اور اُپج نے ان کی آورد میں بھی ایک آمد رکھ دی ہے اور ان کے تکلف میں بھی ایک بیساختگی...... ''آرٹ'' میں ''نیچر'' کی شان پیدا کردینا، یہ بجائے خود ایک بڑا آرٹ ہے۔

اپنی ہر غزل اور ہر نظم کے ساتھ اگر شاعر نے تاریخ بھی درج کردی ہوتی، تو پڑھنے والوں کو شاعر کے ارتقاء فکری و شعری کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہو جاتی۔

نظم و غزل کی طرح انکی نثر کے بھی بعض ٹکڑے بڑے بلیغ ہیں اور کہیں کہیں، دانستہ یا نادانستہ وہ باتیں ایسی کہہ گئے ہیں، جو بڑے مزہ کی بھی ہیں اور بڑے پتہ کی بھی۔ ایک ٹکڑا اسی قسم کا ملاحظہ ہو:

''قومی تحریک کے دھاروں نے شعر کو سرکش بنانا شروع کیا، چکبست، سرور جہاں آبادی وطنیت کی آواز لے کر اٹھے، مولانا محمد علی جوہر نے گوتبر کا ہی شعر کہے، لیکن بے خوف ہو کر ظفر علی خاں سب سے بازی لے گئے، انھوں نے داغ کی پیروی میں معاملہ بندی کی، لیکن عشق کی راہ میں نہیں، سیاست کی راہ میں۔ ان کے ہاں ہمیں ممدوح ملتے ہیں یا مجروح یا پھر مفتوح۔ ان کی بدیہہ گوئی بہ غایت سرکش ہے، وہ برہنہ گفتن سے بھی کئی منزل آگے نکل گئے۔ قلم کو چابک بنایا

اور اشہب شعر پر ہجو کے سانٹوں سے قابو پالیا۔ انھیں اس میدان میں شہسوار کا مرتبہ حاصل ہے۔ (ص:25)

کلام کا انتخاب اگر دیا جائے، تو جگہ خاصی گھر جائے اور پھر بالکل بلا ضرورت...... کتاب کا چہرہ مہرہ، رنگ وروپ، ڈیل ڈول، خط وخال کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

صدق جدید، نمبر 41، جلد 6، 7 ستمبر 1956

(145) انتخاب کلام آتش

ازڈاکٹراعجاز حسین صاحب ایم اے۔ڈی لٹ

ضخامت 328+14 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ چار آنے،

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔

آتش و ناسخ اردو شعر و سخن کے ہزار گراں پایہ استاد ہوں۔اب ان استادوں کو پوچھتا کون ہے۔اور ان کے بڑے بڑے ضخیم دیوان اور کلیات کہاں پڑھنے میں آتے ہیں؟ ان کے دیوان دیکھتے دیکھتے نایاب سے ہو چلے ہیں۔اور جو تھوڑے بہت قدردان باقی رہ گئے ہیں وہ بیچارے اس چکر میں پڑے رہ جاتے ہیں کہ ایسے ''آتش کدے'' دیکھنے میں آئیں کہاں؟ - الہ آباد یونیورسٹی کے استاد اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے ایسے میں یہ کام بڑی سمجھ داری کا کرڈالا کہ ایک مختصر سا انتخاب، آتش کے دونوں دیوانوں کا کر کے اپنے مقدمہ و پیش لفظ کے ساتھ اسے الگ چھاپ دیا، کیا معلوم کل اتنے حصۂ کلام کے بھی لالے پڑ جائیں۔

انتخاب کا معاملہ آسان نہیں۔سخت و نازک ہوتا ہے۔اور یہ تو ممکن ہی نہیں کسی ایک انتخاب پر سب کا اتفاق ہو جائے۔اعجاز حسین صاحب کے حسن ذوق کی داد کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ رعایت مختلف مذاقوں کی رکھ لی ہے۔اور اپنی والی کوشش اس کی کرڈالی ہے کہ انتخاب میں کچھ اور ہو یا نہ ہو۔آتش کا اصلی رنگ کلام کھنچ کر آجائے۔

مقدمہ بہت مفصل نہ سہی، پھر بھی اچھا خاصہ ہے۔اس دور ''ترقی پسندی'' میں اتنا بھی بہت غنیمت ہے۔باتیں جو کہی ہیں خاصی قرینہ کی ہیں۔اور زبان بھی خاصی ہے۔بس کہیں کہیں کسر رہ گئی ہے۔مثلاً ص:15 پر لفظ خندہ پیشانی کا محل استعمال، یا اس صفحہ پر (ترقی پسندی کی زبان اختیار کر کے) ''تقلید'' کے بجائے ''روایت'' اور

''اجتہاد'' یا ''اپج'' کی جگہ بغاوت۔ ص:24 پر عربی کا ایک مشہور مقولہ غالباً کاتب کی بے احتیاطی سے بالکل مسخ ہو کر طبع ہوا ہے۔ اور مضحک بن گیا ہے...... ہندوستانی اکیڈمی یو، پی کی خدمات اردو کے حصہ میں گویا صفر تھیں۔ اب یہی بہت ہے کہ وہ اتنا سا بھی کام کر دکھائے۔

صدق جدید، نمبر 44، جلد 6، 28 ستمبر 1956

(146) مثنویات میر بہ خط میر

مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے۔ ڈی لٹ

مع پیش لفظ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ مع شبیہ حضرت میر۔ قیمت پندرہ روپے۔

دہوی مل دھرم داس۔ چاوڑی بازار، دہلی۔

میر تقی میر کو اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے اس کے لحاظ سے ان کی کوئی سی بھی غیر مطبوعہ چیز آج اگر نظر کے سامنے آجائے تو اردو کے اہلِ ذوق اس پر ٹوٹ کر گریں۔ چہ جائیکہ ان کی پوری ساڑھے تین مثنویاں اور وہ بھی ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی!۔ انگریزی کتاب ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے مولف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھیں کہیں سے یہ قیمتی ذخیرہ ہاتھ آ گیا۔ اور انھوں نے اسے بجنسہٖ چھاپ کر وقفِ عام کر دیا۔

مجموعہ تین پوری مثنویوں پر شامل ہے۔

(1) مثنوی عشقیہ۔

صفحہ 1 تا 6

(2) جنگ نامہ آصف الدولہ اور زمینوں کی جنگ کے بیان میں۔

صفحہ 6 تا 8

(3) مثنوی در بیان ہولی — صفحہ 9 تا 10

اور چوتھی ایک ناتمام۔

(4) مثنوی در بیان — صفحہ 11 تا 12

مجموعہ کی قدر و قیمت بدرجہا بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ یاد کر لیا جائے کہ یہ سارا کلام میر کے اپنے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مرتب نے ایک صفحہ میں بعینہ اس قلمی کلام کا فوٹو دے دیا ہے اور اس کے مقابل صفحہ پر اس کلام کو نستعلیق میں چھپوا دیا ہے۔ اور

شروع میں میر کی شبیہ بھی درج کر دی ہے۔ یہ بجائے خود بہتوں کے لیے قابلِ قدر ہو گی۔ یہ شبیہ چڑھی ہوئی گٹھی سیاہ داڑھی کے ساتھ، میر صاحب کے آخر دورِ جوانی کی معلوم ہوتی ہے۔

پیش لفظ جو دراصل اس کتاب پر نہیں بلکہ وہ مرتب صاحب کی دوسری کتاب مرقع شعراء پر ہے اور مرتب صاحب نے اسے دونوں کتابوں میں شامل کر رکھا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے ہے اور یہ خود کتاب کی ندرت میں اضافہ کرنے والا ہے۔ مولانا کی ادبی تحریروں کے دیکھنے کو تو اب آنکھیں ترستی ہی رہتی ہیں۔ پیش لفظ کچھ ایسا مختصر نہیں ہے اور اپنے لکھنے والے کے خصوصیات ادب وانشاء کا پورا مظہر ہے۔ ڈرتے ڈرتے عرض ہے کہ نکتہ چینی کی نگاہ کو ایک لفظ 'علاوہ' کا استعمال 'بجز' یا 'سوا' کے محل پر ذرا کھٹکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ بے احتیاطی اب بہت عام ہو گئی ہے لیکن مولانا کا مرتبۂ ادب وانشاء تو عام لکھنے والوں سے بدر جہا بلند و برتر ہے۔

مرتب صاحب نے صاف شدہ صفحہ پر تحریر میں ترتیب کلام بجنسہٖ وہی رکھی ہے جو اصل میں تھی۔ یہ ٹھیک نہ تھا پڑھنے میں اس سے خاصی دقت پیدا ہو گئی ہے۔ کہاں اٹھارویں صدی کا طرزِ تحریر اور کہاں بیسویں صدی کا! اس وقت لوگ اس الجھے ہوئے طرزِ تحریر کے عادی تھے آج کے پڑھنے والے اس میں خاص الجھن بلکہ دردِ سر محسوس کرتے ہیں۔ صفحوں کے نمبر فہرست مضامین میں تو پڑے ہوئے ہیں خدا معلوم کیسے اصل کتاب کے صفحوں پر پڑنے سے رہ گئے ہیں۔ اس لئے فہرست کچھ بیکاری ہو کر رہ گئی ہے۔

کتاب عام لوگوں کے زیادہ مطلب کی نہیں لیکن اردو شعر و ادب کے شائقین کے خاص کام کی ہے۔ اور اردو کے اچھے کتب خانوں کو تو اس کی قدر دانی خصوصیت کے ساتھ کرنی چاہئیے۔

صدق جدید نمبر 45 جلد 7 مورخہ 11/ اکتوبر 1957

(147) مرقع شعراء (فارسی)

مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے، ڈی لٹ

مع تصاویر کاغذ اعلیٰ صفحات پر نمبر نہیں قیمت بیس روپے

دھومی مل دھرم داس، چاوڑی بازار، دہلی۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ خوش ذوق اور انگریزی میں خوش تحریر تو خیر ہئی ہیں۔ لیکن خوش تدبیر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش تقدیر بھی ہیں۔ خوب خوب نادر چیزیں انھیں اتفاقات سے ہاتھ آجاتی ہیں۔ اوران سے کام لینا بھی وہ خوب جانتے ہیں------ یہ فارسی مرقع، شعراء اردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے باتصویر اور کسی معاصر کے قلم سے۔ یہ بہت ہی ناقص صورت میں یعنی اس کے کل دس ورق سکسینہ صاحب کو کہیں سے ہاتھ لگ گئے اور انھوں نے بڑی خوش سلیقگی اور ہنرمندی کے ساتھ اس قیمتی ذخیرہ کو چھاپ کر اس کی پوری قیمت وصول کرلی۔

تذکرہ کل دس شاعروں کا ہے: 1۔ میر تقی میر۔ 2۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ 3۔ شیخ مصحفی۔ 4۔ جعفر علی حسرت (استاد جرأت)۔ 5۔ ضیاء دہلوی۔ 6۔ پروانہ لکھنوی۔ 7۔ فدوی لاہوری۔ 8۔ مضطر لکھنوی۔ 9۔ تسلی لکھنوی۔ 10۔ قتیل فریدآبادی۔ اوران دسوں شاعروں کے حالات مع انتخاب کلام ایک ایک صفحہ میں اور مقابل کے صفحہ پر ہر شاعر کی تصویر۔ اس تذکرہ میں اور کچھ نہ ہوتا تو مرزا مظہر جان جاناں۔ میر تقی میر اور شیخ مصحفی جیسے اکابر ومشاہیر کی شبیہیں شعر وشاعری کے دلدادوں کے دل میں تذکرہ کی جگہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھیں۔

پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے بجائے خود پڑھنے کی چیز ہے۔

شاعروں میں تین شاعر تو بہرحال ہندو ہیں۔ 1۔ رائے جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی۔ 2۔ رائے ٹیکارام تسلی لکھنوی۔ اور 3۔ کرپال دیال سکسینہ مضطر لکھنوی اور دونو

مسلم ہیں۔ایک فدائی بیگ۔سابق مکند لال فدوی لاہوری۔دوسرے محمد حسن سابق دلوالی سنگھ قتیل فریدآبادی۔

تذکرہ کے مصنف جیسا کہ مولانا نے اپنے پیش لفظ میں کتاب کی عبارتوں کے حوالے سے دکھایا ہے اغلباً کوئی ہندو بلکہ کایستھ سکسینہ تھے لیکن ایک آدھ عبارت سے کچھ اس کے برعکس بھی گمان ہوتا ہے۔مثلاً مرزا قتیل نومسلم کے حال میں لکھا ہے:-

''فدوی از عمر گراں مایہ کہ از عہد طفلی بیرون باشد تخم تالیف گزشتگان بہ مرزع دل کاشت یعنی بہ دین پشتینی خود ماندہ و اشہف زندگی بباریۂ ضلالت راند۔بسے بر نیامد کہ پرہنوئی توفیق ازل بہ حلقۂ اسلام آمد''۔

کتاب کے ایک صفحہ پر اصل مسودہ کتاب کا فوٹو ہے اور پشت پر وہی عبارت نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔خط روشن و دیدہ زیب اور کاغذ اعلیٰ قسم کا ہے۔

کتاب اپنی قیمت کے لحاظ سے عام شائقین کی دسترس سے تو باہر ہی رہے گی۔البتہ ہر صاحبِ ذوق رئیس کی قدردانی کی مستحق اور اردو کے ہر پبلک کتب خانہ میں جگہ پانے کے لائق ہے۔

صدق جدید نمبر 42 جلد 7 مورخہ 8/نومبر 1957

(148) گنج معانی

از منشی تلوک چند محروم،

549 صفحہ۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت، دہلی کتاب گھر، نیا محلہ پل بنگش، دہلی۔

محروم صاحب پنجابی ثُم دہلوی اردو شعر و ادب کے بڑے پرانے خادموں میں سے ہیں اور ان کی نظمیں اور غزلیں اس وقت سے ملک کے اونچے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ جب بہت سے موجودہ ادیبوں اور شاعروں کا وجود بھی نہ تھا۔ کہنہ مشقی خود ایک دلیلِ فضیلت ہے لیکن محروم صاحب محض پرانے کہنے والے نہیں اچھے کہنے والوں میں شروع سے رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کا کلام قدرتاً اور زیادہ جلا پاتا گیا ہے۔

ان کی قدرت سخن اور قدرت زبان کا ایک شاہد عادل ان کے ذوق کا تنوع اور ہمہ گیری بھی ہے۔ انھوں نے کہنا چاہیے کہ کچھ نہ کچھ ہر موضوع پر لکھ ڈالا ہے اور جو کچھ بھی کہا ہے، پڑھنے کے قابل ہے۔ رنگِ تغزل سب پر مستزاد۔ دماغ کے عقب میں دل ہر جگہ موجود! یہ مجموعہ دیوان کی نہیں کلیات کی جگہ ہے، (کلیات کا لفظ اس جدید شاعری نے متروک کر دیا ہے۔ حالانکہ کوئی دوسرا لفظ اس جامع لفظ کا جانشین موجود نہیں)۔

پہلا ایڈیشن 25 سال قبل 1922 میں نکلا تھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ حضرت اکبر نے داد اس سے بھی برسوں پیشتر اول دی تھی۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید دانش آموز　　ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اور اکبر محض سخن گو نہ تھے سخن سنج بھی تھے۔

18 صفحہ کا دیباچہ سر عبدالقادر مرحوم کے قلم سے ہے۔ جذبات فطرت مناظر قدرت سے لے کر یادرفتگاں طوفانِ غم اور عاشقانہ کلام تک متعدد ابواب ہیں اور ان کے ماتحت بہت سی نظمیں ہیں۔ شیکسپیر اور سعدی اور رامائن کے ترجمے بجائے خود جاذبِ نظر ہیں اور نوحوں میں غالب، گرامی، چکبست، نادر کاکوروی وغیرہ کے ماتم۔ اور سب سے بڑھ کر راشدالخیری کا نوحہ جو فارسی میں ہے۔ تضمینات کے حصے میں اردو کلام کے علاوہ غالب، صائب، ناصر علی اور سعدی کے فارسی کلام پر بھی تضمینیں ملتی ہیں۔ آخر میں 14، 15 صفحہ کا ایک مستقل عنوان ''قند پارسی'' فارسی کلام کے لیے وقف ہے۔ غیر مسلموں میں اب اردو ہی کے کہنے والے کیسے قابلِ قدر ہو گئے ہیں۔ پھر فارسی کہنے والے تو آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہیں۔

محروم کے یہاں نمونے رزم و بزم، سوز و گداز، پند و موعظت، شوخی و ظرافت سب ہی کے مل جاتے ہیں۔ پھر بھی شاعر کا اصلی رنگ غم و حزن کا ہے۔ سوز ان کے ہاں ساز پر اور غم ان کے کلام میں نشاط پر غالب نظر آتا ہے۔

نکتہ چینی کی خوردبین سے دیکھیئے تو لغزشوں اور خامیوں سے خالی کس کا کلام ملے گا اور محروم کے ہاں بھی بجائے ''دوست''، ''دوستدار'' (صفحہ 258) جیسی پرانی اور متروک ترکیبیں کہیں نہ کہیں مل جائیں گی۔ لیکن جب آپ سیرِ چمن کو نکلتے ہیں تو پھولوں کے ہوتے ہوئے کانٹوں پر نظر ہی کیوں دوڑایئے۔

صدق جدید نمبر 52 جلد 7 مورخہ 22 نومبر 1957

(149) رزم نامہ انیس

از سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب

258 صفحے، قیمت تین روپیہ (تبصرہ صفحہ ۱۱ پر ملا حظہ ہو)

(150) نو بہاراں

از جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی

172 صفحہ، مجلد، قیمت دو روپیہ چار آنے، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

لکھنؤ کے نامور اور کہنہ مشق شاعر اثر کا یہ مختصر سا تیسرا دیوان ہے۔ دو دیوان اثر ستان اور بہاراں کے نام سے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں دوسرے دیوان بہاراں کو شائع ہوئے بھی کوئی 19، 20 سال گزر چکے ہیں اس دوران میں اثر صاحب کی نثری کتابیں تنقید وغیرہ سے متعلق نکلتی رہیں۔ غزلیات کا مجموعہ اتنے عرصہ بعد یہ پہلی بار نکلا ہے اور مجموعہ غزلیات بھی اسے کہنا صحیح نہیں۔ یہ انکے ادھر کے کلام کا صرف انتخاب ہے۔ انتخاب کا کام سید احتشام حسین صاحب اور نجم الدین شکیب صاحب کے حوالہ کر دیا گیا تھا ان صاحبوں نے 1939 سے لے کر 1956 تک کی غزلیات کا انتخاب شائع کر دیا ہے۔ انتخاب غزلوں کے اشعار کا نہیں کیا ہے۔ خود غزلوں کا کیا ہے اور انھیں ردیف وار نہیں بلکہ سنہ وار درج کیا ہے۔ دیباچہ میں تصریح ہے کہ کل غزلوں کا نصف حصہ اس میں آ گیا ہے۔

اثر صاحب کا شمار اب عرصہ سے استادوں کی صف میں ہے اور ان کی زبان دانی اور شعر گوئی دونوں کا شہرہ ہے بھی بالکل بجا۔ اس لیے اس تازہ مجموعہ پر کچھ زیادہ لکھنا لکھانا۔ ع

سورج کو چراغ ہے دکھانا

صرف نمونہ کے طور پر کچھ شعر حاضر ہیں:

بات نکلی منہ سے آفت ہوگئی — کس ستم گر سے محبت ہوگئی
چپ رہوں تو پوچھتا ہے ''خیر ہے'' ؟ — لو خموشی بھی شکایت ہوگئی
بے اصل مگر پھر بھی وہی تشنہ لبی ہے — اے عشق ستم پیشہ یہ کیا بو العجبی ہے
لذت سے دونوں خالی جینا ہو خواہ مرنا — بے عشق زندگی کا ممکن نہیں سنورنا
گھٹنے لگا ہے دم ترا شکوہ کیے بغیر — یہ عشق چھین لے گا نہ رسوا کیے بغیر
اے جذب شوق مژدہ کہ بنتی نہیں انھیں — پردے میں رہتے اور نہ پردا کیے بغیر
بیگانگی سی ہوگئی خود اپنے حال سے — اتنے رہے ہیں دور کسی بے وفا سے ہم
وہ دن گئے کہ یہ بھی تھا غیرت کو نا قبول — اب تم کو مانگتے ہیں دعا میں خدا سے ہم
اہل ہوس سے ہوش کی منزلیں طے ہوئیں نہیں — ورنہ وہ چشم مست کب میکدہ آفریں نہیں
نیم نگہ کا واسطہ دیکھ لے ایک بار پھر — جس کا سبب نہ کھل سکے ایسی خلش نہیں
ایسے بھی لمحے گزرے ہیں حیرتی جمال پر — جلوہ نظر کے سامنے دل کو مگر یقین نہیں

اور عاشقانہ رنگ میں چوٹی کا شعر یہ ہوا ہے۔

چپ بھی رہتے ہو تو گفتار کا ہوتا ہے گماں — شاذ اس طرز کی شیریں سخنی ہوتی ہے

ص:48 وص:49 پر ''سراپا بہ طرز نو'' بھی خوب ہے۔

اثر صاحب نرے عشق مجازی کے شاعر نہیں، تصوف و معرفت کا رنگ بھی ان کے ہاں اچھا خاصہ ملتا ہے۔ دو چار شعر اسی رنگ کے۔

اکثر مآل دید سے بیگانہ ہوگئے — نقش و نگار پردۂ اسرار دیکھ کر
حور و قصور و خلد جسے چاہے بخش دے — یہ تحفے تیرے طالب دیدار کیا کریں
انجام کار تیری طرف باز گشت ہے — ہے کون رہ گزر جو تری رہ گذر نہیں
ہوتا ہے مجھ پہ ختم ہر اک راز کائنات — آئینہ بھی تو آپ ہی آئینہ گر نہیں
دل ماسوائے دوست سے بیگانہ چاہیے — سرگرم کار صورت پروانہ چاہیے

اور ایسے شعر یہ نہیں کہ کتاب بھر میں دس بیس ہوں اور بہ تکلف لائے گئے ہوں۔ تقریباً ہر صفحہ دوسرے صفحہ پر دو چار مل جاتے ہیں۔ اور شاعر کی زبان قلم پر بے تکلف اور بے ساختہ آ گئے ہیں۔

صدق جدید، نمبر 32، جلد 8، 4 جولائی 1958

(151) پھول مالا

از منے آغا صاحب ذکی

96 صفحہ، قیمت...... جعفر رضا جعفر صاحب، 23 جگت نرائن روڈ، گولا گنج لکھنؤ۔

یہ ننھا منا سا نیا دیوان۔ گویا ایک نئے شاعر کا ہے۔ گویا اس لیے کہ شاعر حقیقۃً نیا نہیں سالخوردہ غزل گو ہے۔ 30 سال سے غزل کہہ رہا ہے۔ نمودار شاعر کی حیثیت سے اب ہوا ہے۔ اس دیوان یا دیوانچہ کی اشاعت کے بعد 96 صفحہ کی بھی کوئی بساط ہے۔ وہ بھی چھوٹی تقطیع کے اور وہ 96 بھی مسلم کہاں، 16 صفحہ تو دیباچہ فہرست وغیرہ ہی کی نذر ہو گئے! دیوانچہ نہ کہیے تو دیوان کیسے کہیے۔ صاحب ''دیوان'' تو وہ پہلوان سخن ہوئے ہیں جو بڑی تقطیع کے چار چار پانچ پانچ ضخیم جلدوں کے دیوان اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں! جی اور کیا! ایسا استاد اس دم داعیہ کا بھی آپ کے ہاں گزر چکا ہے۔

شاعری خصوصاً غزل کی، اب دو ایک استاد کو چھوڑ کر ہمارے ہاں بری طرح تقلیدی ہو کر رہ گئی تھی۔ تقلیدی کہیے یا رسمی، بات ایک ہی ہے، مضمون وہی فرسودہ، بندشیں وہی پامال۔ جدت نہ بیان میں ہے نہ زبان میں، ندرت نہ خیال میں نہ مقال میں، تازگی نہ حال میں نہ قال میں، ریاض کی شوخی، داغ کا تیکھا پن ایک خواب و خیال۔ اس نئے شاعر ذکی نے محفل میں قدم رکھتے ہی پرانی بساط الٹ دی، بے ساختگی، برجستگی، زندگی و زندہ دلی کا کلمہ ایک ایک سے پڑھوا لیا۔ آپ ''مشاعرہ'' تک آ گئے ہیں۔ تو اب دیر کیا ہے۔ شاعر کا کلام بہ زبان شاعر ہی نہ سن لیجیے۔

جلوہ ہی تھا آئینہ، آئینہ میں جلوہ تھا — کیا خوب تماشائی، کیا خوب تماشا تھا

فرماتے ہیں اب ہنس کے پردہ کے ادھر کیا تھا — کیوں حدّ ادب کہدوں پردہ سے نہ پردا تھا

شب اپنا تمھیں کہہ کر یوں تم کو پکارا تھا — آواز ہماری تھی انداز تمھارا تھا

بہ طور کی بجلی کیا در اصل وہ جلوہ تھا — موسیٰ سے پیمبر نے غش کھا کے جو دیکھا تھا

سیدھی نظر بھی دلفریب، ترچھی نظر بھی دل نشیں — تیری ادائیں بھی حسین، تیری جفائیں بھی حسین

ہمت خونِ بے گناہ، کام ہر ایک کا نہیں
کھینچا پھر گلے پہ خط، پہلے الٹ لے آستیں

دیر سے رو رہا تھا میں، آنکھوں پہ رکھے آستیں
اتنے میں آ گیا کوئی، کہتا ہوا نہیں نہیں

رفعت آستان ناز جانتے ہیں اداشناس
رشک فلک تھی وہ زمیں جھک گئی جس جگہ جبیں

توبہ شکن ادا کے ساتھ بھر کے وہ دے رہا ہے جام
اپنی قسم کا اے ذکی اب ہمیں خود نہیں یقین

جس کی کچھ ابتدا نہیں، جس کی کچھ انتہا نہیں
اس کا نشان ہے ہر جگہ اس کا کہیں پتا نہیں

دھیان میں کچھ زباں پہ کچھ ہائے رے اضطراب شوق
کہنے کو کیا نہیں کہا، کچھ بھی مگر کہا نہیں

رنگ میں کیا ہے، بو میں کیا، سب سے فریب ماسوا
جس کی نظر میں آپ ہیں اس کی نظر میں کیا نہیں

جو تھی اہلیت دیکھنے کی مٹا دی
نقاب اس نے چہرہ سے فوراً اٹھا دی

یہ دریا دلی اور یہ میکش نوازی
کہا جب بھی "ساقی پلا دے" پلا دی

ذرا نام اور رخ بدلنا پڑے تھے
انھیں کو انھیں کی کہانی سنا دی

ترا کھیل ہے میری شمع تمنا
جلا دی جلا دی، بجھا دی بجھا دی

کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں دو چار شعر دل سے نکلے ہوئے اور دل میں اتر جانے والے نہ مل جاتے ہوں۔ ص:26 یہ ایک غزل میں شعر ہے۔ جس کا دوسرا مصرعہ بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔

سجدے سے اٹھ کے نور چھنے یا کہ داغ ہو
اب تیری ملک ہو چکی میری جبیں نہیں

اس غزل کا یہ اکیلا شعر اچھے اچھے شاعروں کی پوری غزل کے برابر ہے۔

محشر میں خونِ دل کے ٹھوکے، کہو کہو
اک شرگیں نگہ کے اشارے نہیں نہیں

خدا بہتر جانتا ہے کہ شاعر کس عالم میں یہ شعر کہہ گیا ہے۔

مجموعہ میں سو سے اوپر غزلیں ہیں، بحریں عموماً بڑی شگفتہ، بے ساختہ، پرترنم، تبصرے لکھنؤ کے پرانے استاد اور شاعر گراثر اور جدید نقاد احتشام صاحب کے قلم سے۔ شروع میں شامل ایسا جیتا جاگتا کلام تبصرہ نگار کی نگاہ میں مدت کے بعد آیا ہے۔ کوئی صفحہ بھی بے جان یا پھس نہیں۔

صدق جدید، نمبر 34، جلد 8، 25 جولائی 1958

(152) دیوان غالب

مرتبہ مالک رام صاحب ایم اے

359 صفحہ، قیمت ڈیڑھ روپیہ، آزاد کتاب گھر، دہلی۔

غالب کا دیوان خدا معلوم کتنی بار مختلف پریسوں سے اور مختلف طریقوں پر چھپ چکا ہے لیکن اللہ نے کلام کو مقبولیت کچھ ایسی دی ہے کہ ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتا ہی چلا آ رہا ہے اور کھپت سب کی ہو جاتی ہے۔

یہ تازہ ایڈیشن، مشہور غالب شناس مالک رام، ایم اے، کے حسن توجہ اور جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ مرتب کے ستھرے مذاق اور پاکیزہ سلیقۂ تحریر کی طرح چھپائی لکھائی، کاغذ کے اعتبار سے بھی صاف ستھرا نکھرا ہوا۔

اصلاً یہ مبنی اس دیوان غالب پر ہے، جو 1862 میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا۔ لیکن مرتب کی خوش مذاقی اور دیدہ ریزی دونوں نے بعد کے چھپے ہوئے اور مختلف نسخے بھی پیش نظر رکھ کر جابجا ترمیمیں اس میں روا رکھی ہیں اور اس عمل بالید نے کلام کو صحیح سے بلند کر کے اصح کے درجہ پر رکھ دیا ہے۔ یہ سارے اضافے اور اصلاحیں بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اصل دیوان ص: 280 پر ختم ہو گیا۔ غزلیں، قصیدے، رباعیاں وغیرہ سب اس میں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد تتمہ شروع ہوتا ہے یعنی کلام کا وہ نیا حصہ جو مختلف ماخذوں سے لیا گیا ہے۔ اور اس کے اندر بھی غزلیں، قصیدے، قطعے سب ہی کچھ آ گیا ہے۔

یہ نیا حصہ ہر صاحب بصیرت کے لیے خاص طور پر جاذب توجہ ہو سکتا ہے اس کی بہت سی چیزیں بالکل معیاری ہیں۔ اور ٹھیک اسی رنگ کی جس کی توقع غالب سے ہو سکتی تھی، لیکن کچھ چیزیں اس کے برعکس ہیں۔ باکمال سا باکمال انسان بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے۔ فراز کے ساتھ نشیب، چڑھاؤ کے ساتھ اتار، صواب کے ساتھ

عیب لازمہ بشریت ہے اور پھر کچھ حصہ کلام کا تو بہت ہی کم سنی کا ہے، یعنی نوجوانی کا نہیں، لڑکپن بلکہ بچپن کا۔ ذہانت اس سن میں روئیں روئیں سے ٹپک رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ذہانت کا رخ تمام تر ''لکھنویت'' کی طرف ہو۔ بچپن کی کہی ہوئی ایک دس شعری مثنوی پتنگ بازوں کی زبان میں ملاحظہ ہو اس کم سنی میں مرزا نے کیا کیا ہاتھ دکھائے ہیں!۔

ایک دن مثل پتنگ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل ہوا ے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان میں الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر، اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑادیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹادیں گے کہیں
دل نے سن کے کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

شروع میں 36 صفحہ کا مقدمہ مرتب کے قلم سے ہر طرح کتاب کے شایانِ شان ہے۔ کتاب ہر غالب دوست و غالب شناس کی الماری کی زینت بننے کے لیے قابل ہے، غالب کی تصویر اور عکس تحریر گویا مفت میں۔

صدق جدید، نمبر 49، جلد 8، 7 نومبر 1958

(153) کلام بے نظیر

مرتب محمد اکبرالدین صدیقی صاحب

462+104 صفحہ مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ، کتاب خانہ، عابد روڈ، حیدرآباد۔

شہرت اور کمال فن لازم وملزوم نہیں، کتنے ہی ادیب، انشاء پرداز شاعر ایسے ہیں، جو کامل الفن ہونے کے باوجود گمنامی کی نذر ہو گئے- ایسے ہی ایک باکمال شاعر بے نظیر شاہ وارثی ہوئے ہیں۔ ان کی وفات کو اب کوئی 36-37 سال گزر چکے ہیں۔

ان کی پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ جب دیوان کی پہلی غزل 'عام میرا' ''سلام میرا' کی زمین میں کہنے بیٹھے اور پہلا مطلع یہ کہا۔

کہتا ہے حسن مطلق جلوہ ہے عام میرا — اچھی نگاہ والو تم پر سلام میرا

تو ایک دو نہیں، سات سات غزلیں اسی ردیف وقافیہ میں کہتے گئے اور آٹھویں غزل میں صرف ردیف بدلی یعنی بجائے میرا کے تیرا کر دی اور قافیہ وہی قائم رکھا!

گہرے مذہبی آدمی اور صوفی صافی تھے۔ اس لیے حمد ونعت دونوں کے مضمون سے یہ ساری غزلیں لبریز ہیں، بلکہ روحانیت کا یہ رنگ کہنا چاہیے کہ کتاب کے بڑے حصے میں رچا بسا ہوا ہے۔

رنگ تغزل کا اندازہ کلام کے ان نمونوں سے ہوگا۔

کیف مے کا تری مستانہ ادا ہو جانا — مے پرستی کا اسی دن سے روا ہو جانا

اس سے کیا کام محبت کو وہ دشمن ہو کہ دوست — جس میں ہو تیری ادا مجھ کو فدا ہو جانا

آپ آمادہ رہیں ناز سے ٹھکرانے کو — یہ مرا کام ہے پامال ادا ہو جانا

ستم دیکھ کر یا کرم دیکھ کر — غرض مر مٹے کچھ تو ہم دیکھ کر

خدا جانے کس در پہ بیٹھے ہیں ہم — تماشائے دیر و حرم دیکھ کر

اُدھر رہ گئی یا اِدھر رہ گئی — وفا کی شکایت مگر رہ گئی

نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا تیری یاد دل میں اگر رہ گئی
خدا جانے آنکھوں میں اب کیا ہوا نظر تو ترے بام پر رہ گئی
ازل میں ہر انجام لکھا گیا شب غم کی لیکن سحر رہ گئی

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا، تری شان لطف پہ میں فدا
کہ جلال میں بھی کمی نہیں، ترے عفو بندہ نواز میں
یہ جہاں نہیں، یہ ہے آئینہ، ہے تصور ہمہ واہمہ
وہی جلوہ آئینہ ساز کا ہے نگاہ آئینہ ساز میں
بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغر دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی
وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

کل غزلوں کی تعداد 192 ہے اور کثرت سے غزلیں ایسی ہیں جو مختصر نہیں خوب بڑی بڑی ہیں۔ ص: 250 پر حصۂ غزلیات ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دو مخمس ہیں اور دو مسدس اور ان کے بعد متفرق نظمیں (قطعہ، قصیدہ وغیرہ) بہت سی ہیں۔ ص: 379 سے کلام فارسی شروع ہوا ہے جو آخر تک چلا گیا ہے۔ اور یہ ہر صنف سخن (غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ وغیرہ) پر شامل ہے۔ شروع میں مفصل فہرست مضامین کے بعد عرض حال ہے اور پھر ایک لمبا چوڑا مقدمہ۔

فوٹو بھی کتاب میں متعدد شامل ہیں۔ خود شاعر کے، شاعر کے فرزندوں کے، مرتب کتاب کے، شاعر کو بیعت و اجازت ایک نہیں متعدد شیوخ سے سلسلہ قادریہ و نقشبندیہ وغیرہ میں حاصل تھی اور خود ان پر تصوف اس درجہ غالب تھا کہ کلام کا معقول و معتد بہ حصہ مجاز سے زیادہ حقیقت کی نذر ہو گیا ہے۔ البتہ وحدۃ الوجود وغیرہ بعض مسائل کے سلسلے میں ایسی باتیں بھی جا بجا ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جن کا پڑھنا یا سننا ایک سیدھے سادے مسلمان کے عقائد پر سخت بار ہے۔

نقص وعیب سے کس کا کلام خالی ہوسکتا ہے اور پھر جب کہ عمر کے ہر دور کا بلا انتخاب وامتیاز اکٹھا کردیا گیا ہے، تلاش سے اس ضخیم مجموعہ میں بھی رطب ویابس سب ہی کچھ مل جائے گا۔ لیکن حسن ولطافت کا حصہ اتنا ہے کہ ہر صاحب ذوق بہ حیثیت مجموعی انشاءاللہ لطف ہی محسوس کرے گا اور کتاب کے مطالعہ سے بدحظ نہ ہوگا۔ مرتب صاحب نے کاش صحیح انتخاب سے کام لیا ہوتا۔ بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کا ہر جزو محفوظ رکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ بہت سے شعر محض کسی ہنگامی جذبہ یا وقتی ضرورت کے ماتحت کہے جاتے ہیں اور ان کی زندگی وہیں ختم ہوجاتی ہے۔

صدق جدید، نمبر 27، جلد 9، 5 جون 1959

(154) انجم کدہ (دیوان غزلیات)

عزیز لکھنوی

انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

عزیز لکھنوی کے نام سے کون ناواقف ہے۔ ماضی قریب میں لکھنؤ کے استادوں میں شمار اور بجا طور پر شمار کیے جاتے تھے۔ غزلیات کا ایک دیوان 'گلکدہ' کے نام سے مدت ہوئی شائع ہو چکا تھا۔ اب یہ دوسرا دیوان غزلیات ان کے صاحب زادہ نے کلام کا کہیں سے کھوج لگا کر شائع کیا ہے۔ عزیز کا سال وفات 1930 ہے۔ اس مجموعہ میں 1919 سے لے کر 1923 تک کی غزلیں ہیں۔ ان کی تعداد 105 ہے۔ ان کے بعد کچھ متفرق اشعار ہیں اور خاتمہ پر ان کے شاگرد رشید اور فخر استاد اثر لکھنوی کے قلم سے مرثیہ ہے۔ غزلوں کی ترتیب قافیہ وار نہیں بلکہ تاریخ وار ہے اور فہرست مضامین میں عنوان ہر غزل کا مصرعہ اول ہے۔

عزیز کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کے رنگ کا نمونہ بالکل سامنے آ جائے گا:

شوق دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا　　فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا

تری رعنائی قامت دیکھی　　اپنی آنکھوں سے قیامت دیکھی

میں حال دل اپنا کہہ رہا ہوں　　یہ کون سی بات ہے ہنسی کی

ہر نقش ہے ثبوت مصور کی ذات کا　　ہر ذرہ ایک دلیل وجود خدا کی ہے

شاید عزیز آہ میں تاثیر ہوگئی　　دنیا تمام درد کی تصویر ہوگئی

کیا ہیں یہ ہستی کونین کے دونوں صفحے　　ایک فہرست فقط ان کے طلب گاروں کی

یہ غلط ہے اے دلِ بدگماں کہ وہاں کسی کا گزر نہیں　　فقط اس لیے یہ حجاب ہے کہ کسی کو تاب نظر نہیں

عزیز کے پرانے کلام کا یہ شعر ایک ضرب المثل کی سی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

اس انگڑائی کا ایک قافیہ اس جدید مجموعہ میں بھی آ گیا ہے، انھیں تیوروں کے ساتھ۔

جزر و مد حسن کے دریا میں نظر آتا ہے قابل دید ہے عالم تری انگڑائی کا

اثر کا مرثیہ رسمی نہیں دل سے نکلا ہوا ہے اس لیے قدرتاً اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

صدق جدید، نمبر 7، جلد 10، 15/جنوری 1960

(155) صدائے بازگشت

از زین العابدین صاحب قدوائی بیکس

ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور۔

یہ مختصر سا دیوان مجموعہ ہے بیکس بھیاروی ثم لکھنوی کے کلام کا۔ کمال کسی فن میں بھی ہو شہرت اس کے لیے لازمی نہیں۔ کتنے ہی طبیب ہوتے ہیں حاذق مگر شہرت سے محروم، کتنے ہی فاضل ہوتے ہیں اپنے فن میں جید و یگانہ لیکن گمنام و غیر معروف۔ شاعر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں اور اس کی تازہ مثال بیکس قدوائی ہیں۔ لکھنؤ ایک مدت دراز سے اپنا مسکن بنائے ہوئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ وہ خیر سے شعر و شاعری کا کچھ کچھ ذوق بھی رکھتے ہیں! دنیا ان سے روشناس صرف اس قدر کہ ایک کامیاب ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں یا ایک دیندار قسم کے مسلمان ہیں۔

کتاب کا تقریباً 1/3 حصہ تعارفی تحریروں کی نذر ہے، پہلے پیش لفظ خود شاعر کے قلم سے پھر تعارف ایک "مرحوم" سخن فہم کی زبان سے۔ پھر تبصرہ ایک مشہور مرحوم شاعر و نقاد کی طرف سے۔ پھر تنقید ایک یونیورسٹی کے استاد اردو کے نام سے۔ اتنے جھمیلے طے کر لیجیے تب کہیں جا کر اصل کلام کی بسم اللہ کی نوبت آتی ہے! شاعر آخر تکلف و مبالغہ کی لت کیسے چھوڑ دے۔ وہ تعلّی میں نہ سہی انکسار و تواضع میں سہی، لیکن کلام جب مشک خالص کے مرتبہ کا ہو تو ضرورت نہ کسی عطار کی اشتہار بازی کی رہتی ہے نہ کسی دلال کی چرب زبانی کی؟ مجذوب کا وہ ضرب المثل بن جانے والا شعر کس نے نہ سنا ہوگا۔

اب بھی مجذوب جو محروم پذیرائی ہے کچھ جنوں میں ابھی آمیزش دانائی ہے

اور اصغر کا یہ شعر بھی اس منزل میں سنگ میل کا حکم رکھتا ہے۔

تھی ہر عمل میں دعویٔ ہستی کی معصیت مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کسی کے لیے اس موضوع پر کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ گئی ہے لیکن ذرا دیکھیے گا بیکس نے کس بانکپن کے ساتھ اپنے لیے راہ نکال ہی لی۔

جھلک ہوش کی ہے ابھی بیخودی میں   بڑی خامیاں ہیں مری بندگی میں

مطلع کے ساتھ ایک آدھ شعر بھی اس غزل کا۔

نگاہ کرم نے کہیں کا نہ رکھا   بڑی بات تھی اپنی دیوانگی میں
ترا نام لینے سے اے جان بیکس   افاقہ سا ہے لذت جانکنی میں

شگفتگی تازگی ترنم کی تو جیسے انھوں نے اجارہ داری لے لی ہے، چھوٹی رواں بحروں میں ان کے قلم کی روانی دیکھنے کے قابل ہے۔

شب غم گھٹ کے مختصر نہ ہوئی   کوئی تدبیر کار گر نہ ہوئی
دل میں آجائیں آنے والے   چھپ چھپ کے جھلک دکھانے والے
جلوہ گر کوئی یہ رعنائی ہے   کوئی خود اپنا تماشائی ہے
جگمگا اٹھی ہے دل کی دنیا   ان کی تصویر اتر آئی ہے

غالب و جوہر کی ایک مشہور زمین ہے ''جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر'' اس زمین میں بیکس کی شگوفہ کاریاں ملاحظہ ہوں۔

افشائے راز عشق پراسرار دیکھ کر   مسرور ہوں میں خود کو سردار دیکھ کر
یہ حدّ بیکسی ہے کہ میدان حشر میں   سب بھاگتے ہیں مجھ کو گنہگار دیکھ کر
فرصت کسے جو کر سکے نظارۂ جمال   سب محو ہیں نقاب رخ یار دیکھ کر

مجاز کے ساتھ حقیقت کی رونمائیاں اوپر خاصی گزر چکیں اب کچھ اور جھلکیاں اسی رنگ کی حاضر ہیں۔ تصوف خصوصاً وحدت وجود کی تصویر میں خوب خوب رنگ بیکس نے بھرے ہیں اور خشکی کو تمام تر رنگینی میں بدل دیا ہے۔

مجھے حسن عشق نواز نے وہ جمال ہوش ربا دیا   کہ جو آ گیا مرے سامنے اسے جلوہ زار بنا دیا
مری تاب ضبط نہ کر سکی مرے شوق دید کی ہمسری   یہ ہوا کہ غش مجھے آ گیا ترے جلووں کو تو جگا دیا

اور یہ غزل اگر کہیں سرِ مشاعرہ پڑھی گئی ہوتی تو مشاعرہ کو لوٹ لینے کے لیے کافی تھی۔

سن کے یہ حال کہ اب قصد ہے جل جانے کا　　بڑھ کے منہ چوم لیا شمع نے پروانے کا
یہ بھی اک عشق کی منزل ہے کہ بن جاتا ہے حسن　　گویا ملتا ہے صلہ حد سے گزر جانے کا

اور تبصرہ نگار کے رنگ کی تو غزل یہ ہے۔

سوزشِ غم کی لذتیں جن سے حیات تھی مری　　جب سے کسی نے لوٹ لیں موت ہے زندگی مری
اس ادائے خاص سے سجدے میں جھک گئی جبیں　　لاؤں اسے کہاں سے اب ہائے رے کافری مری

اور شعر تو یہ کہا ہے بیسوں غزلوں پر بھاری

لب پہ تبسم آنکھوں میں عشق کا خمار　　دیکھ کے مجھ میں یہ بہار موت تڑپ گئی مری
بیکس خستہ مجھ پہ ہے فیض یہ دردِ عشق کا　　بزم میں پھیل کر رہی نکہت شاعری مری

کلام وارداتِ قلب کا عکس ہے اکھاڑے کا کرتب نہیں، آمد ہی آمد ہے رسمی وفرمائشی نہیں۔ بسم اللہ کر کے اصل کلام کا مطالعہ شروع فرمایا جائے انشاء اللہ معلوم ہوگا جیسے سارے خوش گو خوش فکر صف اول کے معاصرین کی روح ایک گلدستہ میں سمٹ کر آگئی ہے، وہی رنگینی، وہی خوشبو، وہی تابندگی۔

مدح و تحسین کے ہجوم میں ایک کلمہ تنقید کا بھی۔ دیوان کا نام شاعر نے فغان بیکس رکھا تھا اس میں ایک بانکپن بھی تھا اور شاعرانہ اپج، پھر خدا جانے کس ملائے مکتبی کے جھانسے میں آکر ''صدائے بازگشت'' کر دیا۔

صدق جدید، نمبر 10، جلد 10، 5رفروری 1960

(156) صحرا میں اذان
از گوپال متل صاحب

112 صفحہ، مجلد 22x18، قیمت چھ روپے، مکتبہ تحریک 9 انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی۔6

متل صاحب سے پہلا تعارف ماہ نامہ تحریک کے واسطے سے ہوا۔ اور دل نے کہا کہ یہ حضرت ہیں کوئی بڑے زبردست پروپیگنڈسٹ قسم کے۔ کمیونزم، کمیونسٹوں کے ہر جرگے کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے۔ اور لو ہے کو لوہے سے کاٹنے والے۔ تحریک کے اور کچھ پرچے دیکھے تو رائے یہ قائم ہوئی کہ ہیں آدمی پڑھے لکھے۔ ذہین بھی، فریس بھی فہیم بھی یہاں تک کہ اب جو ان کا صحیفہ منظومات، غزلیات وارد ہوا حسب معمول جو آنکھ بند کر کے اسے پڑھنے کے لیے کھولا تو اتفاق سے صفحہ 38 اور 40 سامنے آ گئے اور دل بغیر انھیں مکرر پڑھے ہوئے نہ مانا اور پھر آپ کو سنا دینے کو چاہا ہے۔ ص 38 پر

کل شب طلوعِ ماہ کا منظر عجیب تھا   تم جیسے آ گئے رخِ زیبا لیے ہوئے

اور صفحہ 40 پر

بقدرِ ظرف ہے جرمِ وفا کی بھی تعزیر   نہیں ہے نصیبِ منصور ہر کسی کے لیے

پلاؤ کی ایک دیگ کا اندازہ باورچی سنا ہے کہ دو ہی چاولوں سے کر لیتے ہیں------ سیاسیات کے دلدل میں پھنس کر کوئی اپنا ذوقِ سخن اتنا بلند رکھے جب بھی غنیمت ہے۔

صدق جدید نمبر 17 جلد 20 مورخہ 27/ مارچ 1970

(157) مثنوی گلزار نسیم

از پنڈت دیا شنکر نسیم۔ رشید حسن خاں صاحب

143 صفحے، اصل کتاب کے تعارف کے صفحے بغیر نمبر کے۔ قیمت دو روپے پچّیس پیسے۔

پتا: مکتبہ جامعہ، جامعہ ملیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

گلزار نسیم اردو کے ادبی و شعری حلقوں میں فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعارف و روشناسی کی ہے نہ کسی مدح و تحسین کی۔ پھر بھی اس کے ایک اچھے ایڈیشن کی بڑی ضرورت باقی تھی اور یہ ضرورت مکتبہ جامعہ کے اس معیاری ایڈیشن سے ایک حد تک پوری ہوگئی لیکن صرف ایک حد ہی تک۔

تعارف کے لیے رشید حسن خاں صاحب سے بہتر قلم میسر آنا شاید ممکن نہ تھا اور مکتبہ نے ان کا انتخاب اس غرض کے لیے بہترین کیا۔ قل و دل، ہر طرح جامع و متوازن تعارف انھوں نے ایسا ہی لکھ دیا اور سخن فہمی و سخن سنجی کا حق ادا کر دیا۔ کتاب کے رد و قبول میں مخالف و موافق مناظرانہ مضمون اب تک لاتعداد لکھے جا چکے ہیں لیکن افراط و تفریط سے الگ دیانت و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ایسا تبصرہ شاید ہی کبھی کوئی لکھا گیا ہو۔

لیکن جو کتاب اور کلاسیکی کتاب سوا سو برس سے اوپر کی ہو چکی ہو اس کا نیا ایڈیشن ظاہر ہے کہ ایک حسین و جمیل تبصرے کے علاوہ بھی بہت کچھ محنت چاہتا ہے اور خدا جانے اس سلسلے کے معماروں نے کیوں اپنے کو اس سے بے نیاز سمجھ رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرتب نے فرہنگ پوری بتیس صفحہ دے دی ہے لیکن قصور معاف ایسی چست بندش والی کتاب کے لحاظ سے یہ صفحات بھی بالکل ناکافی رہے۔ اس کا تو ہر مصرعہ توجہ کا طالب تھا مصرعوں میں ہر دوسرا تیسرا شعر تو ضرور ہی اب ایک سوالیہ نشان بن چکا ہے------ فرہنگ کے لفظ تعداد میں بھی کم اور ناکافی ہیں۔ کمیت کے علاوہ

کیفیت میں بھی بجل نمایاں ہے۔ ''گانی'' اور ''ناچنی'' کو یہ نوٹ دے کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ''گانی'' گانے والی اور ''ناچنی'' ناچنے والی۔ آج یہ لفظ ان معنوں میں کون اور کہاں بول رہا ہے؟ کم سے کم متروک کو درج کرنا بہر حال ضروری تھا۔ ''مار آستین'' کے تحت میں لفظی معنی'' آستین کے سانپ'' بھی درج کرنے ضروری تھے ------ یہ مثالیں صرف نمونے کے طور پر عرض کی گئی اور کیفیت وکمیت دونوں کے لحاظ ابھی بہت کام کرنے کا تھا۔ اردو محاوروں اور روز مرہ کے ساتھ ایک بڑا حصہ تلمیحوں کا بھی صاف ہونے سے رہ گیا ہے۔

کتاب جیسی کہ ہے قابل قدر ہے۔ اس کی اہانت یا بے قدری کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں۔ لیکن خوب کو دیکھ کر خوب تر کے لیے دل کا مچلنا بالکل فطری ہے ------ شکوہ مطبع والوں سے البتہ ہے کہ تعارف کے حصے کو صفحات کے ہندسوں ایسی ابتدائی اور بنیادی ضرورت سے بھی خدا معلوم کیوں محروم رکھا۔

صدق جدید نمبر 59، جلد نمبر 21۔ مورخہ 5 رنومبر 1971

صنف ادب (طنز و مزاح)

(158) پطرس کے مضامین

از پطرس (اے ایس بخاری)

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

پطرس پنجاب کے ادبی رسائل کے بہت پرانے مضمون نگاروں میں ہیں۔اور اردو میں اس وقت جو چوٹی کے مزاح نگار ہیں ان میں ان کا ایک امتیازی مقام ہے۔شوخی و ظرافت کے ساتھ سنجیدگی و شرافت کو نباہنا بہت آسان کام نہیں۔پطرس ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے اس مشکل کو آسان بنا کر چھوڑا ہے۔ان کی ظرافت تالیوں اور قہقہوں والی نہیں بشاشت، خندہ روئی اور تبسم والی ہے۔پڑھتے جائیے اور چپکے چپکے مسکراتے جائیے اور کہیں کہیں کھل کر بھی ہنس لیجئے۔

افسانوں کی تعداد گیارہ ہے سب ہلکے پھلکے صحیح معنی میں ادبِ لطیف، دل میں گندگی اور ذوق معصیت پیدا کرنے والے نہیں۔چند سطری دیباچہ محض کتاب کا نہیں نوعیت مضامین کا بھی دیباچہ ہے شروع اس سے فرماتے ہیں۔

''اگر آپ کو یہ کتاب کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔آپ نے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو بہتر سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب قرار دیں۔''

ساری کتاب اسی صاف و سلیس زبان میں ہے اور اسی طرح کی میٹھی ظرافت سے بھری ہوئی اور بڑی بات یہ ہے کہ خفیف اور خفی اصلاحی رنگ بھی موجود

ہے۔زبان ہر جگہ لکھنؤ کے معیار کے مطابق نہیں، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ سارے ہندوستان کی اردو لکھنؤ ہی کی تابع فرمان رہے۔ادق الفاظ، مغلق ترکیبوں، بازاری فقروں اور طنز و فحش کی مثالیں اول سے آخر تک تلاش کے بعد بھی نہ ملیں گی۔کتاب بے تکلف ہر شریف گھر گھرانے میں بار پانے کے قابل ہے اور اس وقت اردو کی کسی ظریفانہ کتاب کی یہ داد معمولی داد نہیں ہے۔کتاب کی ظاہری حیثیت، کاغذ چھپائی جلد وغیرہ سب پسندیدہ و خوشنما۔

صدق نمبر 19 جلد نمبر 5 مورخہ یکم فروری 1940

(159) خندان (ظریفانہ مضامین)

رشید احمد صاحب صدیقی

مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

یہ اردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار رشید احمد صدیقی صاحب کے چالیس ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے یہ عرصہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتے رہے اور اب مکتبہ جامعہ کے حسن اہتمام سے کتابی شکل میں آگئے۔ رشید صاحب کی پر لطف طرزِ نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہے نہ تعارف کی، ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے دوسروں سے ممتاز اور وہ پختہ ہو چکا ہے بغیر کسی دلآزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبہ کے، ہجو اور سبابی سے پاک وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے سب کے خاکے ایسے دلچسپ کھینچتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا ہر سطر پر لطف لیتا جائے، مسکراتا جائے، جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا۔ ریڈیو بہر حال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد رہتی ہیں۔ ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے لیکن رشید صاحب کی معجز نگاری نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا۔ اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر صفحہ کو زعفران زار بنائے رکھا ہے۔ بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے اور بعض خاکے تو خاص طور پر دلچسپ و پر لطف ہیں۔ ایسے کہ پڑھنے والے انہیں بار بار پڑھیں گے۔ کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں، یہ عیب ہو یا ہنر بہر حال واقعہ یہ ہے کہ رشیدیات سے لطف اٹھانے کے لئے پڑھنے والے کو اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بہ

کثرت ہوتی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ادب اردو کے ہر صاحب ذوق شائق یا طالب علم کے مطالعہ کی میز پر نظر آئے۔ مکتبہ جامعہ نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

ہفتہ وار صدق مورخہ 17/جون 1940 پرچہ نمبر 7 جلد نمبر 6

(160) جزیرہ سخنوران

از غلام عباس صاحب

کتاب خانہ ہزار داستان نئی دہلی

یہ ایک افسانہ ہے نئے اور البیلے رنگ کا، پلاٹ یورپ سے لیا ہوا لیکن قصہ اردو میں بالکل اپنایا ہوا ایک جزیرہ ہے ''جزیرہ سخنوران'' تمام تر شاعروں اور ان کے مداحوں سے آباد، اخلاق کی قیود سے آزاد وہاں یہ سیاح صاحب اپنی ہم سفر ایک حسین خاتون کے ساتھ اتفاق سے جا پہنچتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجلس شوریٰ تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ مجلس کے تین ارکان ہیں ایک ادھیڑ سن کے بزرگ افصح الفصحاء'' شاعر بے ہمتا علامہ مفتی انوار الحسن یکتا دوسرے ایک طرح دار نوجوان، بلبل داستان گلشن معانی، رشک انوری وخاقانی حضرت افعی تیسرے خود صدر مجلس حقیر پر تقصیر خاکسار ذرہ بے مقدار مائل۔

شاعروں کی دنیا شاعری کی دنیا سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور قابل دید سرکاری مہمان خانہ کا نام دار الخیل، باغوں بازاروں، گلی کوچوں کے نام خیابان میر، غالب بازار، آتش باغ، گلزار سرور، کوچہ مومن خان وغیرہ۔ یہاں کے معشوق کا حلیہ۔ نصف عورت نصف لڑکا، ایک طرف محرم چوٹی، موباف، دوسری طرف کلاہ چیرہ اور سبزہ ءخط۔ طبیعت میں سفا کی اور جلادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ ہونٹوں پر عاشقان باوفا کا لہو لگا ہوا کسی پر کمند پھینکی، کسی کے پاؤں میں زنجیر ڈالی، کسی کو شہید تیغ ناز کیا، کسی کو ظلمات میں دھکا دیا کہ عمر بھر ٹامک ٹوئے مارتا رہے۔ کسی کو چاہ ذقن میں غرق کیا کہ جیتے جی سر نہ اٹھا سکے نہ انسان ماموں نہ وحوش وطیور مصؤن۔'' 56-57

رہا عاشق بے چارہ سو وہ مصیبت کا مارا، صدق ووفا کا پتلا، غریب الوطن فلک ناہنجار کا ستایا ہوا بھوکا پیاسا، ننگ دھڑنگ آج یہاں تو کل وہاں۔ کبھی دریا میں

ناخدا پر چھینٹے اڑائے تو کبھی صحرا میں آہوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلے۔ بھیس بدلنے کے فن میں استاد۔ کبھی مجنوں کا روپ دھار، صحرا میں محمل کے گرد پھیریاں لے، تو کبھی فرہاد بن کر کوہ بے ستوں پر تیشہ تیز کرے۔ کبھی انسان تو کبھی جانور، کبھی گھر کی کال کوٹھری میں تو کبھی درخت پر کسی گھونسلہ میں'' 57-58

یہاں کی زبان صنائع کی جان، بدائع کی کان، ایک صاحبہ اپنی ملازمہ کو گھڑک رہی ہیں۔ اری موئی سوئی نہیں ملتی تو گولی مار کیوں پیچ کھاتی ہے (پیچ + ک = پیچک) ایک عاشق صاحب یوں دادِ فصاحت دے رہے ہیں۔

''اے سنگ دل تیری سنگ دلی پر پتھر پڑیں ہم تو تیرے چہرہ بلورین لب لعل ودُرِ دنداں کو یاد کر کے کوہ و بیابان میں پتھروں سے سر پھوڑیں اور تو غیروں کے سنگ گل چھرّے اڑائے ۔

رات آہوں کے شرارے میرے بے ڈھنگ اڑے
کوہ سے سنگ چیخ کر کئی فرسنگ اڑے

معشوق صاحب جواب میں یوں بلاغت کے شرارے چھوڑتے ہیں

''ارے نادان میزان عشق میں پاسنگ ہونا محال، کیوں من من بھر کی باتیں چھانٹتا ہے۔
سنگسار ہونے کی نیت ہے کیا۔''

70 اور 71 پر غالب کے دو شعروں کی جو شرح کی گئی ہے وہ پر لطف ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے مشاعرہ کا منظر بہترین ہے۔...... شعر وادب کے دیوانوں کے لیے ایسے دلکش اور رنگین مرقع کا سودا ایک روپیہ میں مفت ہے۔

صدق نمبر 25 جلد 7 مورخہ 13 اکتوبر 1941

(161) شوکتیات

از شوکت تھانوی

240 صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت درج نہیں، اردو بک اسٹال، لاہور (پاکستان)

اردو کے مشہور مزاحیہ نویس شوکت تھانوی مدت ہوئی اس منزل سے گزر چکے ہیں، کہ ان کا تعارف ہماہمی سے کرایا جائے۔ یا ان کے مزاح وشوخ نگاری کے ذکر کے لیے کوئی تمہید لمبی سی اٹھائی جائے! بہ قول شخصے "آفتاب آمد دلیل آفتاب"۔ وہ خود ایک ادارہ بن چکے ہیں اور تازہ تاریخ ادب اردو کا ایک مستقل باب۔

مزاح کے ڈانڈے تمسخر سے اور ظرافت کے حدود تضحیک سے کچھ ایسے ملے جلے ہوئے ہیں کہ اچھے اچھے غچہ کھا گئے ہیں- آہ سجاد حسین مرحوم اور پرانے اودھ پنچ مرحوم کا تقریباً سارا حلقہ! -اکبر مرحوم کے حس لطیف نے اس باریک فرق کو ملحوظ رکھا، شعوری طور پر تو وہ ظریف تھے ہی اور ظریف رہے۔ غیر شعوری طور پر بھی بھانڈ اور نقال کبھی نہ بن سکے۔

نظم کی مسند تو بدستور خالی ہی چلی آ رہی ہے۔ نثر کے سجادہ پر اکبر کے بعد اگر کسی نے قدم رکھا ہے تو وہ شوکت ہیں- ایک شریف ہنسوڑ، ایک زندہ دل یار شاطر، ایک شستہ و نستعلیق شگفتہ وشاداب انیس صحبت جو ہر وقت آپ کا دل بہلائے اور چہرہ مسکراتا رکھے- ایک فرق کے ساتھ اکبر کے ہاں جہاں حکمت معرفت و معنویت کی گہرائیاں بہت تھیں، وہاں طنز بھی بے پناہ تھا، یہاں یہ "نشتریت" مفقود ہے، نہ ترشی نہ تلخی، بس محض مٹھاس ہی مٹھاس!

لیجیے یہ تو پھر تمہید آرائی ہو چلی - شوکتیات میں ان کے تازہ مضمون درج ہیں۔ تعداد میں 24، شاید اس مناسبت سے کہ 24 گھنٹہ کے دن رات میں ہر گھنٹہ ایک افسانہ پڑھا جائے! عنوانات "صدر مشاعرہ" اور "عالی جاہ" سے لے کر "ارے" اور

''یادداشت'' تک رنگ برنگے۔ان 24 میں برا کوئی سا بھی نہیں اکثر اچھے ہیں۔
بعض بہت اچھے اور دو ایک تو بہت ہی اچھے، ایسے کہ مکرر پڑھیے اور پھر جی نہ بھرے۔
''کالا برقعہ'' ''ایک مکان کی ضرورت'' ''جس محلہ میں ہمارا گھر'' یہ تینوں شوخ نگاری
کے بہترین نمونے ہیں۔شوکت صاحب کوئی معلم، مبلغ اور مصلح نہیں ہیں۔لیکن اسے
کیا کیجیے کہ ایک ہلکا سا اِصلاحی رنگ ان کے قلم کا گویا عرض لازم بن گیا ہے۔''روزہ
چور''، ''افسانہ نگار''، ''وکیل اور زیب داستان'' میں یہ رنگ لاکھ دبانے پر بھی پھوٹ
ہی نکلا ہے: ع

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا!

''1957 کا ایک مشاعرہ'' سب سے الگ نوعیت کا ہے، لکھنؤ کا ماحول جس
حد تک اردو کش ہو چکا اور ہوتا جا رہا ہے۔اس کا خاکہ اس میں کھینچا ہے۔اردو کے درد
منداسے پڑھیں گے تو ہنسی تو کم آئے گی۔عجب نہیں کہ آنکھوں میں آنسو چھلک
آئیں۔یہ کوئی کمال شوکت صاحب کے قلم کا نہیں۔یہ نتیجہ اس کا کہ افسانہ میں
افسانویت سے کہیں زیادہ واقعیت جو جھلک رہی ہے۔ع

تیری چتون میں ہے جادو میرے افسانہ میں ہے!

شوکت کو شدید محبت اپنے وطن سے ہے۔اس لیے شاید ''تھانوی'' کو وہ اب
تک اپنے نام کا جزو بنائے ہوئے ہیں۔ورنہ قدرت زبان و محاورہ کے لحاظ سے تو وہ
اب تھانوی سے کہیں زیادہ لکھنوی ہیں۔وہی ہلکے ہلکے جملے، وہی سبک و سادہ ترکیبیں،
وہی انداز بیان کا بانکپن جو مرزا رسوا اور ریاض خیرآبادی کے زمانہ سے لکھنوی ادب کا
سرمایۂ امتیاز چلے آرہے ہیں۔وہ لکھنؤ میں برسوں رہے، اور رہنے کا حق ادا کر دیا۔
اخّاذ وطبّاع تو ہمیشہ کے تھے۔لکھنوی زبان وطرز بیان کا ایسا چربا اتارا کہ خود لکھنوی
بن گئے۔عیب بینی اور نکتہ چینی کو تلاش کے بعد مشکل سے بس ایک ہی محاورہ کھٹکا۔ص
152 پر وسط صفحہ کے بعد ایک واقعہ کا ذکر کر کے لکھ گئے ہیں کہ ''جس کے نتیجہ کے طور پر
فلاں صورت پیش آئی، یہ لکھنؤ کے پرانے ادیبوں کی زبان نہیں۔وہ لوگ ایسے موقع

پر کام صرف ''جس سے'' یا ''اس سے'' لیتے، اور یہ ایک ہلکی سی لغزش (''غلطی'' ہرگز نہیں) جو ہوئی، یہ نتیجہ ہے انگریزی خبریں اور ان کے ترجمے زیادہ پڑھتے رہنے کا۔ خدا بخشے جالب دہلوی کو کہ باوجود خالص دہلوی اور حضرت داغ کے شاگرد ہونے کے، آخر عمر میں انھیں انگریزی ترجموں کی بدولت کیسے کیسے کاواک اردو فقرے لکھ جاتے تھے۔

شوکت کے فن میں کمی کہیئے یا کمزوری، ایک ہی ہے۔ وہ جس کی تضحیک کرنا چاہتے ہیں، جس کی ہنسی اڑانا چاہتے ہیں، اکثر اس کوشش میں ناکام رہ جاتے ہیں اور الٹے اس سے ہمدردی پیدا کر دیتے ہیں۔ پہلا خاکہ ''صدر مشاعرہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں شوکت صاحب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ صدر صاحب کو اضحوکۂ روزگار ثابت کر دکھائیں۔ لیکن یہ سب کیا دھرا اکارت گیا، اور پھر ''تقریر دلپذیر'' جو صدر صاحب کی زبان سے ادا کی ہے۔ اس میں مضحکہ خیزی سے کہیں زیادہ دلآویزی موجود ہے!۔ اسی کو کہتے ہیں، ع

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی!

وہ آرٹ کو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر آرٹ خود ان سے ایسا چمٹا ہوا ہے کہ چھڑائے نہیں چھوٹتا! اب اسے ان کی شرافت کی افراط کہہ لیجیے یا جو کچھ، بہر حال معاملہ ہے کچھ ایسا ہی۔ سنا ہے جس زمانہ میں شوکت صاحب لکھنؤ ریڈیو میں تھے۔ قدیم طرز کے تھیٹروں کی محض تضحیک کے لیے ایک فیچر ''مون شائین تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام'' کے عنوان سے نشر کیا کرتے تھے۔ لیکن سننے والوں میں شاید دس فی صدی بھی پرانے ناٹکوں سے برگشتہ اور دل برداشتہ نہ ہوتے، بلکہ الٹے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس فیچر کے انتظار میں رہا کرتے تھے۔

صدق جدید، نمبر 15، جلد 2، 24/ مارچ 1952

(162) بزم بے تکلف
ازڈاکٹر سید عابد حسین
قیمت ڈھائی روپیہ۔سنگم کتاب گھر، دہلی۔

جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے پرانے لکھنے والوں میں ہیں، گاندھی جی کی ''تلاش حق''، ''تاریخ فلسفۂ اسلام'' قسم کے ترجموں کے علاوہ ان کی اپنی لکھی ہوئی چیزیں بھی متعدد ہیں۔ایک ٹھوس قسم کے اہل قلم وہ ہمیشہ سے ہیں اور بد گمانی یہ تھی کہ ٹھوس ہی نہیں ذرا ''ٹھس'' قسم کے بھی ہیں۔ان کی ذہانت، ذکاوت اور زندہ دلی کے جوہر تو کہنا چاہیۓ کہ حال ہی میں یعنی 1947 کے بعد کھلے ____ ان کی قلم کی شوخی جیسے اپنے اظہار کے لیے تقسیم ملک کا انتظار ہی کر رہی تھی! ____ وسط 1948 میں انھوں نے ہفتہ وارنئی روشنی نکالنا شروع کیا جو'' تیل'' کی کمی سے ڈھائی برس بعد بند ہو گیا۔اور 83 ہفتوں تک بزم بے تکلف کے ماتحت اپنے قلم کی روانی و برجستگی کے جوہر دکھاتے رہے۔اور یہی مضمون اب یکجا ہو کر کتابی صورت میں شایع ہوۓ ہیں۔

''لائٹ لٹریچر'' کا لفظ ہم نے انگریزوں کی زبان سے سنا۔اردو میں اس کا صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور فرمایا جاۓ۔اس سے معلوم ہو جاۓ گا کہ صحیح ادب لطیف'' نام نہ فحاشی اور پھکڑ کا ہے۔نہ رکاکت وابتذال کا نہ اشخاص کی پگڑی اچھالنے کا، اور نہ آورد و تکلف کے ساتھ موٹے موٹے الفاظ اور مشکل ترکیبوں کے جمع کر دینے کا ہے۔بلکہ یہ تو نام ہے شریفوں کی آپس کی گفتگو کا میٹھی زبان میں صحیح املا و انشاء کے ساتھ جسے سن کر دوسرے ہنسیں مسکرائیں اور ساتھ ہی ساتھ کچھ سیکھتے بھی جائیں۔یہ گفتگو بے تکلف بڑے چھوٹوں سب کے سامنے کی جاسکتی ہے مردانہ میں بھی زنانہ میں بھی۔اس سے مقصود نہ کسی کو بنانا ہوتا

ہے اور نہ اس پر طنز و استہزا کرنا بلکہ صرف ایک معصومانہ انداز سے دلوں کو خوش کرنا اور کچھ تھوڑی بہت اپنی اصلاح کر لینا۔

ایک آدھ ہلکا سا نمونہ اس ہلکی پھلکی شریفانہ ظرافت کا ملاحظہ کرتے چلیے:

''جب اے بی سی نے بی اے ایل ایل بی ہو کر پبلک لائف میں قدم رکھا تو اس کے ہمدردی کے جذبے کو اپنے اظہار کے لیے اور زیادہ وسیع میدان مل گیا۔ وہ ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے ہاں اللہ کا دیا یعنی اللہ کے غریب بندوں سے لیا ہوا سب کچھ موجود تھا اور انھیں کسب معاش میں جان کھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے دیکھا ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص راعی اور رعایا کے بیچ میں پڑے اور اس بات کی کوشش کرے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ سہی کم از کم اس سے خوش رہیں۔ اے بی سی جانتے تھے کہ دل کو دل سے راہ ہو یا نہ ہو مگر دل کو پیٹ سے ضرور راہ ہے۔ چنانچہ وہ قومی خدمت کے لیے پبلک پلیٹ فارم اور لکھنے کی میز سے زیادہ کھانے کی میز سے کام لیتے۔''

(صفحہ 12 تا 13)

ایک اور موقع اسی سے تقریباً متصل:

''بھائی جان کا نام ان کے عزیز دوستوں میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید ان کی بیوی کے سوا سب ہی لوگ انھیں بھائی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ سچ مچ وہ اپنی طرف سے ہر ایک کے ساتھ بھائی صاحب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے حقہ کو اپنا حقہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسر نفسی کی وجہ سے دوسروں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی ان کے ساتھ اس قسم کا برادرانہ

برتاؤ کریں۔" (صفحہ 13)

زبان کی صحت، صفائی، شستگی کتاب کا ایک نمایاں وصف ہے اور یہ وصف اس دور میں جبکہ بچہ بچہ زبان میں اجتہاد کا مدعی ہے، کوئی معمولی وصف نہیں۔ صحیح، شستہ، رواں، بامحاورہ، بےتکلف زبان لکھنے والوں کی تعداد اب انگلیوں پر گننے والی ہے اور اس کتاب کے مصنف کا نام اب اسی مختصر ومنتخب فہرست میں داخل ہونے کے قابل ہے ___ کتاب ادب اردو کے طلبہ کے حق میں ایک نعمت ہے۔

صدق جدید نمبر 40۔ 17/ ستمبر 1954

(163) اپنی موج میں

از ''آوارہ''

120 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ آٹھ آنے، ادارۂ فروغ اردو، امین آباد پارک لکھنؤ۔
(پاکستان میں: مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، مقابل ڈنیسو ہال، کراچی۔2)۔

آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن کے ایک کارکن آوارہ ماہر ہروی مدت سے اپنی مزاحیہ تقریریں سناتے رہتے ہیں۔ زبان خصوصاً دہلی کے محاورات کے گویا بادشاہ ہیں اور مزاح کے لفافہ میں پند لطیف بھی، یہ ان کے 26 مزہ دار نشریوں کا مجموعہ ہے۔ عنوانات بگڑے رئیس، بیٹر باز، چابک سوار، کرخندار، بانکے، رکابدار، بھٹیاری وغیرہ۔ حرف آغاز مدیر صدق کے قلم سے ہے۔

ظرافت نگاری آسان چیز نہیں، جیسا کہ بہت سے نومشقوں نے سمجھ لیا ہے، فطری مناسبت اس کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بعد پھر قلم اور ذوق دونوں کی پختگی بھی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ جب یہ فطری اور اکتسابی دونوں قسم کی صلاحیتیں جمع ہوجائیں، جب کہیں انسان صحیح معنی میں ظریف ہوسکتا ہے۔ ''آوارہ'' صاحب میں یہ سارے جوہر موجود ہیں۔ اور اس سب پر اضافہ ان کی حیرت انگیز قدرت زبان کا ہے۔ زبان دانی ان کی اس غضب کی ہے کہ اس پر اچھے اچھے اہل زبان رشک کر سکتے ہیں۔ محاورات پر عبور کامل کے ساتھ ہر فن کے تلازمے اور ہر پیشے کے مخصوص استعارے گویا انھیں نوک زبان ہیں!

اس دل وجگر کا انسان جب لکھنے یا بولنے پر آئے گا تو قدرۃً اپنے قلم اور زبان کی دھاک بٹھا دے گا۔ افسوس ہے کہ بیچارہ خود اشتہاری کے فن سے واقف نہیں، ورنہ آج اس میدان میں وہی وہ ہوتے۔ ادبیات کے شوقین اور زبان کا چٹخارا لینے والے ناظرین اگر اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیں۔ تو انھیں خود پتہ چل جائے گا کہ تضحیک و تمسخر اور عریانی وفحاشی کے بغیر بھی کوئی تحریر کتنی پر لطف ونشاط انگیز ہوسکتی ہے!

صدق جدید، نمبر 13، جلد 5، 25 فروری 1955

(164) کف گلفروش

از غلام احمد فرقت کاکوروی، ایم اے

223 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ، انوار بک ڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ۔
(پاکستان میں: مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، مقابل ڈینسو ہال، کراچی۔2)

ادارۂ فروغ اردو کی تازہ مطبوعات میں صحیح و شستہ زبان سکھانے والی کتاب 'اپنی موج میں' کے بعد یہی ہے، بلکہ ایک لحاظ سے اس کا نمبر بڑھا ہوا ہے۔ جہاں تک زبان سیکھنے سکھانے کا تعلق ہے، 'اپنی موج میں' صرف خواص کے لائق ہے اور کف گلفروش خواص و عوام دونوں کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔ فرقت کا نام اردو والوں کی دنیا میں کچھ ایسا نیا نہیں ''ترقی پسندوں'' کی تضحیک میں ان کی کتابیں ''مداوا'' اور ''ناروا'' خاصہ نام پیدا کر چکی ہیں۔ وہ ان کی شوخ نگاری کے سلبی و منفی پہلو کو پیش کر رہی تھیں۔ یہ اس کے ایجابی و اثباتی رخ کا جلوہ دکھا رہی ہے۔

یہ کتاب ان کے ۱۷ ہلکے پھلکے نوشتوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کچھ تو یقینی ریڈیو کے نشریے ہیں۔ باقی ممکن ہے کہ رسالوں کے لیے لکھے گئے ہوں۔ عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں: ''دہلی اور لکھنؤ کے بانکے''، ''ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ''، ''لکھنؤ اور دہلی کے بھائی''، ''گاندھی جی اور ظرافت''، ''پرانی دنیا کے شہسوار''۔ ایک قابل مطالعہ مضمون کا عنوان ہے۔ ''جشن جمہوریت کی ایک دوپہر''۔ اس کے پڑھنے سے سرشار کی زبان کا لطف تازہ ہو جاتا ہے۔ مجموعہ کا بہترین مضمون ''ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ'' ہے۔ مشاعرہ کی سکریٹری ڈاکٹر مفید جہاں ہیں اور شاعرہ چھ ہیں۔ ایک میرا بائی (میرا جی کے رنگ میں کہنے والی) دوسری ڈاکٹر مس دلگیر جہاں ہیں جن کی نظم کا عنوان ہے ''سیبوں کی قربانی'' اور جو نظم سناتے وقت فراک کے اوپر کے بٹن کھول دیتی ہیں۔ تیسری مس فیض بانو ہیں (جو شاید منٹو کی نام لیوا ہیں) چوتھی ان، ام

واحد، ہیں، جون، م۔ راشد کے رنگ میں ڈوب کر شعر فرماتی ہیں۔ پانچویں مس ظفر بانو بھی میراجی کا نام روشن کرنے والی ہیں۔ اور چھٹی مس میخوار بانو کا کلام مخمور جالندھری کے رنگ میں رنگین ہے۔ فرقت پروڈی (تضحیک) میں کامل ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا شاہکار بھی اس مجموعہ میں یہی مضمون ہے، لیکن جیسا کہ اکثر طنزیہ نظموں میں ہوتا ہے۔ اس مضمون کی نظمیں بھی دودھاری تلوار کے حکم میں داخل ہیں۔ یعنی جہاں وہ عریاں نظموں کا بھرپور جواب ہیں وہیں وہ ناواقفوں کے لیے عریانی آموز بھی ہیں۔ اس لیے ایسی تحریریں ہر ہاتھ میں جانے کے قابل نہیں۔ اس ایک خطرناک پہلو کو چھوڑ کر باقی اور ہر حیثیت سے کتاب قابل دید ہے۔

کتاب کے شروع میں جو ایک معروف افسانہ نویس سید علی عباس حسینی کے قلم سے ''تعارف'' ہے (تعارف کتاب کا نہیں، کتاب نویس کی شخصیت اور کسی قدر عجیب شخصیت کا) بجائے خود پڑھنے کے قابل ہے۔

صدق جدید، نمبر 18، جلد 5، یکم اپریل 1955

(165) لطائف السعادت

از انشاء اللہ خاں انشاء

مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ایم اے، پی ایچ، ڈی۔19+180 صفحہ مجلد، قیمت دو روپیہ،
نمبر 2391۔فسٹ عیدگاہ، میسور۔

انشاء کی شہرت ایک فاضل و محقق زبان دان کی حیثیت سے اب تک دریائے لطافت کے دم سے تھی۔اب میسور کی ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جن کے تحقیقی نوادر اور واقعی ادبی تحقیق کی ایک نادر مثال ہے، کہیں سے ان کی ایک اور مختصر سی کتاب لطائف السعادت کے نام سے ڈھونڈھ نکالی، اور اس میں اپنی محنت اور تلاش سے وہ وہ اضافہ کیے اور اپنی ذہانت سے ایسی ایسی گلکاریاں کیں کہ بہ قول شخصے،

قصۂ زلف مختصر نہ ہوا

26 صفحہ کا رسالہ کوئی دو سو صفحہ کی کتاب کی ضخامت تک پہنچا! اور جو ایک کچا گھروندا سا تھا، اس پر گمان قصر معلےٰ کا ہونے لگا!

انشاء کے زمانہ میں اودھ کے فرمانروا نواب سعادت علی خاں تھے۔انشاء ان کے درباری تھے۔بادشاہ کی زبان سے چلتے ہوئے فقرے کبھی کبھی ارشاد ہوتے ہی تھے۔انشاء نے درباری ہونے کا حق یوں ادا کیا کہ نطق شاہی کے ان نمونوں کو لطائف و ظرافت میں شمار کیا اور انھیں اپنی عبارت میں مرتب کر کے مجموعہ کا نام لطائف والسعادت رکھ دیا۔ایسے لطیفوں کی (اگر انھیں لطیفہ کہنا درست ہو) تعداد 55 ہے۔کتاب میں یہ کل 52 صفحوں (ص:16-67) میں آ گئے ہیں، یعنی ان کا اصل فارسی متن کل 26 صفحہ کا رہتا ہے اور ان صفحوں میں بھی حاشیے کثرت سے ہیں۔مرتب صاحب کے کچھ خود لکھے ہوئے اور کچھ دوسروں سے لکھوائے ہوئے!

...... یہ منظر دیکھ کر دورِ قدیم کے مصنفین یاد آ جاتے ہیں جب دستور یہ تھا کہ متن اگر چند ورق کا ہے تو اس کی شرح بیسیوں ورق میں ہو اور پھر شرح پر حاشیے اور تعلیقات کے اوراق کی میزان پچاسوں بلکہ سیکڑوں اوراق تک پہنچ جائے !۔

لیکن فاضل مرتبہ کی یہ سعی رائگاں نہیں، ان کے حواشی اور تبصروں ہی نے تو کتاب میں جان پیدا کر دی ہے۔ ورنہ کتاب بجائے خود بے جان سی تھی، دو لطیفوں میں سے دو چار بھی ایسے نہیں جن سے کسی خاص ذہانت، برجستگی، حاضر جوابی کا پتا چلتا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ایک درباری کو اپنے بادشاہ کی ہر ہر بات میں کوئی نکتہ نظر آتا رہے۔ اور متعدد جگہ تو ان لطیفوں میں کھلا ہوا فحش ہے۔ مثلاً

ص:38 لطیفہ 20 اور 21

ص:40 ،، آخر 23

ص:58 ،، 41

ص:64 ،، آخر 51

کہیں تو فحش کے ساتھ جرکنیت کی بھی آمیزش ہے۔ مثلاً ص: 50 لطیفہ 36۔

مرتبہ کی تلاش و تفحص یقیناً قابلِ داد بلکہ قابلِ رشک ہے۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے انھوں نے اپنے کام کی چیزیں ڈھونڈ نکالی ہیں۔ ان کا ذوقِ ادب بھی اعلیٰ اور قابلِ احترام ہے۔ اور یہ بھی لائقِ صد شکر ہے کہ بجائے ترقی پسند افسانہ نویس ہو جانے کے، کم سے کم ایک تعلیم یافتہ خاتون تو ہماری قوم سے ادبی تحقیق کے میدان کی طرف آئیں۔ لیکن اس پر بھی حیرت ہے کہ انھوں نے آخر ایسی کتاب کا انتخاب ہی کیوں کیا...... یہ دین کی کوئی خدمت تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے۔ لیکن دنیا کی بھی کسی خاص قیمتی اور مفید خدمت سے ان کی اس تلاش و تعب کو تعبیر کرنا مشکل ہی ہے، گو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ انھوں نے وسعتِ معلومات، ذوقِ تحقیق اور ادبی موشگافیوں کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور آزاد، شیفتہ، صغیر بلگرامی، تنہا میرٹھی غرض جس کسی

نے بھی کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس سے انشا کی کسر شان ہوتی ہو، محترمہ مرتبہ ایک ایک سے انشاء کی طرف سے لڑتی پھری ہیں۔

مرتبہ کی مشقت اور سعی تحقیق کی داد اور پوری داد دیے بغیر چارہ نہیں، لیکن دوسری طرف یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا، کہ کاش اتنی دماغ سوزی اور عرق ریزی کسی بہتر موضوع پر کی گئی ہوتی۔ ایسے ''کوہ کندن'' سے حاصل کیا، جس کا نتیجہ محض ''کاہ برآوردن'' رہے!۔

صدق جدید، نمبر 45، جلد 6، 5/اکتوبر 1956

(166) صیدِ ہدف

از غلام احمد فرقت

قیمت مجلد ڈھائی روپئے، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ۔

اس ادارے کی مطبوعات کو پڑھنا اب ناظرین اور تبصرہ نگار دونوں کے لیے اچھا خاصا صبر آزما ہوگیا ہے۔ سوا دو سو صفحات کی ضخامت، مضامین پندرہ بیس کی تعداد میں، اور کتاب فہرست مضامین سے یکسر خالی! دوسرے اشاعتی ادارے اب اشاریے وغیرہ بڑھا کر اپنے ناظرین کے لیے سہولتیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس ادارے نے غالباً بر بنائے کفایت شعاری فہرست جیسی ضروری چیز سے بھی اپنے ناظرین کو محروم رکھنا گویا اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ شاید اسی اعتقاد پر کہ لوگ مصنف کا نام سن کر کتاب بہرحال خرید ہی لیں گے۔ فرقت کاکوری اب اردو کے پڑھے لکھے حلقوں سے خاصے روشناس ہو چکے ہیں۔ ''پیروڈی'' (طنزیہ نقالی) تو گویا ان کا حصہ ہو چکی ہے۔ لکھنوی زبان تو انھیں پہلے سے آتی تھی پر اب دہلی کا طویل قیام اور کالج میں درسی مشغلہ ان پر مستزاد ہو گئے ہیں۔ کتب ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ بعض مضمون بہت چھوٹے اور بعض اچھے بڑے۔ نوعیت سب کی تفریحی (اور تفریح بے ضرر معصوم قسم کی) اور بعض میں ہلکا اصلاحی رنگ بھی۔ مزاح و ظرافت کا مزاج نرم و نازک ہوتا ہے۔ ذرا آنچ تیز ہوئی اور قوام بگڑا۔ مزاح میں تلخی پیدا ہوگئی۔ افسوس ہے کہ اس مجموعہ میں مولانا حسرت موہانی کے ذکر میں ذرا صورت تضحیک کی پیدا ہوگئی ہے۔

سرسری نظر میں بہترین مضمون ننب سے آخیر کا معلوم ہوا ''ایک صدی بعد نصاب اردو''۔ جس میں ایک معلوم و معروف ترقی پسند شاعر کی نظم ''لب جوئبار' کی گندہ مذاقی کی پوری تشریح کر دی گئی ہے۔ چہر کنیت ترقی پسندی کے دور میں۔

صدق جدید نمبر 29 جلد 7 مورخہ 21/جون 1957

(167) طنز و مزاح

از غلام احمد صاحب فرقت

جلد اول 399 صفحہ، جلد دوم از صفحہ 403 تا 824 قیمت دس روپے

ادارۂ فروغ اردو، 27 امین آباد پارک، لکھنؤ۔

کتاب کا پورا نام اردو ادب میں طنز و مزاح ہے۔ اور یہ عنوان مضمونِ کتاب کا پوری طرح مظہر ہے۔ فرقت کاکوروی خود ایک اچھے خاصے شوخ نگار ہیں اور ''پیروڈی'' (مضحک نقالی) میں تو کہنا چاہئے کہ انھیں کمال حاصل ہے۔ کتاب میں طنز و مزاح کے نمونے اردو ادب سے لے کر انھیں کے جمع کئے ہوئے ہیں۔ جلد اول نظم سے متعلق ہے اور جلد دوم نثر سے۔ لیکن اصل کتاب سے قبل جو ضخیم مقدمہ ڈھائی سو صفحوں کا درج ہے وہ بجائے خود ایک کتاب کا حکم رکھتا ہے!۔ ''مقدمہ'' کا لفظ ابھی زبانِ قلم پر آیا ہے۔ یہ صرف فہرست مضامین سے ماخوذ ہے ورنہ اصل کتاب میں کہیں مقدمہ درج نہیں۔ اسی طرح ایک عنوان باب ۱۱ پر ملتا ہے اور ایک دوسرا عنوان باب 23 پر لیکن فہرست مضامین ان دونوں عنوانوں سے خالی ہے! ایک لطیفہ اور صفحہ 16 تک کتاب کے صفحوں کا نمبر صفحہ کے پیچھے پڑا ملتا ہے۔ صفحہ 17 پر پہنچ کر دفعتاً کاتب صاحب کو اس کی اصلاح کا خیال آتا ہے اور پھر آخر تک صفحہ کا نمبر صفحہ کے اندر ہی ملتا ہے! غرض کتاب ان کتابتی اور طباعتی نوادر و عجائب کا مجموعہ ہے۔ جواب ادارۂ فروغ اردو کی مطبوعات کا حصہ ہو چکے ہیں۔

جلد اول میں انتخاب قدیم و جدید تقریباً تیس شاعروں کا ہے۔ جعفر زٹل اور سودا سے شروع ہو کر فرقت کاکوروی اور کنہیا لال کپور تک اور درمیان میں علاوہ اکبر الہ آبادی وغیرہ کے مولانا شبلی، اقبال و ظفر علی خاں بھی ہیں۔ اور جلد دوم میں کوئی 26 نثر نگاروں کا ذکر ہے۔ غالب سے لے کر فرقت کاکوروی تک اور اس فہرست میں جہاں

نام سجاد حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ) اور سرشار اور شوکت تھانوی اور قاضی عبدالستار کے ملتے ہیں وہیں منٹو اور سجاد انصاری کے بھی موجود ہیں۔ انتخاب سے قبل سب کے تمہیدی تذکرے اور تبصرے ہیں۔ اور مولف اپنا اسی قسم کا فرض مفصل مقدمے میں بھی ادا کر چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سارے انتخابات ایک سطح کے نہیں۔ اور جہاں بعض اعلیٰ نمونے مزاح وشوخی وطنز وتعریض کے درج ہوئے ہیں وہیں بعض لفظی اور بعض معنوی اعتبار سے بڑے ہی پست ہیں۔ اور فرقت صاحب نے ستم یہ کیا ہے کہ جو پیشہ ور ہنسوڑ ہیں اور جن کا کام ہی ہنسانا، دل کا بہلانا تھا (مثلاً سرشار) انھیں ان لوگوں کی صف میں رکھ دیا ہے جو کوئی سیاسی یا دینی مقصد پیش نظر رکھتے تھے۔ (مثلاً مولانا ابوالکلام) اور شوخی ان کے اندازِ بیان میں آ گئی تھی نہ کہ نفس مضمون میں۔ اور مولف کا تصور بھی طنز اور مزاح کے کھلے ہوئے فرق کے متعلق زیادہ صاف نہیں۔ پھر اودھ پنچ، الہلال وغیرہ کے پرانے مضامین پر توضیحی نوٹ بھی ضروری تھے۔ اب کس کے دماغ میں اتنے عرصے کی تلمیحات محفوظ ہیں؟۔ تاہم اتنا ضخیم مجموعہ اس موضوع پر شاید ہی کہیں اور یکجا مل سکے۔ اور مولف کی کوشش جمع وفراہمی کی حد تک تو بہر حال قابلِ داد ہے۔

صدق جدید نمبر 34 جلد 7 مورخہ 22/ جولائی 1957

صنف ادب (لسانیات)

(168) آریائی زبانیں

از ڈاکٹر سدھیشو رورما

سب رس کتاب گھر، حیدرآباد۔

اس مختصر سے رسالہ اور بہ قامت کہہ تر بہ قیمت بہتر کے مصداق کا اصل موضوع آریائی زبانوں کے ارتقاء اور ہندوی زبان کی خصوصیتوں کی تحقیق ہے اور یہ رسالہ محض ادبی نہیں لسانیاتی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ لسانیات کا موضوع خشک سمجھا جاتا ہے لیکن رسالہ اس حقیقت کی ایک عملی مثال ہے کہ ایک اچھا اہل قلم اور ماہر فن خشک موضوع کو بھی کسی حد تک شگفتہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے۔

لفظ ہندوی کی تشریح خود مصنف کی زبان سے سن لیجیے۔

''ہندوی آریائی کی نہایت اہم شاخ وہ زبان ہے جسے غیر واضح معنی میں ہندوستانی کہا جاتا ہے لیکن اس کتاب میں ہندوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لفظ ہندی اس زبان کے ناموں میں سب سے پرانا ہے، اس کے بعد ہندی، اردو اور ہندوستانی کا استعمال ہونے لگا۔۔۔ غلط فہمی کو روکنے کے لیے اور زبان مخصوص کو وسیع سے وسیع معنی میں پھیلانے کے لیے تاکہ اس میں ادبی ہندی، ادبی اردو ان پڑھ لوگوں کی ہندوستانی وغیرہ سب کی شمولیت ہو جائے میں نے اسی پرانے لفظ ہندوی کو ترجیح دی ہے۔'' صفحہ ۱۱۔

اس زبان کی اہمیت اور وسعت بھی دنیا کی زبانوں میں معلوم کر لیجیے۔

''بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ہندوی یعنی اردو اور ہندی کے مجموعے کا نمبر دنیا میں تیسرا ہے یعنی اول نمبر چینی کا، دوسرا انگریزی کا اور تیسرا نمبر ہندوی کا ہے۔'' صفحہ ۱۱۔

اس معیاری ہندوی یعنی مشترک و عام فہم بولی ہندوستانی کو ادبی اردو اور ادبی ہندی سے ممتاز کرنے کے لیے مثال میں فاضل مصنف نے حسب ذیل فقرے لکھے ہیں۔

اس کی جورو چل بسی (معیاری ہندی)

اس کی دھرم پتنی کا دیہانت ہوگیا (ہندی)

اس کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا (اردو)

لیکن یہ کتاب خود شروع سے آخر تک جس زبان میں ہے وہ نہ ہندوی ہے نہ ہندی بلکہ یقیناً اردو ہی ہے۔

لسانی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس میں بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی۔ تنوع فارسی اور جدید ایرانی وغیرہ متعدد زبانوں کی ساخت اور خصوصیات کے متعلق اچھی خاصی واقفیت ہم کو مل جاتی ہے، ادارہ ادبیات اردو ایسی ٹھوس علمی خدمت کے لیے قابلِ مبارکباد ہے۔

صدق نمبر 11 جلد 10 مورخہ 10/ جولائی 1944

صنف ادب (لغت)

(169) لغت جدیدہ

از مولانا سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

موضوع نام سے ظاہر ہے عربی زبان خصوصاً مصر و شام میں دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی آج محض قدیم عربی زبان وادب کے سہارنے ممکن نہیں کہ کوئی شخص عربی اخبارات کو پوری طرح سمجھ لے۔ ملک کے مشہور فاضل وادیب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے آج سے پچیس سال قبل اس ضرورت کو محسوس کر کے تقریباً چار ہزار جدید عربی کی فرہنگ ترتیب وارمعہ ان کی تشریح وتحقیق اور مفید و دلچسپ تمہیدی مطالب کے شائع فرمائی تھی۔ عربی ادب کی دنیا اس ربع صدی کی مدت میں اور آگے بڑھ گئی۔ کتاب کا نیا ایڈیشن نکلنا ضروری تھا۔ مولانا کے ایک شاگرد رشید مولوی مسعود عالم ندوی مدیر الضیاء مرحوم اور ادیب دارالعلوم ندوہ نے اس کام کے لئے وقت نکالا اور اب یہ کتاب مزید ایک ہزار الفاظ کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ عربی کے جدید الفاظ اور تراکیب پر موصوف کا 30 صفحہ کا پرمغز و مبصرانہ مقالہ خصوصیت کے ساتھ دادطلب ہے۔ نفس لغت میں کہیں کہیں انگریزیت ذرا زیادہ آگئی ہے لیکن اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ جو لوگ جدید مصری تالیفات، رسائل اور اخبارات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں نیز صحیح وغلط کا امتیاز مٹانہیں دینا چاہتے ہیں ان کے حق میں کتاب کا وجود ایک نعمت ہے۔

صدق نمبر 16 جلد 3 مورخہ یکم اکتوبر 1937

(170) اصطلاحات پیشہ وران (جلداول)
از مولوی ظفرالرحمٰن دہلوی
انجمن ترقی اردو، دہلی۔

اردو کے کوئی سو پچاس نہیں ہزار ہالفظ ایسے ہیں جو اچھے خاصے زبان دانوں کو بھی معلوم نہیں۔ اور یہ مختلف پیشوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں اور بڑی دقت یہ تھی کہ اب تک ان کے لئے کوئی لغت بھی موجود نہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے حقیقت میں یہ بڑا کام کردیا کہ ان اصطلاحات کو قید تحریر میں لے آئی۔ اور داد کے قابل ہے مولوی ظفر الرحمٰن کی ہمت کہ انہوں نے محنت شاقہ گوارہ کر کے مختلف پیشہ وروں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کر اور خدا معلوم کس کس جتن سے ان سے سیکھ کر اتنی بڑی کتاب مرتب کر ڈالی۔ علاوہ ایک مختصر دلچسپ تعارف اور دیباچہ کے، کتاب دو فصلوں میں تقسیم ہے۔

(1) تیاری مکانات

(2) تہذیب و آرائش عمارات

پہلی فصل کے ماتحت دس مختلف پیشوں، خیمہ سازی، سنگ تراشی، نجاری وغیرہ کی اصطلاحین درج ہیں۔ اسی طرح دوسری فصل کے نیچے دس دوسرے پیشوں رنگ کاری، خرادی، وغیرہ کی اور اسی میں پیشہ گھڑی سازی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ کتاب دیکھنے سے قبل خیال کسی کو نہیں ہوسکتا تھا کہ پیشے اتنے موجود ہوں گے چہ جائیکہ ہر پیشے کے اصطلاحات! سہولت تفہیم کی خاطر کتاب میں جا بجا نقشے اور تصویریں بھی ہیں اور آخر میں مفصل انڈکس (اشاریہ) خاص طور پر کارآمد ہے۔ کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ ادب کے حق میں مفید ہوگا بلکہ مختلف پیشوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی عجب نہیں کہ بہت سی چیزیں اپنے مذاق کی مل جائیں۔

صدق نمبر 30 جلد نمبر 5 مورخہ 29/ اپریل 1940

(171) اسٹینڈرانگلش اردوڈکشنری

مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

انجمن ترقی اردو دہلی

برے کے لئے سمجھیے چاہے بھلے کے لیے بہر حال اردو کا سابقہ تو انگریزی کے ساتھ پڑچکا اور تقدیر الٰہی کا یہ نوشتہ آج سے ڈیڑھ صدی ادھر پورا طے ہو چکا کہ اردو خوانوں کو لکھائی اور پڑھائی میں اوسط اور اعلیٰ امتحان میں، بڑی تجارت میں، وکالت میں سرکاری اور نیم سرکاری عہدہ داری میں غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں محتاج اور دست نگر 'صاحب' ہی کی زبان کا ہو کر رہنا پڑے گا۔

حیرت ہے کہ ضرورت اتنی صریح اور واضح پھر بھی اب تک اردو میں کوئی قابل ذکر لغت موجود نہ تھا جس کے
سہارے انگریزی زبان کی طویل وعریض الفاظ ہی کی پوری پیمائش ہو سکے۔ انگریزی کنایات، تلمیحات، محاورات، استعارات کا پوری طرح سمجھنا الگ رہا- ایک ڈاکٹر فیلن کا لغت البتہ پیش کیا جا سکتا ہے رومن حروف میں چھپا ہوا سو ظاہر ہے انگریزی زبان اتنی مدت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی بعد کے لوگوں نے تھوڑی بہت کوشش کی بھی تو کاروباری نقطۂ نظر سے اور ان کی ہمتیں بھی طلبہ کی محدود ضرورتوں سے آگے نہ بڑھیں۔

ضرورت اور علمی حلقوں میں شدید ضرورت عرصہ دراز سے چلی آرہی تھی کہ انگریزی کا کوئی جامع ومبسوط نہ سہی اوسط ہی درجہ کا مفصل لغت اردو میں اور اردو رسم الخط میں موجود ہو۔ مدتیں اسی آرزو میں گذر گئیں تا آنکہ جس جوان ہمت خادم اردو کے نصیب میں یہ سعادت ازل سے لکھی جا چکی تھی اس کے ہاتھوں یہ خدمت انجام پا کر رہی۔ مولوی عبدالحق اور اب ڈاکٹر عبدالحق بی اے، ڈی لٹ سکریٹری انجمن ترقی

اردوئے دہلی کی خدمات زبان وادب سے ملک کو روشناس کرانا ''سورج کو چراغ ہے دکھانا'' ایک عمر ہوگئی کہ اپنے کو خدمت اردو کے پیچھے فنا کیے ہوئے ہیں فطرت الٰہی کی معدلت شعاری پر حرف آجاتا اگر اتنی اہم وعظیم الشان خدمت ان کے سوا کسی اور کے ہاتھوں انجام پاتی۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری اس وقت انگریزی زبان کا مبسوط ترین جامع ترین مستند ترین لغت ہے۔اس کا ایک اختصار ''شارٹر'' کے نام سے ہے دو ضخیم مجلدات میں اور پھر اس اختصار کا ایجاز بھی 'کنسائزڈ' کے نام سے نکل چکا ہے۔

اس موجز کے ایجاز کا یہ حال ہے کہ اس کی بھی ضخامت 928 صفحات کی ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم جملہ عنوانات مستقل وضمنی کی تعداد کل ملا کر دو لاکھ کے لگ بھگ پہنچتی ہے۔ڈاکٹر عبدالحق کی ہمت اس پر مصروف اور اس توجہ پر مستعد ہوگئی کہ اس بحر ذخار کو اردو کے دامن میں سمیٹ لیا جائے!

کام نہ ایک شخص کے کرنے کا اور نہ چند روز میں ہو جانے کا۔کام کا پھیلاؤ مقتضی تھا کہ ایک پوری جماعت اہل علم وتحقیق کی ہوتی جو دوسرے مشاغل سے فارغ اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کر دیتی ایک عظیم الشان کتب خانہ پاس ہوتا،محرروں، کاتبوں، دفتر کے کارکنوں کا ایک پورا ''منشی خانہ'' مہیا ہوتا جب کہیں جا کر برسوں میں کام کی تکمیل ہو جاتی۔اردو غریب کے نصیب میں یہ انتظامات کہاں؟ ہمت کا کمال دیکھئے کہ مولوی عبدالحق نے اپنے بیسیوں دوسرے علمی تصنیفی مشاغل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظامت انجمن ترقی اردو کے دماغی کام کاج کے حق میں زہر قاتل۔بیرون در Out door دوڑ دھوپ کے ساتھ اس کام کا بھی بیڑا اٹھالیا اور وہی چار رفیقوں کی معیت میں اس ہفت خوان کے سفر پر چل کھڑے ہوئے۔اللہ نے وقت اور ہمت میں برکت دی رفیق دو ہی ایک سہی مگر خوب کام کے نکلے خصوصاً جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر عابد حسین۔نتیجہ اس کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔جس پر تبصرہ کی یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔

کتاب کا نام اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری ہے ضخامت لمبی چوڑی تقطیع کے 1512 صفحات۔ اور کوئی 25 صفحے دو ضمیموں کے اور 6 صفحوں کا دیباچہ کل ضخامت گویا 1550 صفحات کی۔ ہر صفحہ میں دو کالم، اردو کی چھپائی ٹائپ کی ٹائپ جلی نہیں خفی ہے اس لئے گنجائش بہت زائد نکل آئی۔ کاغذ اہتمام کے ساتھ باریک رکھا گیا اس لیے کتاب ایک جلد میں آ گئی ورنہ حقیقتہ مسالہ پڑھنے کا اتنا ہے کہ دو مجلدات سے کم کفایت نہ کرتا۔ دیباچہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے ایک طرف فاضل مرتب کی کوششوں اور کاوشوں کا کچھ اندازہ ہوگا اور دوسری طرف کتاب کی کچھ خصوصیات بھی روشنی میں آ جائیں گی۔

"کہنے کو تو یہ نظر ثانی تھی لیکن حقیقت میں از سرنو ترجمہ کرنا پڑا، شاید ہی کوئی لفظ ہوگا جو حک و اصلاح سے بچا ہو۔ بڑی احتیاط یہ کی گئی کہ انگریزی لفظ کے لئے اردو لفظ، انگریزی محاورہ یا روزمرہ کے لیے اردو محاورہ یا روزمرّہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح بٹھائی جائے کہ انگریزی کا پورا مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔ لفظ کی تشریح تو آسان ہے لیکن لفظ کے لیے لیکن لفظ کے لئے ویسا ہی لفظ اور محاورہ کے لیے ویسا ہی محاورہ لانا مشکل کام ہے۔ بعض اوقات ایک ایک لفظ کے لیے بیسیوں کتابوں کے ورق الٹنے پڑتے تھے بول چال یا عامیانہ الفاظ کے لیے اردو میں بھی اسی قسم کے الفاظ تلاش کرنا پڑتے تھے۔ علمی اصطلاحوں کے لیے پیشہ وروں کی اصطلاحیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لانا پڑتی تھیں۔ ایسی صورتوں میں اکثر کتابیں اور لغات کام نہیں دیتی تھیں۔

اسی طرح انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو کے مترادف الفاظ سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں ہر معنی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف ظاہر ہو جائے۔ اور ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ محض تشریح کر دینے سے نہ تو پورا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال معلوم ہوتا ہے۔" (دیباچہ ص 5)

کام کی نزاکت اور دشواری کا اندازہ پڑھنے والے کو نہیں لکھنے والوں میں بھی صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں خود کبھی ایک آدھ صفحہ لغت کے کام کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم عام ناظرین بھی کام کی وسعت وعظمت کا کچھ تو اندازہ کر ہی سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو۔ انگریزی میں ایک آسان لفظ About ہے۔ اس ایک ہلکے اور سادہ لفظ کے دیکھئے کتنے معنی اور پہلو نکلتے ہیں۔

(1) اطراف میں چاروں طرف

(2) کسی مرکز کے گرداگرد جیسے اپنے اردگرد

(3) کسی طرف، کسی رخ، آس پاس، دروازہ کے آس پاس رہنا

(4) یہاں، وہاں، اِدھر، اُدھر، جا بجا، ہر کہیں

(5) کم وبیش، تخمیناً، تقریباً، لگ بھگ۔ (تعداد، پیمانہ یا درجہ کے اعتبار سے)

(6) پھر کر۔ گھوم کر۔ پلٹ کر۔

(7) چاروں طرف۔ مخاطب ہو کر۔ ہر طرف پھر کر

(8) مشغول، مصروف، فکر میں

(9) متعلق بہ۔ بابت؛ نسبت۔ بارے میں

(10) گھوم کر، چکر کاٹ کر۔ پھیر دے کر۔ گھوم گھام کر۔

(11) عنقریب، بالکل بھی۔ تقریباً ص 4

اس لفظ کے اصلی اور ابتدائی معنی تو وہی ہیں جو نمبر اول پر درج ہیں باقی نقرہ میں دوسرے لفظوں کی ترکیب وامتزاج کے ساتھ محاورہ میں جو جو مفہوم پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کی تشریح نمبر 2 سے نمبر 11 تک بیان ہوئی۔ اصل کتاب میں ان سب کے مقابل انگریزی کے بھی پورے پورے فقرے درج ہیں۔ یہاں نقل میں انہیں حذف کر دیا گیا ہے کہ انگریزی عبارتوں کی چھپائی اردو اخبار میں آسان نہیں۔

ایک مثال تفحص وجامعیت کی اور دیکھتے چلئے انگریزی کا ایک لفظ Pole

ہے جس کے دو معنی ہیں ایک عام اور دوسرے اصطلاحی۔ اور پہلے معنی میں وہ عموماً بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بہ طور فعل متعدی بھی۔ اب اس لغت میں اس کے دونوں معنی عمومی اور اصطلاحی ملاحظہ ہوں۔ انگریزی لفظ کا عنوان مکرر دیا گیا ہے۔ عنوان اول کے تحت میں:

(1) بانس۔ بلی (خیمہ)۔ چوب۔ تار کا کھمبا

(2) گاڑی کا بم

(3) پول۔ ڈنڈا وغیرہ بطور پیمانہ ساڑھے پانچ گز

(4) بانس یا بلی کے ذریعہ ڈھکیلنا یا سرکانا

اور عنوان ثانی کے تحت میں:

(1) قطب (شمالی یا جنوبی) محور ارض کا (شمالی یا جنوبی) نقطہ جس کے گرد ستارے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

(2) (ہندسہ) کسی کرہ کے دو دو نقطے جن پر کوئی دوسرا اس کرّہ کو قطع کرتا ہے۔ قطبین کرّہ

(3) کوئی قائم نقطہ جس کی نسبت سے اور نقطوں کے محل کا تعین کیا جائے۔ نقطۂ قائمہ

(4) (جمع) مقناطیس کے دو مقابل نقطے یا مقناطیسی قوت کے مرکز۔ قطبین مقناطیسی

(5) برقی کارخانے یا مورچے کے منفی اور مثبت سرے

(6) (حیاتیات) کسی کروی یا بیضوی عضو کے محور کا سرا

(7) مجازاً (جمع) ایک دوسرے سے متضاد اصول۔ اضداد

مقابل کے انگریزی فقرے یہاں بھی نقل میں نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

ساری کتاب اول سے آخر تک تلاش و کاوش، جامعیت و ہر جہتی کے اسی رنگ میں لکھی گئی ہے اور مستقبل کے اردو مترجمین انگریزی کے لئے راستہ اس حد تک صاف کر دیا گیا ہے کہ اس کتاب کے قبل اس کا تصور بھی مشکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ الفاظ کی تشریح و تحقیق کے نمونے کے لئے تو یہ مثالیں بالکل کافی ہوں گی لیکن فاضل مرتب کا

ایک اور کمال یہ ہے کہ حتی الامکان انگریزی ضرب المثل کے مقابل اردو ضرب المثل اور انگریزی محاورہ کے مقابلہ میں اردو محاورہ کا التزام رکھا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے "As stiff as a poker" لفظی معنی ہیں ''ایسا سخت جیسے آگ کریدنے والی سلاخ''، لیکن اس لغت میں اس کے بجائے آپ کو اردو کی ایک مثل ملے گی ''ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا ہوا'' ص 882 یا انگریزی فقرہ Make no sing کے لئے ''ٹس سے مس نہ ہونا'' ص 113۔

کتاب کی اصل غایت انگریزی خواں حلقہ اردو کی خدمت کرنا اور اس کو نفع پہنچانا ہے لیکن کتاب صرف انہیں لوگوں کی راہ ہموار نہیں کرتی جو اردو میں انگریزی خیالات کو ترجمہ و تالیف کے ذریعہ لانا چاہتے اور انگریزی تحریر و تقریر کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس کتاب نے اردو میں بجائے خود ہی الگ سے نئے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس لئے کہ انگریزی الفاظ کی توضیح و تشریح میں مرتب نے محض موجودہ فرہنگ الفاظ پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ جا بجا نئے الفاظ بھی اپنی طرف سے تراشتے اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرتے گئے ہیں۔ عموماً ایسے الفاظ قوسین کے اندر 'ح ج' (مخفف جدید) کے اضافہ سے پہچان لئے جاتے ہیں اس قسم کے بھی چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

Impressionable کے لئے 'زود تاثیر' ص 566 ک۔2

Colour blind کے لئے رنگودھا۔ رنگندھا (رنگ-اندھا) ص 206 ک۔1

Absentee کے لئے ''غائب باش'' ص 50 ک۔1

Ard Yark کے لئے 'گھونسور'۔ زمیخوک (زمین خوک) ص 1۔ک 1

لغت اردو خونوں کے لئے انگریزی الفاظ کے معانی کا آئینہ دار ہے اس لئے قدرتاً انگریزی الفاظ کے تلفظ سے اسے سروکار نہیں، تاہم جو الفاظ فرنچ، لاطینی وغیرہ کے انگریزی میں گھل مل گئے ہیں اس تقریب سے اس لغت میں بھی جگہ پا گئے ہیں۔

صدق نمبر 10 جلد نمبر 6 مورخہ 16 جولائی 1940

(172-73) اصطلاحات پیشہ وران حصہ 2، 3

ازمولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی

انجمن ترقی اردو۔ دہلی

انجمن ترقی اردو تحفظ زبان و خدمت ادب کا کام جن مطبوعات سے لے رہی ہے ان میں خاص طور پر قابل ذکر یہ پیشہ وروں کی لغت ہے جس کا پہلا حصہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا اور یہ دو حصے اب نکلے ہیں۔ دوسرے حصہ کا موضوع تیاری و تزئین لباس ہے۔ اس سلسلہ میں 3 فصلیں ہیں پہلا پارچہ بافی و پارچہ سازی دوسری زربانی وزردوزی، تیسری چرم سازی و پاپوش دوزی۔ ہر فصل کے ماتحت متعدد پیشے ہیں۔ مثلاً پیشہ کتائی سوت، پیشہ دھلائی، پیشہ رنگائی، پیشہ رفوگری، پیشہ سلما سازی پیشہ رنگائی چرم۔ اس طرح 22 پیشوں سے متعلق تقریباً 2 ہزار اصطلاحی الفاظ مع ان کی شرح آگئے ہیں۔

اسی طرح تیسرا حصہ چار فصلوں پر شامل ہے۔ پہلی فصل فن ظروف سازی و ملمع کاری پر ہے۔ اوراس کے اندر نو پیشے ہیں۔ مثلاً کمہاری ٹوکری سازی، قلعی گیری وغیرہ۔ دوسری فصل کے ماتحت سات پیشے ہیں مثلاً ماہی گیری، چڑیماری، قصابی وغیرہ۔ تیسری فصل تیاری خوراک پر ہے اور اس کے تحت میں چار پیشے ہیں۔ پیشہ نانبائی، پیشہ باورچی گیری، وغیرہ چوتھی فصل تکلفات خوراک پر ہے اور اس کے ماتحت پانچ پیشے ہیں۔ اچار سازی، شکر سازی حلوائی وغیرہ۔ اور کوئی تین ہزار مصطلحات اس حصہ میں آئی ہیں۔ آلات وغیرہ کی تصویریں بھی کثرت سے درج ہیں کام بڑی محنت تلاش دیدہ ریزی کا ہے۔ کتاب زبان سیکھنے والون کے کام کی بھی ہے۔ اور مختلف پیشوں سے واقفیت رکھنے والوں کے کام کی بھی۔ ہر صورت سے کتاب قدردانی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ ہم لوگ جو زبان کی بری بھلی خدمت

میں اپنی عمروں کا معقول حصہ صرف کر چکے ہیں ان کی بھی آنکھیں ایسی کتابوں سے کھل جاتی ہیں۔ اپنے جہل کا انکشاف ہو جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی زبان کے ہزار ہا الفاظ سے ابھی تک ہم لوگ بے خبر ہیں۔

صدق نمبر 18 جلد 7 یکم ستمبر 1941

(174) بیان اللسان

از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

مکتبہ علمیہ، میرٹھ۔

اردو میں ایک اچھے عربی لغت کی ضرورت مدت دراز سے چلی آ رہی تھی جس طرح فارسی میں منتہی الارب موجود ہے اللہ کا شکر ہے کہ آج یہ ضرورت قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے ہاتھوں انجام تک پہنچادی گئی اور اس فارسی نمونے سے کہیں بہتر ومفید تر صورت میں۔

یہ عربی اردو ڈکشنری جو ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے انگریزی ہی ڈکشنریوں کے طرز پر ہے صرف قرآن مجید ہی سے طلبہ کے کام کی نہیں بلکہ کل عربی خوانوں کی ضرورت کی ہے۔اس کے اندر حسب تصریح مولف نہ صرف قرآن مجید کا ہر بڑا اور چھوٹا لفظ آ گیا ہے بلکہ کثرت سے وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو عربی کی تمام درسی اور متداول کتابوں میں آتے رہتے ہیں اور وہ جدید الفاظ بھی آ گئے ہیں جو عربی کی جدید تالیفات اور رسالوں میں مستعمل ہیں۔کل لغات کا شمار حسبِ تصریحِ سرورق تقریباً 25 ہزار ہے!

کتاب کی خصوصیات جنہوں نے اسے مفید سے مفید تر بنا دیا ہے مقدمہ کے کئی صفحوں میں ان کی تفصیل پڑھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں ہر لفظ کو اس کی اصل و مستعمل صورت میں 'لغت' دے کر معروف معجم کی ترتیب سے انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر جلی خط میں با عراب لکھ دیا گیا ہے اس کے بعد اس کے کثیر الاستعمال معنی اور پھر اس کے مختلف مفہوموں کی طرف اشارے۔پھر واحد و جمع، تذکیر و تانیث اور اگر مصدر ہے تو اس کے باب، صلہ ان سب کی طرف ضروری رہنمائی حیرت انگیز جامعیت اور ایجاز کے ساتھ ان صفحات میں موجود ہے۔ان کے علاوہ اور بھی گونا گوں مفید تشریحات،

شروع میں دس صفحوں میں فوائد القواعد کے زیر عنوان مصدر واسم وغیرہ پر جو لغوی اور صرفی ونحوی بحثیں ہیں وہ بجائے خود ایک بڑے مفید رسالے کے قائم مقام ہیں۔

مولف کی تلاش اور حسن ذوق سب یکسر قابل داد ہیں اور ان کے اس کمال پر سب سے زیادہ حیرت ہے کہ جس کام کے لیے کئی ہزار صفحات کی ضخامت اہل تحقیق کی شرکت کے بغیر درکار ہوتی انہوں نے تنہا اپنی ذات سے ایک ہزار صفحے کے اندر ہی انجام دے دیا ہے۔ قل ودل اسی کو کہتے ہیں تحقیق وتفصیل کے لحاظ سے قدیم عربی لغات کے نقش، قدم پر، خوش ترتیبی اور سہولتوں کے لحاظ سے جدید انگریزی ڈکشنریوں کا نمونہ۔

اس قیامت خیز گرانی کے زمانے میں اتنا گراں قدر تحفہ سات آٹھ روپے میں ایک نعمت ہے۔ کتاب کا خریدنا خود اپنی مدد کرنا ہے۔ کتب خانوں مدرسوں وغیرہ میں اس کا ہونا لوازم میں سے ہے۔

صدق نمبر 36 جلد 15 مورخہ 27/جنوری 1950

(175) مصباح اللغات

ازمولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی

ضخامت 22+1011 صفحات، ہر صفحہ سہ کالمہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت 16

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

دنیا نے اگر ایک طرف یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اردو کو ہندوستان سے مٹا کر دم لے گی تو قدرت کا فیصلہ دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو ہی نہیں، عربی کے قدم بھی اس سرزمین پر اور زیادہ جما دیے جائیں گے اور اس فیصلہ کی ایک تازہ شہادت اس مبسوط عربی لغت کا اردو میں آجانا ہے۔ ادارۂ ندوۃ المصنفین جو مفید اور ٹھوس علمی خدمات انجام دے رہا ہے اس میں ایک تازہ ترین عنوان کا اضافہ!

المنجد عربی کے جدید کتب لغت میں ایک مشہور و متداول کتاب ہے صاحب مصباح نے اس کو سلیقہ مندی کے ساتھ اردو میں اپنا لیا ہے اور جا بجا دوسرے ائمہ لغت کے افادات سے بھی مستفید ہوتے گئے ہیں۔ کتاب کی باریکیوں پر نقد و تبصرہ صرف ماہرین فن کا کام ہے۔ ایک عامی صرف اتنا سمجھ سکتا ہے کہ اصل ماخذ خود ایک مستند کتاب ہے اور اس سے کام علم و فہم کے ساتھ لیا گیا ہے، سرورق پر تصریح ہے کہ کتاب کے اندر ذخیرہ 50 ہزار سے زاید عربی الفاظ کا ہے! اردو والوں کے ہاتھ اتنا سامان آجانا ان کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ کمی جو کچھ ہوگی وہ اسلامی اصلاحات کی۔ اس لیے کہ المنجد کا مصنف عیسائی ہے۔ لیکن یہ کوتاہی بھی ظاہر ہے کہ صاحب المنجد کی ہوئی نہ کہ صاحب مصباح کی۔

بیان اللسان کے نام سے ابھی دو ہی تین سال ہوئے ایک اعلیٰ عربی لغت اردو میں آہی چکا تھا۔ اب مصباح اللغات کے جامہ میں ایک دوسرا عربی لغت بھی اردو میں آگیا جو ضخامت میں اس سے بھی بڑا ہے اس پر مصنف اور ناشر دونوں قابل

مبار کباد ہیں۔

شروع میں کئی ورق بعض قواعد صرفی کی نذر ہیں۔ جن کا جاننا لغت کے متعلم کے لیے ضروری ہے اور جن سے استفادہ بھی صرف طلبۂ فن ہی کر سکتے ہیں۔ جلد، کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم خوشنمائی دیدہ زیبی کے لحاظ سے بھی کتاب قابل اطمینان ہے اتنی ضخامت کے بعد کتابت وطباعت کی موجودہ شرح کے ساتھ قیمت اتنا ہونا ناگزیر تھا۔ امید ہے کہ کتب خانے اور اسلامی مدرسہ اور کالج وغیرہ ضرور خریداری میں اپنی ہمت وفرض شناسی کا ثبوت دیں گے۔

صدق جدید، نمبر 19، جلد 1، 6/اپریل 1951

(176) اردو عربی ڈکشنری

از مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی

16+480 صفحہ تقطیع خورد مجلد مع گرد پوش قیمت چھ روپیہ

صغیر احمد دارالعلوم ندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ۔

عربی اردو لغت تو خیر فی الجملہ موجود ہے۔ بڑی ضرورت اردو عربی لغت کی تھی۔ اور اصل میں یہ کام کسی بڑے مرکزی ادارہ مثلاً انجمن ترقی اردو یا دارالمصنفین کے کرنے کے تھے۔ ایسے اداروں ہی سے توقع اس کی ہوسکتی تھی، کہ اردو سے مختلف زبانوں کے لغت تیار کردیں۔ مثلاً

اردو انگریزی ڈکشنری
اردو عربی ڈکشنری
اردو فارسی ڈکشنری
اردو ہندی ڈکشنری

خیر یہ منزل تو بہت دور ہے۔ شکر و مسرت کا مقام ہے کہ صاحب مصباح اللغات (عربی اردو) نے اپنے ذاتی تحقیق و تفحیص سے متوسط ضخامت کی ایک اردو عربی ڈکشنری تیار کر کے اردو خوانوں کے ہاتھ میں دے دی۔ کتاب دو حصوں میں ہے گو اصل کتاب میں اس کی کوئی تصریح نہیں پہلا حصہ اسماء و حروف سے متعلق ہے جو 206 تک آیا ہے۔ ص: 207 سے آخر تک کا حصہ افعال سے متعلق ہے۔

ایک مختصر سا پیش لفظ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے پھر مؤلف کے قلم سے چند سطری دیباچہ کے بعد عربی میں چلی ہوئی بہت سی کنیتیں دے دی ہیں اصل کتاب دو کالمی ہے۔ مگر یہ حصہ سہ کالمی ہے۔ اس لیے چند صفحوں کے اندر الفاظ

بہت سے آ گئے ہیں۔۔۔کتاب کے نافع ہونے میں ذرا کلام نہیں۔ اور مصنف کی تلاش و سعی یقیناً قابل داد ہے۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر مصنف نے اصلاً پیش نظر قرآن و حدیث کے طلبہ کی ضرورتوں کو رکھا ہوتا، نہ کہ اخبار نویس اور اخبار بیں طبقہ کے مذاق کو! اس کے علاوہ جابجا شبہ ایسا ہوتا ہے کہ مصنف نے راستہ الٹا اختیار کیا ہے۔ یعنی پہلے اپنے مطالعہ میں عربی لغات جمع کر لیے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کے اردو مترادفات جمع کر کے ترتیب اردو عربی قائم کر دی ہے۔ اگر ابتدا ہی سے اردو کے کسی لغت کو سامنے رکھ کر الفاظ اس سے جمع کیے گئے ہوتے تو کتاب اس سے کہیں بڑھ کر جامع و نافع ہو جاتی۔ ''ٹیبل''، ''ٹی پارٹی''، ''ٹینڈر'' ''ٹیزی'' ''ٹیلیفون ریسور''، ''سٹنٹ'' کارسپانڈنٹ قسم کے بیسیوں انگریزی الفاظ جو بے تحاشہ اس اردو لغت میں در آئے ہیں مصنف کی اسی ذہنیت کے غماز ہیں۔

عربی کی طرح اردو میں بھی مصنف کو 'قدیم'' سے زیادہ 'جدید' کا پاس رہا ہے۔ اور اس حد تک کہ ایسے الفاظ کو بھی لے آئے ہیں جو اردو سے زیادہ ہندی کے ہیں، اور اردو میں ابھی تک شامل نہیں ہوئے ہیں جس کی مثالیں خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ ''پاٹا'' ''پاٹھک'' ''بھانا'' ''پھانڑ'' ''پونا'' ''کارن'' سب اسی قبیل سے ہیں۔

کہیں کہیں متجانس الصوت الفاظ بلا اظہار تفریق ایک ہی عنوان سے درج ہو گئے ہیں۔ مثلاً 68 وک 2 میں ''پولا''۔ حالاں کہ اس کے معنی کھوکھلے کے ہیں، اور جس کی عربی جوف درج ہوئی ہے، وہ واؤ مجہول سے بروزن گولا، سولا، تولا اور جو گھاس وغیرہ کے گٹھے کے لیے آتا ہے۔ اور جس کی عربی ضغث درج ہوئی ہے وہ واؤ معروف سے ہے بہ وزن موئی۔ تلفظ کے اس فرق کا اظہار لغت کی کتاب میں ضروری تھا۔

کہیں کہیں سہو نظر سے اردو محاورہ کے بجائے لفظ کی صرف اصل سامنے رہ گئی ہے۔ مثلاً تلاش (تفحص) کے بعد ہی جو لغت 'تلاشی کے معنی' تلاش کرنے

والے کے نہیں، بلکہ تلاش ہی کی ایک خاص صورت کے ہیں۔ تفتیش جرم کے سلسلہ میں۔

یہ سارے معروضات کتاب کے آئندہ ایڈیشن کو بہتر اور نافع بنانے کی غرض سے ہیں۔ ورنہ کتاب بحیثیت مجموعی موجودہ صورت میں بھی بہت غنیمت بلکہ جدید عربی طلبہ کے حق میں تو ایک نعمت ہے۔ اور کوئی دوسری کتاب تو شاید اس درجہ کی بھی اردو میں موجود نہیں۔

صدق جدید، نمبر 35، جلد 4، 30 جولائی 1954

(177) مہذب اللغات

از جناب مہذب لکھنوی

جلد5- 500 صفحے مجلد بڑی تقطیع قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

جلد6- 500 صفحے مجلد بڑی تقطیع قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

محافظ اردو بک ڈپو، نیا محل منصور نگر، لکھنؤ۔

زبان ٹھہری نہیں رہتی برابر حرکت میں رہتی ہے۔ کچھ پرانے لفظ چھوٹتے چلے جاتے ہیں اور کثرت سے نئے لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے ہر بہتر سے بہتر لغت بھی کچھ مدت کے بعد ناکافی ہو جاتا ہے۔ نور اللغات بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں مولف بیچارے نے اپنی والی ساری کوششیں صرف کر ڈالی لیکن اسے کیا کیجئے کہ اسے شایع ہوئے 55 سال کی مدت گزر چکی اور اس عرصے میں زبان کہاں سے کہاں پہنچ گئی! بہر حال اب سالہا سال سے لکھنؤ کے ایک صاحب زبان و قلم اس دھن میں لگے ہوئے ہیں کہ ایک مختصر عملہ کے ساتھ تن تنہا اس مہم کو سر کریں اور سولہ ضخیم جلدوں میں اس کام کو انجام تک پہنچائیں۔ اور اس وقت تک چھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں ہر جلد سہ کالمی صفحہ کے تقریباً بارہ سو صفحوں کی ضخامت پر نکلی ہے، اور یہ چھٹی جلد حرف (س) پر ختم ہوتی ہے۔

الفاظ و محاورات تو ہر لغت کی طرح اس میں ہوتے ہی۔ ان کی تفصیل و جزئی تفصیل کے ساتھ ان کی تذکیر و تانیث بھی درج ہے اور محل صرف بھی اور اس کی تصریح بھی کہ یہ لفظ یا محاورہ رائج ہونے کے ساتھ فصیح بھی ہے یا نہیں۔ اور ان سب کے علاوہ یہ اندراج بھی کہ لفظ یا محاورہ اب قلیل الاستعمال ہے یا متروک ہو گیا ہے۔

لغت اور وہ بھی ایسا مفصل (مبسوط اور سولہ ضخیم جلدوں میں ختم ہونے والا۔ ہرگز ایک شخص یا اس کے دو ایک ماتحتوں کے بس کا نہیں، یہ کام پوری ایک جماعت

کے کرنے کا ہے------ جو زبان کے ذخیرۂ ادب کو پوری طرح پڑھ کر پہلے الفاظ و محاورات کو جمع کرے اور پھران کے مختلف پہلوؤں اور محل صرف کا استقصال کرے (جیسا کہ انگریزی زبان کے ضخیم و مستند آکسفورڈ انگلش ڈکشنری والوں نے کیا ہے) ہمارے اردو والوں کو یہ انتظام، یہ سامان اور اتنا فراغ خاطر کہاں نصیب (پاکستان کا ترقی اردو بورڈ البتہ ایک پوری جماعت کے ساتھ یہ کام انجام دے رہا ہے) مہذب صاحب نے دو ایک ساتھیوں کو لے کر جو کام کر ڈالا ہے وہ ایک فرد واحد کی بساط سے بہت زائد ہے۔ اور ہر طرح قابلِ قدر ہے۔ غنیمت ہے کہ سابق وزیر اعلیٰ یوپی اور سابق گورنر راجستھان ڈاکٹر سمپورنانند اور پھر بعد کو خود صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ان کے کام کے قدر شناس مل گئے تھے اور انھوں نے مالی امداد بھی ان کی کر دی تھی۔ بغیر اس طرح کی خارجی امداد کے کام چلتے رہنے کی کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی۔

صدق جدید نمبر 42 جلد 20 مورخہ 20/ستمبر 1970

(178) مہذب اللغات

از مہذب صاحب لکھنوی

جلد 7، 500 صفحے مجلد قیمت 22 روپے، دفتر مہذب اللغات، منصور نگر لکھنؤ۔

اردو کے ضخیم اور مشہور لغت کی یہ ساتویں جلد ہے جو حروف س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع پر مشتمل ہے اور سابق جلدوں کی خصوصیات کو قائم رکھنے والی ہے۔

اردو کے دوسرے مشہور لغات کی طرح اس میں بھی بڑا حصہ حشو کا ہے۔ صفحوں کے صفحے ایسی بحثوں کی نذر ہیں جن کا تعلق عقائد سے یا تاریخ کے تذکرہ سے جتنا بھی ہو بہر حال لغت و تحقیق لغوی و لفظی سے مطلق نہیں۔ مثلاً لفظ عام الحزن کے تحت میں کالم کے کالم ابو طالب کے ایمان و عدم ایمان کی بحث کے لیے وقف کر دینا اور مثلاً لفظ صنعت کے تحت 70، 72 کاموں میں اردو کی ساری لفظی صنعتیں نقل کر دینا۔

دوسرا عیب بھی اردو لغات کے ساتھ مشترک یہ ہے کہ شروع میں معنی کل دے دیے ہیں جو اس لفظ کے اپنی اصل زبان میں ہیں۔ حالانکہ اردو میں وہ لفظ بہت محدود معنی لے کر آیا ہے مثلاً ایک لفظ شہوت ہے جو اپنے اندر بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس میں خواہش، آرزو، شوق، بھوک، اشتہا، شوقِ نفس بہ طرف حصول لذت و منفعت میں سب شامل ہیں اور مصنف نے ان سب کو نقل کر دیا اردو میں یہ نقل بالکل بلا ضرورت بلکہ تمام تر غلط ہے۔ اردو میں وہ صرف ایک مخصوص خواہشِ نفس کے لیے رائج ہے اور اشتہا وغیرہ کے معنی میں ہرگز مستعمل نہیں۔

ان کمزوریوں کے باوجود یہ اردو لغت بڑی محنت سے لکھی گی ہے اور مہذب صاحب نے اپنے دو ایک معاونوں کے ساتھ بلکہ کہنا چاہیے کہ تنہا وہ کام کر ڈالا جو ادیبوں لغویوں کی ایک پوری جماعت کے کرنے کا تھا۔ کتاب ہر طرح ہمت افزائی کی مستحق ہے۔

صدق جدید نمبر 31 جلد 21 مورخہ 2/جولائی 1971

صنف ادب (مضامین)

(179) مقالاتِ شبلی - جلد 4

از مولانا شبلی مرحوم
دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

مولانا شبلی مرحوم کے جاننے والے اس 20-21 برس کی مدت میں (مولانا کا سالِ وفات 1914 ہے) خدا جانے کتنے اٹھ گئے پھر بھی علمی حلقوں میں اب تک مولانا کا نام کسی تعارف کا غالباً محتاج نہیں۔ تصنیف تو الگ رہی مولانا کے قلم کے ایک ایک مضمون کا اشتیاق و انتظار سیکڑوں ہزاروں کو رہا کرتا تھا۔ سعادت مند شاگردوں نے استاد کے متفرق مضامین کو مختلف پرچوں سے جمع کر کے کتابی صورت میں کئی سال سے شائع کرنا شروع کیے ہیں۔ اس سلسلے کی یہ ایک چوتھی قسط ہے۔ قبل کی جلدیں مذہبی تاریخی اور ادبی عنوانات کی نکل چکی ہیں یہ جلد تنقیدی مضامین پر شامل ہے۔

مولانا شبلی عالم، ادیب، مورخ، متکلم، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ نقاد بھی تھے اور ان کی تنقیدیں علمی تاریخی تصانیف پر خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جانے کی مستحق تھیں۔ اور ہر ایک کو ان کی رائے اور تنقید کا انتظار رہا کرتا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ سترہ عنوانات پر مشتمل ہے یعنی 17 کتابوں پر مولانا کے ریویو ہیں بعض مختصر اور بعض مفصل۔ ان سترہ میں سے زیادہ تر کتابیں مذہبی ہیں مثلاً تفسیر کبیر رازی، الملل و النحل، طبقات ابن سعد، معرکہ مذہب و سائنس وغیرہا۔ کچھ تاریخی ہیں مثلاً تزک جہانگیری، مآثر رحیمی وغیرہ اور باقی دوسرے علوم وفنون پر۔ زبان کے لحاظ سے زیادہ تر کتابیں عربی میں ہیں پھر فارسی اور پھر اردو میں۔

مولانا کے دورِ تنقید نگاری میں یورپ کا علمی تفوق تمام دماغوں پر چھایا ہوا تھا اور تمام دلوں کو مرعوب کئے ہوئے تھا۔ اس مغربیت سے مولانا بھی مستثنیٰ نہیں۔ ہر چند صفحات کے بعد زبان یورپ کے احسانات کے شکر میں زمزمہ سرا نظر آئے گی۔ لیکن تنقید نگاری کی دوسری خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا کے قلم کے شیدائی یقیناً اس تحفہ کو ذوق و شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور لینا چاہئے بھی، لیکن رفقائے دارالمصنفین اس گزارش کو معاف کریں کہ ان کی تھوڑی سی محنت اور توجہ اس مجموعہ کو اس سے کہیں بہتر حالت میں پیش کر سکتی تھی۔ مجموعہ میں اصل شے ترتیب ہوتی ہے۔ مجموعہ تو ایسا ہونا چاہئے کہ حسن ترتیب اس کی جان ہو، مگر یہ مجموعہ افسوس ہے بہترین ترتیب سے محروم ہے۔ بہترین ترتیب نوعیت مضامین کے لحاظ سے ہو سکتی تھی یعنی مذہبی تاریخی وغیرہ۔ یہ نہ سہی تو یہ مقالات کم از کم تاریخ وار ہی درج ہوتے۔ افسوس ہے کہ اتنی توجہ بھی نہ کی گئی۔ بعض کے آخر میں صرف سنہ ہجری درج ہے بعض کے سنہ ہجری اور عیسوی دونوں میں تقدیم و تاخیر شروع سے آخر تک برابر مسلسل ہے۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ بھی ضروریات میں سے تھا اس میں یہ بتایا جاتا کہ یہ مجموعہ تنقیدات مصنف کی زندگی کے فلاں دور کا ہے، مصنف کی تنقید نگاری کی فلاں فلاں خصوصیات تھیں وقس علی ہذا۔

ہفتہ وار صدق نمبر 10 جلد نمبر 1 مورخہ 10 راگست 1935

(180) مجموعہ مضامین (مقالات شبلی)۔حصہ 5

معارف پریس اعظم گڑھ۔

مولانا شبلی مرحوم کے مضمون و مقالات ان کے فرزندان معنوی کے جس سعی سے برابر معقول شکل میں مرتب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔چار جلدیں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں مذہبی،،ادبی،تعلیمی اور تنقیدی پر اب یہ پانچویں جلد مولانا کے تاریخی مضامین پر شامل ہے ان میں بھی سب نہیں صرف نو منتخب عنوانات سے جو تاریخی شخصیتوں سے متعلق ہیں۔باقی مضامیں مسائل تاریخ سے متعلق دوسرے حصے میں ہوں گے۔پیش نظر جلد کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

1	حضرت اسماء والدہ حضرت عبداللہ بن زبیر 2 صفحوں میں	
2	المعتزلہ والاعتزال	14 صفحوں میں
3	ابن رشد مشہور فلسفی	44 صفحوں میں
4	علامہ ابن تیمیہؒ	17 صفحوں میں
5	متنبی (مشہور عرب شاعر)	16 صفحوں میں
6	موبدان مجوس	8 صفحوں میں
7	زیب النساء بنت شہنشاہ اورنگ زیب	12 صفحوں میں
8	غلام علی آزاد بلگرامی	18 صفحوں میں
9	فرید وجدی بک	3. صفحوں میں

تعداد صفحات کی اس تصریح سے معلوم ہوگا کہ بعض مضامین بہت ہی مختصر ہیں اور بعض بہت طویل،باقی اوسط ضخامت کے ہیں۔عنوان اس جلد کا تریخی ہے لیکن مضامین صرف تاریخ تک محدود نہیں ہیں بلکہ عقائد کا پہلو بھی جا بجا اچھا خاصا آ گیا ہے اور عقائد میں مصنف کا مسلک کھلا ہوا اعتزال اور آزاد خیالی کی تائید میں ہے

صفحہ 26 پر ابن رشد کا یہ قول بنا کسی قسم کی نکیر کے درج ہے۔ ''خدا کی قسم قوم عاد کا وجود ہی ثابت نہیں، ملوخان کا کیا ذکر ہے۔'' یہ قول اگر صحیح نقل ہوا ہے تو حیرت ہے کہ اس کے بعد ابن رشد کا ایمان قرآن پر کیسے ثابت رہے گا۔

ص 33 پر بھی ایک عجیب عبارت نظر پڑی۔ ''(یعقوب نے) عدالتوں میں فقہ کی پابندی بھی اٹھا دی چنانچہ جو فیصلہ کیا جاتا تھا قرآن حدیث، اجماع اور قیاس سے کیا جاتا تھا۔'' یہ دودنوں فقرے ایک ہی جملہ میں صحیح کیونکر ہو سکتے ہیں۔ فقہ ان چاروں کے علاوہ اور کیا ہے؟ فیصلے اگر قرآن حدیث اجماع و قیاس کے مطابق کئے جاتے تھے تو وہ بھی صحیح نہیں۔ ہدایت المجتہد مدت ہوئی چھپ گئی اور ہر شخص خود دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس میں ''ہر مسئلہ کے دلائل اور وجوہ'' کے درج ہیں یا ائمہ فقہ کے مذہب۔ عقائد کی ان کمزوریوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو مولانا شبلی کی قدرت تحریر میں کلام کس کو ہو سکتا ہے۔ اردو کے مبتدیوں کے لئے تو ان کی تحریریں بہترین شمع ہدایت ہیں۔

ہفتہ وار صدق نمبر 15، 16 جلد نمبر 2 مورخہ 21 ستمبر و یکم اکتوبر 1936

(181) مقالات شبلی - حصہ 6

از مولانا شبلی نعمانی

دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

مولانا شبلی کے مجموعہ مضامین ومقالات کے طبع واشاعت کا جو سلسلہ کئی سال سے قائم ہے یہ اس کی نئی جلد ہے۔ تاریخ پر مضامین کیونکہ کثرت سے تھے اس لئے ایک جلد میں نہ آسکے۔ مولانا کے جن تاریخی مضامین کی اپنے زمانے میں بہت شہرت رہی تھی اور اور بعض ان میں سے مبسوط فاضلانہ مقالات ہیں وہ اسی جلد کے حصے میں پڑے ہیں۔ مثلاً تراجم جو 112 صفحات میں آئے ہیں، اور کتب خانہ اسکندریہ اور ان دو کے علاوہ پانچ مضمون اور بھی ہیں۔

(1) اسلامی کتب خانے (2) اسلامی حکومتیں اور شفاخانے (3) ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر (4) مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہندو بھائیوں کی ناسپاسی (5) میکینکس اور مسلمان۔

مضامین سب اپنی اپنی جگہ پر دلچسپ ہیں خشک نویسی تو مولانا کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مضامین میں باہم کوئی ترتیب قائم نہیں حالانکہ تاریخی ترتیب آسانی سے قائم کی جاسکتی تھی۔ جس مضمون کو سب سے آخری جگہ ملی ہے وہ مولانا کے ابتدائی دور کا ہے۔

جیسا کہ کئی بار مولانا کی تصانیف کے تعارف وتبصرہ کے ضمن میں ان صفحات میں عرض کیا جاچکا ہے جوش بیان میں مولانا کے ہاں عقائد میں ذرا سستی آجاتی ہے اس کی مثالیں اس مجموعہ میں بھی جابجا موجود ہیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بانی اسلام کا لفظ (ص 233 آخری سطر) یا مثلاً اس قسم کے خیالات:۔

"قرن اول کے مسلمانوں نے جب موقع اور ضرورت ہوئی تو معاشرے

اور تمدن کے متعلق بے تکلف غیر قوموں کے اصول اور آئین اختیار کئے''۔ (ص 3)

''اوروں کا تو کیا ذکر ہے خود شارع علیہ السلام نے غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند کیں اور اختیار کیں'' (ص 2)

یہ چیزیں بجائے خود غلط نہیں لیکن جس طرح بلا قید اور علی الاطلاق لکھ دی گئی ہیں غلط فہمیوں کا سبب بہ آسانی بن سکتی ہیں۔ ہلکے نوٹ ایسے موقع پر دے دیئے جائیں تو بآسانی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہ درخواست ہے جو سلسلہ مقالات کی تقریباً ہر جلد پر ریویو کے وقت بزرگان دار المصنفین سے کرنی پڑتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس کے قبول کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ ادبیات اردو اور اسلامیات سے ذوق رکھنے والے کا کتب خانہ اس سے خالی نہ رہے۔

صدق نمبر 11 جلد 2 مورخہ 12 / اگست 1937

(182) مضامینِ رشید

از جناب رشید احمد صدیقی

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

مسلم یونیورسٹی کے استاد اردو رشید احمد صدیقی صاحب کا تعارف اردو کے حلقے میں کرانا۔

سورج کو ہے چراغ دکھانا

سنجیدہ ظرافت اور شریفانہ شوخ نگاری میں اردو کے موجودہ اہلِ قلم میں وہ اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ یہ ان کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ متعدد مضامین مثلاً ''مرشد''، ''ارہر کا کھیت''، ''گھاگھ''، ''حاجی صاحب''، ''سہیل'' وغیرہ اس کے قبل بھی اپنی پہلی اشاعت کے وقت خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔ ہر صفحہ میں اتنی دلکشی ہے کہ کوئی مضمون شروع کر کے بغیر ختم کیے طبیعت مانتی ہی نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کتاب عام مذاق کی نہیں۔ پورا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اردو اور انگریزی ادب کی تلمیحات سے اچھی طرح واقف ہوں اور خود مصنف کے بھی خاص خاص ملنے والوں سے واقفیت رکھتے ہوں۔ ''مرشد''، ''حاجی صاحب''، ''سہیل'' وغیرہم جن کے تذکرے کثرت سے آئے ہیں ان کے متعلق فقروں کا لطف آ ہی نہیں سکتا جب تک ان حضرات کا ہیولیٰ مع ان کی خصوصیات کے پیشِ نظر نہ ہو۔ مصنف کا مذاق جہاں بلند واقع ہوا ہے اور مستی، ابتذال و رکاکت سے نفرت ہے وہاں تخیل کی کمی بھی ہے۔ واقعیت کی افراط اور واقعات کی کثرت پلاٹ کے گڑھنے کا موقع ہی نہیں دیتی جی میں تھا کہ ناظرین کے تفنن کے لئے کچھ اقتباسات دے دیئے جاتے لیکن اقتباسات جب تک بہت طویل نہ دیئے جائیں ناواقفوں کو صحیح اندازہ ہو نہ سکے گا اور طویل اقتباسوں کے لیے گنجائش کہاں سے لائی جائے؟ مختصراً صرف اتنی گذارش ہے

کہ ادبی لطافتوں کے دلدادہ دو روپیہ خرچ کر کے انشاءاللہ کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ ہاں ایک بات کہنے سے رہ گئی رشید صاحب باوجود اپنی خوش مذاقی کے لکھنؤ کی صنعتِ خاص مراعات النظیر (مناسبت لفظی) سے کچھ بیگانہ روش سے نظر آتے ہیں لیکن قدرت ان سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے اور فطرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کیا جائے کہ یہ صنعت لطیف بھی جا بجا رشید صاحب کے قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑی ہے۔ مثلاً مولانا سہیل کی پان خوری یا پان بازی کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

''جس طرح بعض لوگ شکر کی خاطر چائے پیتے ہیں اسی طرح مولانا چونے کی خاطر پان کھاتے ہیں۔ فن عمارت کی اصطلاح یا استعارہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پان پر کتھے کی صرف کوچی پھری ہوئی ہے اور چونے کا 'پلاسٹر'، یہ 'پان' کے 'چونے' کے ضلع میں عمارت کی 'کوچی' اور 'پلاسٹر' کیا خوب؟ پان پر پن ہو تو ایسا تو ہو'' ص 33۔ یا پھر ایک کثیرالاولاد باپ کے ہاں تازہ ولادت کے بارے میں مولوی مسعود علی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''خدا کرے مولود مسعود کو سر یعقوب کی خوش نصیبی اور شہرت حاصل ہو'' مکتوب الیہ کے نام کی مناسبت سے ''مولود مسعود'' اور باپ کی کثیرالاولادی کی مناسبت سے حضرت یعقوبؑ کا نام لانا! سبحان اللہ۔

صدق نمبر 21 جلد نمبر 5 مورخہ 26 رفروری 1940

(183) **مقالات محمد علی (حصہ اول)**

مرتبہ رئیس احمد جعفری

ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد

محمد علیؒ ......زباں پہ بار خدایہ کس کا نام آیا! کے مقالات ومضامین دیکھنے کو آنکھیں مدت سے ترسی ہوئی تھیں سرور صاحب جامعی کے شائع کیے ہوئے مضامین محمد علی کے باوجود۔ شکر ہے کہ دکن کے ادارہ اشاعت اردو کواس طرف توجہ ہوئی اور اس نے اس کام کے لیے موزوں ترین ہستی کو ڈھونڈھ نکالا یعنی محمد علیؒ کے سوانح نگار سیرت محمد علی کے مشہور اور مشہور سے زیادہ بدنام مصنف مولوی رئیس احمد جعفری ندوی جامعی کو۔ اور ان کے ہاتھوں یہ کام کرا ڈالا۔ محمد علی کی اردو تحریریں کیا کچھ ایک آدھ یا دس بیس ہیں۔ کوئی جمع کرنے پر آئے۔ تو جلدوں پر جلدیں ہوتی چلی جائیں اور صفحات کا شمار سیکڑوں سے کہیں آگے بڑھ کر ہزاروں تک ہو جائے (انگریزی مضامین سے کوئی بحث نہیں) مکتبہ جامعہ نے یقیناً ایک بڑا کام کیا جو دو جلدیں ان مضامین کی شائع کر لیں اور اس کام کو مولوی رئیس احمد جعفری نے ہاتھ لگایا ہے یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اور خوشخبری یہ ہے کہ ابھی کم از کم دو جلدیں اور نکلیں گی ہمدرد کے بحر ذخار سے ان موتیوں کو سمیٹنا کوئی بہت آسان کام نہ تھا۔ غواصی کے لیے محنت اچھی خاصی تھی لیکن رئیس احمد کے لیے یقین ہے کہ محنت جبر کے بجائے شوق کی شکل میں تبدیل ہو کر رہی ہوگی اور جو کام دوسرے شاید رو رو کر کرتے وہ انہوں نے ہنستے کھیلتے کر ڈالا ہوگا۔ حصہ اول کی ابتدا بالکل صحیح طور پر اقبال کے ان اشعار سے ہوئی ہے۔

من کہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع　　بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع
من مثالِ لالۂ صحرا ہستم　　درمیانِ محفلے تنہا ہستم

فہرست مضامین کے بعد مرتب کے قلم سے 6-7 صفحہ کا دیباچہ ہے دلچسپ

اور جاذب توجہ اس میں ایک بات بڑی پتہ کی کہہ ڈالی گئی ہے یعنی محمد علی ایک ہی وقت میں تاریخ ساز (ہسٹری میکر) بھی تھے اور تاریخ نگار (ہسٹری رائٹر بھی)

وہ طوفان خیز بحر بیکراں میں شناوری کے جوہر دکھاتا تھا اور پھر اپنی طوفان بلا خیز کی لڑائی کی کہانی بھی سناتا تھا وہ کام بھی کرتا تھا اور روداد بھی لکھتا تھا وہ صحیح معنوں میں قائد تھا۔'' اور یہ بات بھی ان کے قلم سے بالکل صحیح نکلی ہے۔

''محمد علی تاریخ سازی میں اتنے محور ہے کہ تاریخ نگاری کی مہلت انہیں بہت کم ملی۔ پھر بھی انہوں نے لکھا اور بہت کافی لکھا۔ جو کچھ لکھا اس کا عطر اور خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

کتاب تین بابوں تقسیم ہے۔ پہلا باب سیاسیات عالم اسلام پر ہے۔ جس کے ماتحت آٹھ مضامین درج ہیں معاملات، حالات حجاز، گنبد خضرا پر گولہ باری، عالم اسلامی کی موتمر وغیرہ دوسرے باب کا عنوان درس گاہ حق و باطل ہے اور اس کے تحت تین مضامین ہیں لکھنؤ کا جلسہ، شاندار جلسہ اور شاندار تقریر، تقاضائے وفا، تیسرا باب یہ ہے اسلام جس کے ذیل میں تین مضمون ہے ایک ہی تقریر، فقہ اسلامی کی تربیت دین اور اسلامی نظام۔

یہ ترتیب گو پوری جامع و مانع نہیں پھر بھی بہت غنیمت ہے۔ مرتب نے مضامین کو صرف کوشش کر کے جمع ہی نہیں کیا ہے ایڈٹ کیا ہے جا بجا مکررات کو حذف کیا ہے ہر مضمون کے ابتدا میں ایک مستقل تمہید ہے جس سے مضامین کے سمجھنے میں ناواقفوں کو بھی بہت آسانی ہو جائے گی۔ تاہم اس وقت کی فضا اور شخصیتوں کو زیادہ مانوس و معروف بنانے کے لیے بہتر تھا کہ فٹ نوٹ بھی جا بجا دیدیے جاتے۔

مولانا کے مضامین کا تعارف کرانا سورج کو چراغ ہے دکھانا ان کی خوبیوں کی ضمانت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ محمد علی کے قلم سے ہیں جس میں سیاست، مذہب اور ادب تینوں جمع ہیں اور تحریری جان و زندگی تو حصہ ہے ان کے قلم کا جس کسی کو اس میں بلکہ عالم اسلامی کے ماضی قریب کی تاریخ سے دلچسپی ہے اس کے لیے ایسی کتابوں

کا مطالعہ ناگزیر ہے اوران مقالات کو مرتب وشائع کر کے ایک صحیح خدمت انجام دی گئی ہے۔ مرتب صاحب ماشاء اللہ اچھے خاصے لکھنے والے ہیں اوران کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ عموماً صحیح ہے لفظی اور معنوی دونوں حیثیت سے۔ کہیں کہیں فیاضی کے جوش میں شاعری بھی کر گئے ہیں۔ چنانچہ ہمدرد کے سب ایڈیٹروں میں سے ایک کو جو ہمدرد سے اس کی زندگی میں ہی الگ ہو گئے تھے وقت کے بہترین انشاپرداز کا خطاب بخش دیا ہے۔ دیباچہ میں بھی دوایک لفظ کھٹکے۔

صدق نمبر 36 جلد نمبر 9۔ 24/جنوری 1944

(184) مقالات محمد علی (حصہ دوم)

مرتبہ مولوی سید رئیس احمد جعفری

ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد

حصہ اول پر تبصرہ صدق نمبر 26 جلد 9 جنوری 1944 میں نکل چکا ہے، شکر ہے کہ حصہ دوم کی بھی طبع و اشاعت کی نوبت آ گئی۔

اس جلد میں کوئی 20 مضمون ہیں چھ بابوں کے اندر تقسیم کیے ہوئے۔ تحریریں سب کی سب ہمدرد سے منقول ہیں لیکن جو مضمون محمد علیؒ نے خاص اپنے قلم سے لکھے ہیں ان کی شان ہی کچھ اور ہے۔ ان کے لفظ لفظ میں جان ہے باقی مضامین یا تو محمد علی کی کسی تقریر کا خلاصہ ہیں یا ان کے کسی انگریزی بیان کا ملخص ترجمہ بہرحال اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے ناگزیر ہے جو 1925 سے 1932 تک کی اسلامی و ہندی کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں بعض بڑی دلچسپ حقیقتیں ان صفحات پر نظر آئے گی مثلاً:-

> ''یہ حقیقت ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا ہماری قید کے بعد بھی مہاتما گاندھی جی نے دورہ کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لیے حتی کہ کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لیے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کیے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت و مجلس خلافت تھی۔'' 180ء

اسی طرح جب شروع 1929 میں زار و نزار محمد علی آرام کرنے کے لیے ہندوستان سے باہر برہما میں تھے اور مسلمان بحیثیت قوم 1928 کی نہرو رپورٹ سے

بیزاری ظاہر کر رہے تھے جواہر لال نہرو جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اعلان شائع کیا کہ افسوس اور حیرت ہے کہ کانگریس کے جلوسوں کے مخالف دستخط کر نے والوں میں ایک سابق صدر کانگریس مولانا محمد علی بھی ہیں۔ مولانا محمد علی کو اب تاب کہاں تھی اپنی علالت کے باوجود بر ماہی سے انگریزی اخبارات میں بیان شائع کیا کہ جن صاحب کو میں نے اپنی صدارت کانگریس کے زمانہ میں سکریٹری مقرر کیا تھا وہ آج مجھ سابق صدر کے طرز عمل پر حیرت کر رہے ہیں، وہ دوسرے سابق صدر مالوی جی کے طرز عمل کو بھول گئے جنہوں نے فلاں اور فلاں موقعوں پر ترک موالات کی، عدم تشدد کی ہندو مسلم اتحاد کی، اچھوت ادھار غرض کانگریس کے ایک ایک فیصلہ کی مخالفت کر دکھائی اور ایک اور سابق صدر اپنے والد ماجد موتی لال نہرو بھی نہ یاد آئے جنہوں نے داخلہ کونسل کے متعلق کلکتہ کانگریس اور گیا کانگریس کے دوہرے دوہرے فیصلوں کی مخالفت کی اور وہ دونوں سابق صدر بھی انہیں بھولے رہے جن میں سے ایک موتی لال نہرو نے مدراس کانگریس کے فیصلہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف نہرو رپورٹ مرتب کی اور دوسرے ڈاکٹر انصاری نے اس کو قبول کرلیا! اور وہ ہندو اور مسلم صدر کانگریس بھی انہیں یاد نہ پڑے جو کانگریس کے فیصلہ ترک شراب نوشی کی عملی مخالفت ہر شب کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ[172] الخ

ہر مضمون کے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر تمہیدی نوٹ ہے مگر سب سے زیادہ دلچسپ ان کی وہ مفصل تمہید ہے جو کتاب کے شروع میں ہے اور جس میں انہوں نے محمد علی کو ایک نئے فن جرح وتعدیل اور نئے اسماء الرجال کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

قیمت شاید گراں معلوم ہو لیکن کاغذ و سامان طباعت کی موجودہ گرانیوں اور دشواریوں کے مقابلہ میں کچھ بھی گراں نہیں۔

صدق نمبر 46 جلد 10 مورخہ 12 اپریل 1945

(185) مقالات شروانی نواب

حبیب الرحمٰن خاں شروانی

شروانی ٹرسٹ پریس، علی گڑھ۔

کمال فن اور شہرت لازم و ملزوم ہرگز نہیں۔ شہرت کے کچھ اسباب خارجی بھی جمع ہو جانا ضروری ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں آتے۔ نرا کمال فن اس کے لیے کافی نہیں۔ اس کلید کی ایک زندہ مثال مولانا شروانی ہیں وہ حسن پایہ کے ادیب ہیں، نکتہ سنج ہیں، ادبی ذوق اور پرکھ رکھنے والے ہیں اس پر نظر رکھیے تو چاہیے یہ تھا کہ آج شروانی کا نام اردو دنیا میں گھر گھر پھیلا ہوتا اور ان کے نام کا سکہ اردو ادب اور نقادی کے بازار میں نقدا نقد چلتا ہوا۔ یہ نہ ہوتا کہ ان کی ناموری کمٹی سمٹائی پڑھے لکھوں اور ان میں بھی نوجوانوں کے نہیں صرف متوسط عمروں کے ایک بہت ہی مختصر حلقے میں محدود ہوتی۔ غنیمت ہے کہ ان کے نوشتوں کا مجموعہ تحریری عمر کے 63 سال کی کمائی ان کے سامنے بالآخر شایع ہو گیا۔ لیکن یہ بس غنیمت ہی ہے اس سے زائد نہیں۔ اس لیے کہ یہ مجموعہ جس ہیئت کذائی سے ساتھ شایع ہوا وہ مصنف کے ادبی کمالات کو پوری طرح روشن کرنے والا تو کیا ہوتا انھیں اور دھندلا کر دینے والا ہے۔

مجموعہ میں کل 86 عنوانات ہیں جس میں 13 ایسے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ تھے۔ مضمون چھوٹے اور بڑے بعض بہت پرانے اور بعض نئے، تنقیدی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی تعزیتی اور تہنیتی ہر قسم کے عنوانات پر ہیں۔ بعض نوعمری کے جن میں ہونہاری کے باوجود قلم کی نوآموزی نمایاں ہے اور بعض ایسے جو ایک پختہ کار اور کہنہ مشق ادیب ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مجموعی نوعیت ایک کشکول کی ہو گئی ہے کاش مرتب نے ذرا محنت کر کے ایک جلد صرف ادبی مقالات و تنقید کے لیے مخصوص کر دی ہوتی۔ پھر ترتیب کسی قسم کی نہیں، گڈ مڈ خلط ملط ہر قسم کا، صفحات کی بے ترتیبی طبیعت

میں جھنجھلاہٹ پیدا کرنے کا مزید۔ کسی سجی سجی آراستہ دکان کا نقشہ ذہن میں جما کر جایئے اور وہاں نظر آئے یہ دکان نہیں صرف مال گودام ہے شیشے کے نازک گلاس اور چینی کی فینسی پلیٹیں چیڑ کے بکسوں اور پیال کے اندر دبی ہوئی تو فرمایئے آپ بے ساختہ لاحول پڑھنے لگیں گے کہ نہیں۔

غنیمت ہے کہ ہر نوشتہ کے آخر میں تاریخ مہینہ اور سنہ دے دیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں رہ بھی گیا ہے مثلاً آئینۂ سکندری کے ریویو کے آخر میں صفحہ 387 یا حیات جاوید کے تبصرہ کے آخر میں صفحہ 67 کہیں حوالے بھی غلط۔ اس سے بڑھ کر کہ سنوں کے دینے میں عموماً سن عیسوی درج ہے مگر کہیں کہیں سنہ ہجری دیا ہے۔ مجموعے کو تقریباً مکمل کہہ سکتے ہیں پھر بھی شیروانی صاحب کی تحریر امہات الامہ کے بارے میں اور حافظ محمد شروانی کی تنقید شعرالعجم کا جواب اس مجموعہ میں نہیں۔ افسوس ہے کتاب توضیحی حاشیوں سے خالی ہے۔

معائب شماری ہو چکی اب دو چار لفظ بطور کلمہ خیر کے بھی سن لیجئے۔ حبیب الرحمٰن خان شروانی (فارسی اور اردو مین حسیب اور حسرت تخلص رکھنے والے) زبان اردو کے ایک پختہ کار ادیب ہی نہیں ایک مخصوص طرز انشاء کے مالک بھی ہیں۔ متانت و اعجازِ بیان ان کے قلم کے خاص جوہر ہیں ورق کے ورق ان کی تحریروں کے الٹتے چلے جایئے کوئی ایک لفظ بھی رکیک، عامیانہ، بازاری نہ ملے گا نہ کوئی ایسا ملا جو آپ بڑوں چھوٹوں، مردوں یا عورتوں کسی کو بھی سناتے ہوئے شرمائیں اور الفاظ کا اسراف تو جانتے ہی نہیں۔ خیر کلام ماقل ودل بلاغت کا پرانا قاعدہ گویا انھیں کی تحریروں کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا تھا۔ لفظ کم سے کم معنی زیادہ ان کا دستور حیات ہے۔

مصنف کے ادبی جوہر درد وعزا کے مضامین میں اور زیادہ کھلتے ہیں ایسے مضامین اس مجموعے میں متعدد نہیں اپنے فرزند دل مند کا تعزیت نامہ علامہ شبلی نعمانی، منشی احتشام علی صاحب وغیرہ کے تعزیت نامے سب اس حقیقت سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا جس پایہ کے ادیب ہیں اسی مرتبہ کے نقاد و نکتہ سنج بھی

ہیں۔الفاروق و،حیات جاوید،آئینۂ سکندری وغیرہ پر ریویو ان کی انتقادی نظر کے شاہد و عادل ہیں اور سب سے بڑھ کر رسوائے زمانہ کتاب محشر خیال پر ان کا ریویو 1944۔

مصنف کی امتیازی شان تین حیثیتوں سے نمایاں ہیں وہ ادیب بھی ہیں نقاد بھی ہیں اور عالم دین بھی ہیں شکر ہے ان مقالات کے مطالعہ سے ان کے یہ تینوں کمالات واضح ہو جاتے ہیں۔مضامین کا تنوع اس درجہ کا ہے کہ ہر پڑھنے والا اپنی کوئی نہ کوئی چیز پا ہی لے گا۔

صدق نمبر 24 جلد 15 مورخہ 28/اکتوبر 1949

(186) مضامین سید سلیمان ندوی

مرتبہ ابو مسلم شفیع احمد صاحب

بہار شریف، ضلع پٹنہ۔

اردو کے مصنفین عصر میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام سر فہرست ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے متفرق مقالوں اور مضمونوں کا شمار بھی صد ہا تک پہنچا ہوا ہے اور کہنا چاہئے کہ پوری نصف صدی کی مدت اسی دشت کی سیاحی میں گزر چکی ہے کوئی ان بکھرے ہوئے نوشتوں کو ذرا محبت اور سلیقہ کے ساتھ مصنف مدظلہ کو نظر ثانی کے بعد شایع کرے تو جلدوں پر جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ یورپ ہوتا تو پبلشر حضرات خود ہی اس کے لیے آگے بڑھتے اور مصنف کی خدمت میں معقول معاوضہ پیش کر کے خود بھی نفع اٹھاتے مگر یہ ہندوستان ہے اور یہاں یہ باتیں ابھی خواب و خیال ہیں۔ یہاں مصنف کو اجازت تو مروت میں بہر حال دینا ہی پڑتی ہے اور پھر جو کوئی جس طرح بھی چھاپ ڈالے بس اس کو غنیمت کی طویل و عریض چادر میں لپیٹ صبر و شکر کے مرتبے طے کرنے پڑتے ہیں۔

کتاب کے نام سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حوالے ادبی، مذہبی، سیاسی، تاریخی، تنقیدی کس قسم کے ہیں۔ سرورق بھی اب اس باب میں خاموش ہے۔ صرف ''عرض مرتب'' میں پتہ چلتا ہے کہ مضمون مذہبی نوعیت کے ہیں۔ یہ پھر بھی تکلیف دہ ہے کیونکہ سید صاحب کے یہاں مذہب کے دائرہ میں کلامی، فقہی، اصلاحی، تبلیغی وغیرہ سبھی قسم کے مضمون آتے ہیں۔ یہ تصریح سرورق پر بہر حال ہونا ضروری تھی چہ جائیکہ عرض مرتب میں بھی نہیں جس میں مرتب کی 'بلند ہمتی' اور پختگی عزم کا بلند آہنگ سے دعویٰ موجود ہے -------- پھر یہ دعویٰ بھی پورے طور پر صحیح نہیں آخر کے تین مضامین کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں'' تاج محل اور لال قلعہ کے

معمار''، ''عربوں کی بحری فتوحات'' اور ''عرب اور امریکہ''۔

خود ان مضامین کے درمیان خدا معلوم ترتیب کیا ملحوظ رہی ہے اگر تاریخی ہے تو اس کا اظہار ضروری تھا، سنہ کسی ایک مضمون میں درج نہیں۔ سید صاحب اب ماشاءاللہ پختہ کار استادِ فن ہیں۔ ان کی اس وقت کی اور ابتدائی دور کی تحریروں میں ہر اعتبار سے فرق بین ہونا لازمی ہے۔ سارے مقالوں کو بلا امتیاز ایک جگہ رکھ دینا مصنف پر ظلم ہے۔ مقالوں کا شمار 21 دیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں کل مقالے دراصل 20 ہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر افسوس ناک یہ کہ ماخذ کا حوالہ کہیں نہیں۔ یہ الہلال، الندوہ، معارف سب کے حق میں ناانصافی ہے۔ متعدد عنوانات پر تمہیدی یا تعارفی نوٹ اور توضیحی حاشیئے دینا فرض تھے۔ ایڈٹ کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کوئی چھپا کاغذ اٹھا کر کاتب کے حوالے کر دیا مرتب کو دماغ بہت کچھ صرف کرنا پڑتا ہے۔

اب تکلیف دہ فروگزاشتوں کے بعد بھی کہنا پڑتا ہے کہ مجموعہ بہرحال غنیمت ہے۔ یہ بکھرے ہوئے موتی ایک ہار میں گندھ تو گئے۔

صدق نمبر 39 جلد 15 مورخہ 17 رفروری 1950

(187) پرچھائیں

از جناب آصف علی صاحب

91 صفحہ، 12x18 سائز، مجلد مع گردپوش، قیمت درج نہیں۔

انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آصف علی صاحب اس وقت ہندوستان کے اس صوبہ کے گورنر ہیں اور ہز اکسیلنسی ہیں۔ کسی زمانہ میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور ایک اونچے سیاسی لیڈر رہتے تھے۔ اس سے بھی قبل دلی کے ایک نامور بیرسٹر تھے اور کوچۂ چیلان میں کامریڈ و ہمدرد والے محمد علیؒ کے رفیق اور پڑوسی - ادب و شعر سے ذوق انھیں عمر کی ہر منزل میں رہا۔ کبھی کبھار کچھ لکھتے لکھاتے بھی رہے۔ مستقل مصنف کی حیثیت سے شاید پہلی بار اب نمودار ہوتے ہیں۔ تصنیف زمانہ گورنری کی نہیں، دور اسیری کی ہے۔ اس وقت کی جب 1942 کے ہنگامہ رستخیز میں جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ اسیر فرنگ کی حیثیت سے، قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے - قلب کے سوز و گداز کو، اور قلم کے درد و تاثر کو ایوان گورنری کے جاہ و حشم سے بھلا مناسبت ہی کیا؟ اس کے لیے موزوں فضا تو جیل کی چاردیواری اور مناسب ماحول نظر بندی کی وحشت سامانی ہی ہے۔

کتاب کچھ نثر میں ہے کچھ نظم میں، اور نظم سے مراد نظم غیر مقفی ہے۔ اور کہیں کہیں نثر شاید غیر ارادی طور پر نظم کے سانچہ میں ڈھل گئی۔ اور شعر بن گئی ہے۔ مثلاً:

''اپنی کہتی ہو، سنو اور کی بھی''

تم پہ جو بیتی وہ پرچھائیں تھی۔

اور پرچھائیں بھی کچھ دھندلی سی۔

تم کلی پھول وہاں دیکھا کیں

موت یاں زیست سے تھرّاتی تھی۔

تم مہک سونگھ کے خوش ہوتی تھیں۔ (ص:54)

یہ مصرعہ نہیں ہیں۔ کتاب کی سطریں ہیں۔ ہر سطر الگ لکھی ہوئی، گو بجائے پیراگراف کے ہر ہر سطر خود پیراگراف!۔ کتابت کی بھی شان شروع سے آخر تک قایم۔

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''رات کا سناٹا ہے۔ تارے بھی چپ ہیں''

چاندنی کروٹ لے کر سوگئی۔

جگنو پھولوں کی طرح طرح کھل کھل کر مرجھا جاتے ہیں۔

تمھارا خیال رہ رہ کر درد کی طرح کسکتا ہے۔

کس نے روک رکھا ہے جو نہیں آئے؟

امیدوں کے تیر چلاتے رہتے ہو۔ (ص:20)

25، 30 سال ادھر ''ٹیگوری اردو'' کا زور ہوا تھا۔ مدت کے بعد اس کے نمونے گو پہلے سے یقیناً کہیں بہتر، اب نظر آئے..................

نظم جہاں تک ترنم کا تعلق ہے۔ یقیناً بڑی رواں اور پر کیف۔ نثر بھی جہاں تک لفظ و عبارت کا تعلق ہے، بڑی حسین و جمیل۔ ماشاءاللہ دہلی کے۔ اردو ان کے گھر کی زبان۔ اس پر مستزاد کہ وہ زمانہ دیکھے ہوئے ہر گرم و سرد۔ نشیب و فراز کا مزہ چکھے ہوئے زبان کے ادیب اور شاعر۔ دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ماہر، کلام ان کا نہ بلند و بلیغ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ معنویت ان کے الفاظ کی بلائیں لیتی ہوئی نہ ملے گی تو اور کہاں ملے گی۔ یہ سب کچھ ہوگا، بلکہ اس سے بھی بہت کچھ زائد ہوگا۔ لیکن بعید الفہم قاری اپنے نصیب کی محرومی کا شکوہ کس سے کرے۔ کہ کتاب جب پڑھ لی تو نظر یہ آیا کہ اپنے پلے کچھ پڑا ہی نہیں اور ہاتھ محض سایہ ہی...... پرچھائیں پھر پرچھائیں! اور پرچھائیں نویس عالم باعمل! مغل شاعر کا اردو شعر۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

گویا مرقع چغتائی نثر میں!

صدق جدید، نمبر 1، جلد 1، 19/ جنوری 1951

(188) آشفتہ بیانی میری

ازرشید احمد صدیقی صاحب (ایم اے)

192 صفحہ، تقطیع 22x18، قیمت تین روپیہ، (مجلد) ڈھائی روپیہ (غیر مجلد)

سرسید بک ڈپو، شمشاد مار بلڈنگ، علی گڑھ۔

اردو کے مشہور اور قدیم مزاحیہ نگار رشید احمد صدیقی کے نام اور قلم سے اردو کے ادبی حلقوں میں کون ناواقف ہے۔ یہ ان کا تازہ ترین بڑا طویل مقالہ ہے۔ مقالہ کے لفظ پر حیرت نہ کیجیے، جو کتاب نہ فصل یا باب میں تقسیم ہو بلکہ فہرست مضامین تک اس کے لیے ایک غیر ضروری سا تکلف سمجھی گئی ہو۔ اسے کتاب کی جگہ مقالہ ہی کہنا شاید زیادہ موزوں ہو۔ نام کا ابہام بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں۔ دیر تک پڑھنے والا چکر میں رہتا ہے کہ تحریر آخر ہے کس موضوع پر اور بہت کچھ پڑھ ڈالنے کے بعد ہی یہ کھلتا ہے کہ نام اگر ''میرا علی گڑھ'' رکھ دیا گیا ہوتا تو شاید زیادہ قریب الفہم ہوتا۔

رشید صاحب کی تحریریں یوں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح علی گڑھ سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور اس کا تو موضوع بھی علی گڑھیات'' ہے۔ سرسید، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، شبلی، پرنسپل ٹول، پروفیسر انعام اللہ خاں، اقبال سہیل، حسرت موہانی، غلام حسین بسکٹ والا، سراج بیرا، ڈاکیے، کچی بارک، کرکٹ، ٹینس، یونین اور خدا معلوم اور کیا کیا اس کشکول کے اندر جگہ پائے ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے ہر بیان سے متفق و مطمئن ہو۔ رشید صاحب کا مزاج کثرت تلمیحات کے باعث زیادہ عام فہم کبھی نہیں رہا ہے۔ یہ خصوصیت اس رسالے میں کچھ اور زیادہ ہی موجود ہے۔ عربی ترکیبیں بھی اگر اتنی زیادہ نہ ہوتیں، تو کتاب زیادہ ہلکی پھلکی رہتی۔ سجاد انصاری مرحوم کی تحریروں کی جو داد دی گئی ہے (ص:66-67) اس کی توقع اب اتنی پختگی اور اس ''سن رُشد'' پر پہنچ چکنے کے بعد

رشید صاحب سے نہ تھی۔ آغا حیدر حسن اور آل عبا مار ہروی کی حیرت انگیز زبان دانی پر البتہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے (ص:68-71) وہ البتہ بالکل صحیح ہے اور مولانا سلیمان اشرف مرحوم کے درس قرآن پر ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ ان کی روح کی شرافت کا مظہر ہے۔ چند سطریں آپ بھی پڑھ لیں:

''...... اس میں شرکت کے لیے کوئی مجبور نہ تھا۔ لین طلبہ، اساتذہ اور دوسرے لوگ بڑے شوق اور پابندی سے اس میں شریک ہوتے، بعض تو اس طرح جیسے تراویح سننے کا التزام رکھتے ہیں۔ طلبہ زیادہ ہوتے تھے۔ ہر شخص کلام پاک کا اپنا نسخہ ساتھ لاتا تھا۔ بغیر کسی طرح کے جبر کے محض اپنے شوق سے کلام پاک کا درس لینے کے لیے ایسے طمانیت افزا اوقات میں جیسا کہ عصر و مغرب کے درمیان ہوتا ہے ...... شریف، ذہین، ہونہار نوجوانوں کا صاف ستھرے لباس میں کلام پاک کو طرح طرح کے کپڑوں میں لپٹے سینے سے لگائے ہر طرف سے کالج کی دلکشا مسجد کی طرف آتے دکھائی دینا کیسا پاکیزہ آنکھوں کو تازگی اور دل کو گرمی بخشنے والا منظر ہوتا۔ تفسیر کلاس میں شریک ہونے کی مجھے کبھی توفیق نہ ہوئی۔ اسی اعتراف میں مجھے بڑی غیرت محسوس ہوتی ہے لیکن کیا کروں کہ ایسا ہی ہوا۔ درس کا وہی وقت ہوتا جو ٹینس کا اور یہ تقریباً تمام عمر میری کمزوری رہی کہ میں کھیل چھوڑ نہ سکتا تھا''۔ (ص:104)

مقالہ بہ حیثیت مجموعی علی گڑھ اور ''رشیدیات'' سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

صدق جدید، نمبر 50، جلد 8، 14 نومبر 1958

(189) انتخاب مضامین شبلی

مرتبہ رشید حسن خاں صاحب

405 صفحے قیمت سات روپئے۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی۔

مکتبہ جامعہ کے سلسلۂ معیاری ادب میں نمبر 15 اور افادی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اس کا نمبر سب سے پہلے آ جانا چاہیے تھا۔ ہمارے معیاری ادب کے معماروں میں شبلی نہ صرف خاص ہیں بلکہ کہنا چاہیے خاص الخاص ہیں۔ شبلی کا رقبۂ تحریر کوئی 35 سال کا ہے اور اس مدت میں انھوں نے اخباروں اور رسالوں مین کل ملا کر خدا معلوم کتنے مضمون لکھ ڈالے ہوں گے۔ ان پچاسوں مضمونوں میں سے صرف 25 مضمونوں کا یہ مجموعہ ہے ان میں دینی تاریخی اور شعری ہر نوعیت کے مضمون آ گئے ہیں۔ پختہ عمری کے بھی اور کم سنی کے بھی------- کیا اچھا ہوتا اگر مرتب کرنے والے نے مزید محنت گوارا کر کے ہر مضمون پر سنہ تحریر بھی دے دیا ہوتا۔ طلبۂ فن کے لیے یہ کام کی چیز ہوتی۔

مضمون اپنی اپنی جگہ کم وبیش سب ہی قابلِ قدر ہیں لیکن کم سے کم یہ مضمون تو ضرور فاضلانہ بلکہ محققانہ کہے جا سکتے ہیں۔ ایک کتب خانہ اسکندریہ، دوسرا جزیہ تیسرا حقوق الزوجین اور ادبی حصوں میں لسانی شعری نکتے بھی خوب خوب آ گئے ہیں۔ بے عیب کس کی تحقیق اور کس کی تحریر ہو سکتی ہے۔ شبلی کی بشریت بس وہاں نمایاں ہو جاتی ہے جہاں انھوں نے فقہی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔

بڑی تشنگی باقی رہ جاتی ہے جب چار سو صفحے کی کتاب دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر بجائے 25 کے 40 مضمون درج ہوتے اور کتاب دو حصوں میں کر کے سات سو صفحے کی رہتی۔

''تعارف'' 16 صفحہ کا رشید حسن خاں صاحب کے متوازن قلم سے ہے۔ یہ

شخصیت خوب جانی پہچانی ہوئی ہے۔ شستہ و شایستہ، شریف و با ادب اور وہی خصوصیات اس تعارف میں بھی قائم ہیں لیکن اس بشریت کی بات یہاں بھی ص 10 کے وسط میں علامت مفعولی ''کو'' ایک بے جان چیز کے لیے قلم سے نکل گئی ہے۔

یہ ہلکی سی لغزش دوسروں کے ہاں لائق اعتنا بھی نہ تھی لیکن رشید حسن خاں صاحب محض تصحیح لکھنے والے نہیں بلکہ زبان کی نوک پلک تک کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ اس لیے انھیں اس خفیف سی چوک پر توجہ دلا دی گئی۔

صدق جدید نمبر 41 جلد 21 مورخہ 10/دسمبر 1971

صنف ادب (ناول)

(190) ''مرزا بلگرامی'' -لال کٹھور

مغرب کی عقل و ذہانت کا منتہائے کمال یہ ہے کہ ہر جھوٹ کو سچ کے لباس میں پیش کیا جائے مشرق کی نازک خیالیوں کی بلند پروازی یہ تھی کہ سچائیوں کو جھوٹ کے پردے میں بیان کیا جائے لندن کی وقائع نگاری کا ظاہر سچ ہے اور باطن فریب، دہلی کی داستان گوئی کا باطن سچ تھا اور ظاہر تصنع۔ ٹائمس اور مارننگ پوسٹ ہر نیست کو ہست کر دکھانے پر رسی کو سانپ بنا دینے میں طاق ہیں۔ الف لیلیٰ وانوار سہیلی والے حقیقتوں میں افسانے کا رنگ بھر دینے میں یکتا تھے، زدیمر اور مارگولیتھ، تاریخ اور سیرت نگاری کا نام لے لے کر ایسے واقعات لکھ ڈالتے ہیں جن کا وقوع نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا تھا۔ خواجہ حافظ اور امیر خسرو شاعری کی دنیا میں گل و بلبل کی زبان سے شراب و کباب کی اصطلاحوں میں، حکمت و موعظت، سچائیوں اور حقیقتوں کے دریا بہا جاتے ہیں، اپنا اپنا مذاق ہے، اور اپنا اپنا کمالِ فن۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے اور کیوں کرنے لگے کہ دونوں کی افسانہ گوئی میں بلند تر کمال اور پاکیزہ تر مذاق کس کا ہے!

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ ہو اور باطن سچ۔ اسم فرضی ہو، لیکن مسمیٰ واقعی۔ گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور کے آب انار! زبان ''دشنہ و خنجر'' کے تلفظ پر کھلے، لیکن دل ''ناز و غمزہ'' کے معنی میں لگا رہے۔ گلستاں کی حکایتوں کی تاریخی تحقیقات کرنے بیٹھیے اور اس کھوج میں پڑ جایئے کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ کس ملک کا تھا کس سنہ میں

تخت نشین ہوا، کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولادیں چھوڑیں تو شاید ایک حکایت بھی سچ نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھیے، نقاب کے رنگ میں الجھنے کے بجائے چہرے کے خط وخال پر نظر جمائیے تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملے گا۔ صاحب مثنوی معنویؒ نے نہ صرف اس پر عمل کر کے دکھا دیا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرمایا کہ ''سر دلبراں'' کچھ ''حدیث دیگراں'' ہی میں خوش تر و خوش گوار ہوتا ہے اور استاد غالب اپنی زبان میں فرما گئے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سنتے ہیں قدیم صوفیاء میں ایک فرقہ ملامتیہ تھا ظاہر خراب اور باطن آراستہ وضع رندانہ اور صورت مستانہ لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ آج کل کے مسخروں پر ان قدیم ملامتیوں کو قیاس نہ کیجئے یہ نیا سوانگ، طریقِ ملامت کے ساتھ تمسخر ہے ان ملامتیوں میں سے ایک ایک ''تھا ولی پوشیدہ اور کافر نکلا''۔

علی گڑھ بھی ایک چھوٹے پیمانے پر عالم صغیر ہے یعنی عالم کبیر میں جو کچھ بھی ہے سب کا نمونہ بندے کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود کم سے کم عالم اسلام کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ (میوزیم) سمجھ لیجیے۔ ہر نوع، ہر قماش، ہر نمونہ انسانیت کو اس ننھی سی دنیا کے اندر آ کر دیکھ لیجیے کیسے ممکن تھا، کہ طریق ملامتیہ کے نمائندوں سے سرزمین محروم رہتی۔ آیئے آج آپ سے بیسویں صدی کے ایک اپٹوڈیٹ علی گڑھ علامتی کا تعارف کرایا جائے، ظفر عمر کا نام آپ نے سنا ہے اسی نیچری گڑھ کا اولڈ بوائے اور نیک نام سرکار کے نیک نام ترین محکمۂ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اس کی وضع قوم کی وضع سے الگ اس کی کوٹھی مسجد کے حجروں سے دور، اس کی کچہری خانقاہ کے ہو حق اور مدرسے کے قال اقول سے کہیں پرے لیکن خود قوم وملت خانقاہ ومسجد اس کے دل سے دور نہیں دل کے باہر بھی نہیں دل کے اندر، خاکی وردی اور کارتوس کی پیٹی، سفید ہلمٹ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار سب نے دیکھی لیکن رنگ جامہ سے نگاہ ہٹا

کر انداز قد بھی کسی نے نہ پہچانا؟ نقاب الٹ کر چہرے کے رنگ و روپ کو بھی کسی نے نہ دیکھا، اگر کسی نے دیکھا بھی ہو تو زبان پر لانے کی اجازت کسے؟ اس ناتمام داستان کو یہیں تمام ہو جانے دیجئے...... مستقبل اسلام اور چوروں کا کلب، نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری سے تو یقین ہے کہ آپ بھی بے خبر نہ ہوں گے! ''نیلی چھتری'' کا وجود افسانہ ہوگا لیکن جس افسانے کا نام نیلی چھتری ہے وہ تو افسانہ نہ رہا۔ ایک مستقل حقیقت بن گیا! جس مٹی اور پتھر کے کھنڈر کا نام نیلی چھتری ہے وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو یا نہ ہو، لیکن جو نیلی چھتری، کاغذ اور قلم اور روشنائی کی مدد سے تیار ہوئی، وہ تو یقیناً اپنے ہمراہ دولت لے کر آئی اور بہرام اور مسعود اب نرے متخیلہ کے بے جان مخلوق نہ رہے بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آپ کی آنکھوں سے سامنے راجہ اندر اور تاج الملوک، لال دیو، اور سبز پری، امیر حمزہ اور عمر عیار کی طرح اچھے خاصے گوشت و پوست کے بنے ہوئے جیتے جاگتے چلتے پھرتے جانے پہچانے ہوئے جاندار انسان بن گئے!

ناول پڑھنے کی اب نہ فرصت نہ ضرورت، نہ شوق نہ ہمت۔ خود اپنے افسانہ حیات کا مطالعہ اور حسرت مطالعہ سے کہاں مہلت اور کسے دماغ کی گڑھی ہوئی کہانیوں اور جھوٹے قصہ کے سیر و تماشہ کا وقت نکالا جائے اور خود اپنی ہستی کی ٹریجڈی کیا کم ہے کہ قیس کی نامرادیوں اور فرہاد کی حسرت نصیبیوں کا رونا بیٹھ کر رویا جائے۔ اکبر علیہ رحمۃ کے الفاظ میں۔

عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ عرصہ ہوا چھوٹ چکا شرر و سرشار، جارج ایلیٹ اور میری ایڈیتھ کی گلکاریوں سے دل بہلانے کا مشغلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا۔

ما خانہ رمیدگان ظلمیم پیغام خوش از دیار ما نیست

لیکن ایک معتبر وثقہ دوست نے ہاتف غیب کی طرح آکر سرگوشی کی، کہ نیلی چھتری کے خزانے کے مالک کی ہمت اب اور بڑھی ہے اور اب اس کی اس نے

علاقہ مالوہ کے لال کٹھور کی چھپّن کروڑ کی دولت پر دھاوا بول دیا ہے! جی نہ مانا، تو یہ ٹوٹی اور جس روز نامی پریس لکھنؤ سے دو سوا دو سو صفحہ کی چھوٹی سی خوبصورت وخوشنما کتاب کا پارسل آیا اسی وقت شروع سے آخر تک پڑھ گیا! ''لال کٹھور'' آپ چونکیں گے اور منہ بنا کر فرمائیں گے کہ نام تو عجیب قسم کا نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے، بجا ارشاد ہوا لیکن یہ تو فرمایئے کہ آج سے چند سال قبل نیلی چھتری کا نام کچھ نامانوس اور کچھ کم عجیب وغریب تھا، اور پھر عمر و عیار کی زنبیل اور دیوار قہقہہ اور چشمہ آبِ حیوان اور گل بکاؤلی کو آپ کیوں بھولے جاتے ہیں، کیا ان ناموں سے دنیا روزِ ازل سے مانوس چلی آرہی ہے؟

نیلی چھتری اگر آپ پڑھ چکے ہیں اور بہرام مسعود کے کارناموں سے واقف ہو چکے ہیں تو اس جدید داستان کو آسانی سے سمجھ لیں گے، بہرام اب معلوم و معروف مجرم نہیں بلکہ علی گڑھ کے مشہور ''کھلنڈرے'' مسعود کے ہمراہ اب مہراب جنگ کے نام سے دہلی میں ایک باعزت شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گیا ہے یہ راز نہیں کھلتا کہ اس کی سکونت کے لئے مصنف نے بجائے دہلی کے مشہور محلہ کوچہ چیلان کے ایک دوسرے مشہور محلہ بلی ماران کا انتخاب کیوں کیا۔ اب وہ خلق خدا کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا ایک مخلص خادم اور اب اس کی حیرت انگیز ذہانت (یا بہ زبان اخبارات سنسنی خیز ذہانت) جرم کرنے کے بجائے مجرموں کو سزا دینے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے وقف ہے اس کی مختصر ٹکڑی کا نام خدائی فوجداروں کی جماعت پڑ گیا ہے اور اس کی بے جگری جاں بازی و سرفروشی سے بڑے بڑے پرانے اور بیباک مجرم تھرّانے اور پناہ مانگنے لگے ہیں۔ محارب جنگ کے خاص ملنے والوں میں قابلِ ذکر نام ڈاکٹر رحمٰن اور انسپکٹر وقار حسین کے ہیں۔ لال کٹھور اگر نامانوس نام تھا تو یہ نام تو یقیناً آپ کے لئے نامانوس نہ ہونے چاہئیں۔ ان خدائی فوجداروں کے ٹھیک مقابل اسی شہر دہلی میں چھٹے ہوئے بدمعاشوں اور انتہا درجہ کے چالاک اور بے درد مجرموں کا بھی ایک نہایت مضبوط جتھا قائم ہے جس کے سرغنہ و سردار دہلی کے ایک

مشہور گیسو دراز اشتہاری صوفی (ص 114، 149، 225) مرزا بلگرامی ہیں جن کی قلمی تصویر کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ
چشم بد دور کہ خوش شعبدہ باز آمدۂ

خدائی فوجدار جو خلق اللہ کی حفاظت کرتے رہتے اور ایسے بدمعاشوں کو جنہیں پولیس بھی ان کے کیفر کردار کو نہیں پہنچا سکتی خود ہی معقول سزا بھی دے دیتے ہیں۔ (ص 117) ان کا مقابلہ انہیں بزرگوار سے آ پڑتا ہے اور ساری کتاب نور و ظلمت، جرم و تعزیر جرم کی کشمکش کی نظر ہے۔ کتاب کے مرقع میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ سبق آموز تصویر مرزا بلگرامی کی ہے ان کی تفصیلی زیارت اور ان کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت کا اگر شوق ہو تو ڈیڑھ روپئے میں کتاب نامی پریس لکھنؤ سے حاصل کیجئے لیکن مرزا کی اجمالی شکل و صورت اور اس قابل زیارت چہرہ کے نمایاں خط و خال اگر آپ اس ریویو کے آئینہ میں ہی دیکھ لینا چاہتے ہیں تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ مرزا بلگرامی صاحب کوئی خدانخواستہ معمولی اور ادنیٰ قسم کے مجرم نہیں جن سے ملتے ہوئے آپ شرمائیں۔ کیا عجب کہ ان سے نیاز حاصل ہو جانا آپ اپنے لیے باعث شرف و عزت خیال فرمائیں۔ یہ ذات شریف مریدوں کی ایک بڑی جماعت کے پیر و مرشد ہیں۔ اپنے بعض مریدوں اور معتقدوں کی جاں نثاری پر بجا طور پر فخر رکھتے ہیں۔ ایک زنانہ اسکول کھول رکھا ہے۔ بہت سے رسالوں کے مالک ہیں، پریس ہے، کتابوں کا کاروبار ہے، دفتر عین شہر دہلی کے وسط میں ہے لیکن یہ حضرت رہتے[1] دہلی کے قریب ہی کسی ایسے مقام پر ہیں جہاں ایک مشہور درگاہ واقع ہے (ص 61) دفتر اور دفتر کی عالیشان عمارت دہلی میں مشہور ہے (ص 21) یہ بزرگ اپنے کارناموں سے حسن بن صباح کی یاد اس بیسویں صدی میں تازہ رکھے ہوئے ہیں (ص 20، 21 نیز 62، 63)۔

[1] باوجود قانون اور حکومت کی سخت گیری کے پایۂ تخت دہلی میں بیٹھے ہوئے۔

اپنی دغابازی اور عیاری کے زور سے خلقت کو مسحور کیے ہوئے ہیں (ص 21)۔

مرزا بلگرامی کے سر پر کا کلین (ص 32) اور زینت و آرائش کے وقت ان لمبی کاکلوں میں خوب تیل لگا ہوا (ص 179) قوالی اور نعتیہ غزلیں سنتے رہتے ہیں (ص 24) خاص چیز ان کے روز نامچے ہیں جو ان کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں اور جن میں ان کے قلم سے بلگرامی بانو کی تعریف و توصیف برابر نکلتی رہتی ہے (ص 160) قومی اور مذہبی معاملات میں خاصی دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تبلیغ کے سوانگ میں سرگرم ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مہراب جنگ ایک مشہور قومی لیڈر کی طرح مشتعل ہو کر مرزا بلگرامی کو مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اے اشتہاری صوفی اور تبلیغ کے جھوٹے سردار (ص 114) اور مسعود کی زبان میں اس صوفی اشتہاری اور دغاباز پیر (ص 114) کا جامع اور مختصر تعارف یہ ہے کہ:

مرزا بلگرامی ایک تاریخی خانقاہ کا مجاور، تبلیغ و اشاعت مذہب کے کاموں میں پیش پیش، کئی ایک اخباروں کا ایڈیٹر، اور مدرسوں کا مہتمم ہونے کے علاوہ پیری و مریدی کے سلسلے میں بھی مشہور (ص 175)۔

ان بزرگوار کو اپنے اثر اور اپنے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت پر ناز بھی ہے ایک جگہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں۔ ''میرا کاروبار سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے، میرے مرید ہر جگہ بکثرت ہیں اور میری کتابیں اور رسالے تمام ملک میں شائع ہو جاتے ہیں۔ میری اخباری نکتہ چینی سے بڑے بڑے والیانِ ملک کانپتے ہیں اور ان کے درباروں میں کھلبلی پڑ جاتی ہے۔ جہاں جاتا ہوں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں'' (ص 179) اور ساتھ ہی یہ کھلا ہوا راز بھی زبان پر آ جاتا ہے کہ:

''دنیا کے لیے میں زاہد خشک ہوں لیکن آپ یقین کریں کہ باوجود ان سب باتوں کے میرا دل اچھی صورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اچھی آواز کان میں آ جاتی ہے تو میں مسرور ہوتا ہوں۔ خدا نے آپ کو حسین بنا دیا ہے اور علم موسیقی میں آپ اس قدر مہارت رکھتی ہیں''۔ (ص 176 اور 180)

فرمایئے مرزا بلگرامی کی دلچسپ شخصیت سے آپ کو اب بھی دلچسپی پیدا ہوئی یا نہیں؟ لیکن ذرا ٹھہریے بعض دلچسپ تر خصوصیات ابھی ظاہر ہونا باقی ہیں، آپ لاکھ ذہین سہی، لیکن یہاں تک کہ آپ کا ذہن بھی نہ پہنچا ہوگا۔

اور کیسے پہنچتا، نہ آپ محکمۂ پولیس کے کوئی افسر، نہ کوئی پیشہ ور سراغ رساں، کہ یہ جو اطراف ملک میں بیسیوں بلوے، کشت وخون اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ

''انہی حضرت کی بدولت ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے روپیہ ان کے ذاتی خزانے میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ دہلی کے کئی قتل جن کا آج تک پتہ نہ چلا ان میں مرزا کے گرگوں کی شرکت تھی، کتنے ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کا دیوالہ نکل گیا، وہ بھی مرزا کی بدولت'' (29)

یہ ذات شریف جب آخری بار مسعود کی گرفت میں آتے ہیں اور اپنے کیفر کردار تک پہنچنے کے قریب ہوتے ہیں، اس وقت وہ علی گڑھ کا مشہور ''کھلنڈرا'' انہیں مخاطب کر کے ان کی فردِ جرم یوں سناتا ہے:۔

''لال کٹھور پر قبضہ کرنے اور دولت مند بننے کا جنون تم پر سوار تھا، تم موجودہ زمانے کے حسن بن صباح ہونا چاہتے تھے، ہندو مسلمانوں کو تم نے آپس میں لڑایا۔ پیری مریدی کے گورکھ دھندے سے ہزارہا آدمیوں کو گمراہ کیا، مدتوں پولیس کی آنکھ میں خاک جھونکی، قتل پر قتل کیے اور خلقت کو لوٹا'' (ص230)

آپ کہتے ہوں گے کہ ایسا چھٹا ہوا مجرم تو پولیس کی نظر میں چڑھا ہوا ہوگا اور ملک کے امن ونظم کے دعوے دار ذمہ دار حکام سرکار تو اسے ملک کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہوں گے لیکن توبہ کیجئے آپ کا دماغ بھلا مرزا بلگرامی کی ذہانت کو کہاں پا سکتا ہے؟

''اس خیال سے کہ حکام وقت کو اس کی مجرمانہ حرکات کی جانب شبہ نہ ہو، وہ وقتاً فوقتاً اپنے اثر و ذہانت کو ان کی خدمت میں پوشیدہ طور پر صرف کرتا تھا''

پولیس والے کیا پتہ لگاتے طلسم ٹوٹنے پر، ایک انسپکٹر صاحب خود دنگ رہ جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتا، کہ

''مرزا بلگرامی جو عوام میں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور حکام دہلی جس کے اثر سے اکثر کام لیتے ہیں ایسا خطرناک مجرم ہے۔'' ص 88)

ایک مرتبہ جب انسپکٹر صاحب ایک اہم تلاشی کے لئے ناوقت مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو مرزا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

''آپ ہیں انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے جو ایسے وقت تکلیف فرمائی؟ کیا ڈپٹی کمشنر یا کپتان صاحب نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لئے آپ کو بھیجا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں گورنمنٹ کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہوں۔'' (ص 162، 164)

یہ جاسوسی کوئی مالی منفعت کی چیز نہیں اس کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ ایک شریک کار اور راز دار تخلیہ میں دریافت کرتے ہیں کہ آخر جاسوسی تو کہیں نہیں گئی اس کا کیا حال ہے؟ (ص 28) تو جواب ملتا ہے کہ اس کی قدر بھی اسی وقت تک تھی جب تک میری اخباری ہلچل کامیاب تھی پھر اس میں ملتا ہی کیا ہے، وہ تو محض دوسری سرگرمیوں کی پردہ پوشی اور رفع شر کے خیال سے مفید تھی (ص 15)۔

ان مرزا بلگرامی سے بھی کہیں بڑھ کر پراسرار ان کے ''سانپ'' ہیں جو ہر مخالف کو ڈس کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ دہلی کا بینک بابو ایک تھا اس بیچارے کی شامت آئی تو اسے یہ پتہ لگ گیا کہ بینک میں مرزا صاحب نے تبلیغ کے نام جو روپیہ جمع کرایا ہے، اسے اپنی ذات پر صرف فرما رہے ہیں اور اس نے دھمکی دی کہ جلسہ تبلیغ میں یہ راز فاش کر دیا جائے گا بس پھر کیا تھا اس بابو غریب کا خاتمہ ہو گیا۔ (ص 89)۔ ایک اور اجل گرفتہ احمد جان صاحب تھے جو مرزا کے شریک کار رہ

کر پنجاب اور سندھ سے مدرسہ صوفیہ کے لئے بہت سا چندہ جمع کر لائے تھے۔ روپیہ کی تقسیم پر جھگڑا ہوا ان کے پاس مرزا کے کچھ خطوط تھے جن کے شائع کرنے کی انھوں نے دھمکی دی، شام کے وقت پارک گئے، گھر واپس نہ آئے تھے کہ راستے میں سانپ نے ڈس لیا، اور جب پولیس آئی تو خطوط جیب سے غائب ہو چکے تھے (ایضاً)۔

سب سے زیادہ پر لطف مرزا صاحب کا اپنے ان کارناموں سے تجاہل ہے پولیس کے ایک افسر صاحب مرزا صاحب کو آگاہ کرتے ہیں کہ آپ کے سانپ کا راز، اب راز نہیں رہا ہے، تو معصومیت اور بھولے پن سے کس دلفریب ادا سے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

''سانپ کیسا؟ کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟ صاف بتائیے، معموں میں بات نہ کیجئے''۔ (ص166)

''سانپ کیسا، کیا میں کوئی سپیرا ہوں''؟ کیا خوب ارشاد ہوا ہے جتنی بار جی چاہے دہرا دہرا کر اس فقرہ کا مزہ لیتے رہیے۔

آپ کہیں گے کہ مرزا بلگرامی کو آخر تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کی ضرورت ہی کیا پیش آئی، مزے سے اپنے تبلیغ کے کاموں میں لگے رہتے اور گھر بیٹھے معقول آمدنی کماتے رہتے۔ لیکن ان کی بدقسمتی کو کیا کیجئے کہ دہلی میں ایک مولوی صورت اور نیچری سیرت ایڈیٹر نے اس ہوائی قلعے کی بنیادیں تک اپنی گولہ باری سے مسمار کر دی تھیں، ایک راز دار خلوت میں پوچھتے ہیں، کہ یہ تو فرمایئے، اب تبلیغ و اشاعت مذہب کے گورکھ دھندوں کا کیا حال ہے؟ جواب میں ٹھیک کوسنے والوں کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے:

''فی الحال اس کی بھی کساد بازاری ہے خدا سمجھے اخبار انیس کے مولوی نما کرشان صفت ایڈیٹر کو۔ اس نے ایسا بھانڈہ پھوڑا ہے کہ اب وہ چشمہ بھی خشک ہوتا جاتا ہے اس کے علاوہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے خون کے اب ایسے پیاسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں

نہ مقدمہ بازی'' (ص28)۔

اتنی جلوہ آرائیوں کے بعد کیا اب بھی آپ کو یہ گلہ باقی رہے گا کہ ریویو نگار نے مرزا بلگرامی کے چہرے سے نقاب کے گوشہ الٹنے میں بخل سے کام لیا ہے؟

مصنف نے غایت ستم ظریفی یا فرط انکسار سے کام لے کر اپنا رستم داستان مہراب جنگ ہی کو ٹھہرایا ہے اور اس کے بعد پھر مسعود کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ عام تماشائی یقیناً اس نظر بندی میں گرفتار ہو جائیں گے لیکن بزم آخر تماشائیوں ہی سے تو بھری ہوئی نہیں۔ ع

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ان اہل نظر کی نظر تو بس مرزا بلگرامی کے چہرے پر پڑے گی اور وہ ساری کتاب کو اسی ایک متن کا حاشیہ قرار دیں گے ایک پرانے افسانہ نویس نے بھی آج سے سیکڑوں سال قبل اپنی داستان کا نام داستانِ امیر حمزہ رکھ دیا تھا لیکن پڑھنے والوں کے دل سے کوئی پوچھے کہ وہ امیر حمزہ کی داستان ہے یا عمرو عیار کی؟ اس کتاب میں بھی مرکزی شخصیت اور سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت مرزا بلگرامی ہی کی ہے دوسرے تمام اس میں محض اس طرح آ گئے ہیں جیسے بکاؤلی کے قصے میں لکھا، بیسوا اور زین الملوک یا داستان امیر حمزہ میں بختک اور لندھور البتہ دل کو تذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی خوشنما دلچسپ کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے اور اسے لٹریچر کی کس صنف میں رکھا جائے۔ تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ ہی سہی مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی۔ پھر وہی سوال ہوگا کہ افسانہ جھوٹا ہے یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے، ماشاءاللہ آپ کے بھی آنکھیں ہیں، اور آپ کے پاس بھی عقل و دماغ ہے، سوال کا جواب آپ ہی آپ کیوں نہیں حاصل کرتے۔

رسالہ الناظر لکھنؤ 1930

(191) بیوہ
از منشی پریم چند
مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

منشی پریم چند جو ابھی کل تک اپنے ہنستے ہوئے شگفتہ چہرہ اور بشاش صورت کے ساتھ این جہانی تھے اور آج آنجہانی ہو چکے ہیں اردو افسانہ نویسوں میں ایک مخصوص وممتاز مقام رکھتے ہیں۔ طبقہ اوسط اور غریب گھرانوں کی زندگی کی مصوری ان کا اصلی کارنامہ ہے اور ہندو زندگی کی نقاشی تو ان سے بہتر اب تک اردو میں کسی نے کی ہی نہیں۔ عموماً وہ معاشرت کی اندرونی کمزوریوں اور خرابیوں کو دکھاتے رہے اور سوسائٹی کے ظلم وستم اور جاہلانہ وہم پرستیوں اور رسم پرستیوں کی دکھتی ہوئی رگ تو انہوں نے خوب ہی پکڑی۔ بیوہ ان کے افسانوی کارناموں میں تاریخی اعتبار سے کہنا چاہئے کہ بالکل آخری نمبر پر ہے لیکن خود ان کی رائے میں اپنے مرتبے کے لحاظ سے شاید سب سے اول، کم سے کم اس قسم کا خیال اس تبصرہ نگار کے سامنے ایک بار تو انہوں نے ظاہر ہی کیا تھا۔

بیوہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک ہندو بیوہ کی سرگزشت ہے، درد اور دکھ سے بھری ہوئی، خانگی زندگی کی پیچیدگیاں، رشک ورقابت، مرد کی بے وفائیاں، عورت کی چالاکیاں، فطرت کے الجھاوے، اصلاح کی راہ میں رکاوٹیں، نفس کے دھوکے اور بالآخر بدی پر نیکی کی، رزالت پر شرافت کی فتح۔ یہ سارے مرحلے لطف وخوبی کے ساتھ ادا کئے ہوئے ملیں گے۔ پلاٹ اتنا دلچسپ کہ شروع کر کے چھوڑنے کا جی نہ چاہے اور یہ منشی پریم چند کی خصوصیات میں داخل ہے۔ زبان بھی حسبِ معمول صاف سلیس اور عام فہم ہے۔ قصے کے حصے جابجا دردناک اور رقت انگیز۔ کتابت کی غلطیوں کے باوجود کتاب ظاہری حیثیت سے دیدہ زیب وخوشنما۔

صدق نمبر 19 جلد نمبر 5 مورخہ یکم فروری 1940

(192) میٹھی کنین یا افسانہ "جمیل"

از عبدالرؤف عباسی

گرچستان یا آرمینیا کے نہیں اسی شہر لکھنؤ کے رہنے اور بسنے والے نواب جمیل الشان بہادر ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھی کل تک زندہ سلامت موجود تھے اور عجب کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو زیارت بھی نصیب ہوئی ہو ایک ضعیف سے آدمی، شاہی خاندان کی یادگار، چہرہ پر جھریاں اور خضابی بال، عمر کچھ اوپر ساٹھ سال، جسمانی قویٰ میں ضعف و انحطاط لیکن طبیعت وہی رنگین اور مزاج بدستور شوقین، تمنائیں اور آرزوئیں جوان، دل کے گوشہ گوشہ میں نوجوانوں سے ارمان، آخر دور آخر کے نواب ہی تھے۔ معقول وثیقہ اور گراں قدر پنشن تھی کس دن کے لئے۔ رئیسوں کی آن بان، نوابوں، شہزادوں کی شان، اور پھر گل ہوتے ہوئے چراغ کی لو تیز کرنے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دینے کے لئے مصاحب ایک نہیں دو دو حاضر و مستعد۔ ایک مرزا مسیتا دوسرے میاں علی حسین۔ ایک روز باتوں باتوں میں ایک بازاری حسن کا وہ سبز باغ دکھایا اور شوق و اشتیاق کا وہ لام باندھا کہ بھولا شہزادہ اعادہ شباب کے کسی غدودی آپریشن کے بغیر اپنے کو عام تصور میں جوان رعنا سمجھ بیٹھا اور دل کسی کوہ قاف کی پری پر نہیں شہر ہی کی ایک لکھا بیسوا پر آ گیا۔ یہ بی صاحبہ، تھیٹر میں کام اور تماش بینوں میں نام پیدا کئے ہوئے اتفاق سے اس وقت ایک خان بہادر کی پابند تھیں۔ خان بہادر سن و سال میں تو تھے شہزادہ صاحب کے لگ بھگ لیکن مضبوط اور ٹانٹھے، ساٹھے پاٹھے۔ بڑے حکام رس اور بااثر، غضب کے زیرک اور صاحب ہنر۔ رہنے والے لکھنؤ کے نہیں خاک پاک بدایوں کے، وہی بدایوں جس کا کلمہ استاد مصحفی بھی پڑھ گئے تھے۔

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں

اسی ڈیرہ دار کے عشق سراپا فسق میں ڈیرے لکھنؤ میں ڈالے ہوئے چوک کے قریب چھاؤنی چھائے ہوئے۔

اب شروع ہوئی بازار کی مٹھائی پر چھین جھپٹ یا شاعروں کی زبان میں رقابت۔ اِدھر سے بلا کے جوڑ۔ اُدھر سے قیامت کے توڑ۔ اِدھر کے جلیلے اگر وہ اپنے وقت کے ''جالینوس'' تو اُدھر کے شاطر بھی اپنی حکمت وفطرت کے لحاظ سے پورے ''فیلسوف'' کبھی ان کو مات، کبھی ان کو شکستِ فاش، ایک کو اپنے خاندانی جاہ وحشم کا غرّہ، دوسرے کو صاحب لوگوں کی خدمت میں ڈالی پیش کرنے اور شکار کھلاتے رہنے کا آسرا۔ اِدھر خان بہادر نے پولیس کے کپتان کو گانٹھا، اُدھر شہزادے نے ڈپٹی کمشنر کو جا کر شیشہ میں اتار لیا۔ آج عتاب نازل ہوا پولیس کے داروغہ پر اور بیچارے کا درجہ ٹوٹ کر رہا، کل نزلہ گرا کوتوال شہر پر اور غریب کو لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا پڑا۔

شہزادہ سے نپٹ لینے کے لیے خان بہادر بالکل کافی تھے لیکن ہوا یہ کہ شہزادے کو کمک پہنچ گئی اپنے رفیق قدیم نواب بنیاد حسین خاں آنریری مجسٹریٹ اور رئیسِ اعظم کانپور کی یہ ٹھہرے سوجھ بوجھ میں خان بہادر سے بھی بڑھے چڑھے، اور حکام رسی اور خوش تدبیری میں ان سے کہیں آگے اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والے اب نقشہ جنگ یہ کہ ایک طرف لکھنؤ کا شہزادہ اور کانپور کے رئیس اور مجسٹریٹ اور دوسری طرف بدایوں کے خان بہادر اور کانپور کے کوتوال۔ محاذ جنگ بھی اب کھینچتے کھینچتے لکھنؤ سے کانپور اور کلکتہ اور بدایوں تک وسیع ہو گیا اور واقعات کے اسٹیج پر پہلے تو وہی جانے بوجھے وہی دو ہی چار شخص تھے اب نئی نئی صورتیں نمودار ہوئیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ۔ نواب خورشید مرزا اور قمر مرزا اور خورشید دلہن اور فرحت مرزا اور مسعود شاہد اور سب سے بڑھ کر میر زین العباد چشمہ فروش۔ ان بزرگوار سے ایک بار بھی تعارف ہو جائے تو عمر بھر ساتھ چھوڑنے کو جی نہ چاہے ایک روز شہزادہ صاحب معہ اپنی اور خان بہادر کی مشترک محبوبہ کے غائب ہو جاتے ہیں، پھر یکا یک کانپور میں ان کا نزول اجلال ہوتا ہے بجائے اس بیسوا کے ایک خوش جمال وشوخ دیدہ کشمیری لڑکے جان

کے ساتھ چند روز کے بعد حسن جان بھی ''لاپتہ'' یا مفقود الخبر!

''میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے مجھے اس زندگی سے کبھی دلچسپی نہ تھی، ہمیشہ کراہت رہی۔ کئی دفعہ اس مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ روپیہ دولت کی چاٹ بری چاٹ ہے اور عادت پڑ جانے کے بعد بدکاری میں لذت ملتی ہے مگر تا کے دس پانچ برس کے بعد کیا سے کیا ہو جانا پڑے گا۔ باسی ہار کو لوگ پیروں سے ملتے ہیں عشاق کہو یا چاہنے والے، سب جوانی کے ساتھی ہیں وہ ڈھلی، اور ان کی نظریں پھریں چھیڑ چھیڑ کر لڑائی کرتے ہیں، وضعدار ہوئے تو کچھ دنوں نباہا رفتہ رفتہ آنا جانا کم کیا، پھر بیٹھ رہے۔''

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ان خیالات کی جو اس بیسوا کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں جسے آپ ابھی اس عالم میں چھوڑ آئے تھے کہ

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

جی ہاں، یہ خیالات اور ایک بیسوا کے! بیسوائیں بھی آخر اسی مٹی کی بنی ہوتی ہیں، جس سے خمیر بڑی بڑی عصمت کی پتلیوں کا ہوتا ہے اور بندی اسی قادرِ مطلق کی ہوتی ہیں جو شریف بہو بیٹیاں پیدا کرتا رہتا ہے اس کی رحمت کی جب ہوا چلتی ہے تو وہ محلہ کے سڑے ہوئے گھورے پر مہکتے ہوئے گلاب اور لہلہاتے ہوئے چنبیلی اور جوہی کے پھول کھلا دیتی ہے اور اس کی صنعت جب بہار پر آتی ہے تو کھرے اور کھردرے پتھروں کو ہیرے اور جواہر بنا دیتی ہے، ناپاکی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، دنیا میں حقیر و ذلیل، آخرت میں راندہ و درماندہ جوانی کی بہار کے دن کی؟ دولت کا خواب کے گھڑی کا؟ جوان جہاں عورت اپنے انجام کو سوچتی جاتی ہے اور دل ہی دل میں روتی ہے۔

''بی صاحبہ سنوں سے اتریں اور چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی، دولت کے پر لگ گئے۔ یہ گئی اور وہ گئی مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ دن کے جلیس اور رات کے مونس ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے حیادار ہوئیں تو چل بسیں! نہیں تو برقعہ پہن کر بھیک مانگنے کی ٹھہری۔ آئے دن کے واقعات ہیں، پچاسوں مثالیں اس قسم کی اس شہر میں کیا ہر شہر میں موجود ہیں۔ کسی کی ناک گئی اور کسی کی جان گئی۔ اہتمام یہ ہے کہ اولاد نہ ہونے پائے، بوڑھاپا آجائے گا چھوٹے بچے کو دیکھ کر ماں کو جو دلی خوشی ہوتی ہے وہ اس کے مقدر میں نہیں، جوان مریں تو کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں، نہ فاتحہ نہ درود کرنے والا۔''

پاک زندگی کی لطافتیں گھر گرہست شریفانہ زندگی کی مسرتیں، میاں اور اولاد کی محبتیں، ان بیچاریوں کو کب نصیب، یہ بد نصیب کیا جانیں کہ گھر کی ملکہ ہونے کے معنی کیا ہیں اور شوہر کی کمائی کی موٹی جھوٹی میں بھی اللہ نے کیا لطف اور کیسے مزے رکھ دیئے ہیں۔ عصمت جو غریب سے غریب عورت کا سب سے بڑھ کر بیش بہا خزانہ ہے، اور حوا کی بیٹیوں کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کی ناقدری کی سزا اللہ کی طرف سے اس دنیا میں یہ مل کر رہتی ہے کہ عورت محبت سے محروم کر دی جاتی ہے اب نہ اس کے دل میں کسی کی محبت رہ جاتی ہے نہ کسی کے دل میں اس کی۔ اور یہ نہ ہو تو دنیا میں آخر نور و ظلمت، خوشبو و بدبو، پاکیزگی اور گندگی ایک ہی ہو کر نہ رہ جائیں!

زمانہ کچھ اور کھسکتا ہے واقعات پلٹوں پر پلٹے کھاتے ہیں کمو جان کو آخر کار بڑی لمبی جدوجہد کے بعد خان بہادر کی قید سے رہائی نصیب ہوتی ہے شہزادہ صاحب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ شریف بیسوا اپنی نام کی ماں کے نام خط لکھنے بیٹھتی ہے خط میں کیا لکھتی ہے اپنی اور اپنی ساری برادری کا نامۂ اعمال کی نقل

کاغذ کے اوراق پر کر دیتی ہے۔

''امی جان'' کمو کی بندگی قبول کیجئے مجھ نصیب جلی کو آپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور اپنے کاٹ پیچ سے باز نہیں آتیں کہ آپ سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ ناپاک زندگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی نہ معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ جب معلوم نہیں کس نے مجھے آپ کے سپرد کیا اور آپ نے مجھے پالا پوسا۔ میں مانتی ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت کافی روپیہ صرف کیا لیکن جتنا صرف کیا اس سے چوگنا آپ نے تھیٹر ہی سے وصول کر لیا۔ آج اسی شہر میں بیگم بنی بیٹھی ہوتی، اور چین سے براجتی، وہ بنا بنایا کھیل تمہیں نے بگاڑا اور لکھنؤ لے کر چلی آئیں۔ تم نے چاروں طرف سے خوب دولت گھسیٹی، لاکھوں کی آدمی ہو پر اللہ نے چاہا تو مرتے وقت بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہوگا کیا کروں، منہ سے کوسنا ہی نکلتا ہے خیر تم پر اور تمہارے گھر پر میں نے لعنت بھیجی اور موقع پاتے ہی بھاگ نکلی۔''

الفاظ سوز دل کی روشنائی سے لکھے ہوئے اس قلم سے نکل رہے ہیں جس کی برادری کو بڑے بڑے جبہ و عمامہ والے حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہیں اور معززین و شرفاء کبھی شرارت سے کبھی شقاوت سے گندگی کے اندھیرے غاروں کی گہرائیوں میں ڈھکیلے چلے جاتے ہیں۔ اللہ جزائے خیر دے بہت بہت جزائے خیر دے ''صاحب حق'' (روزنامہ حق لکھنؤ کے ایڈیٹر) عبدالرؤف عباسی صاحب کو انھوں نے نفرت وحقارت کے بجائے انسانیت و ہمدردی کے ساتھ اس طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی اور شستہ زبان اور میٹھی بول چال میں اس داستان دلستان کے پردہ کے حقائق کو 280 صفحات کی ضخامت میں مرتب کر کے اس میٹھی کونین کو 8 آنہ میں وقف عام کر دیا یہ کام کرنے کا تھا علما و صالحین کا لیکن اللہ جس سے جو خدمت چاہے لے لے اور جسے جس منصب پر چاہے سرفراز کرے۔

خط ابھی ختم کیا معنے، آدھا بھی نہیں ہوا چند سطریں اور سن لیجئے:

''ہے ہے وہ پاک پروردگار میری نہیں سنتا تو میں کیا کرتی، بدایوں شہر، خان بہادر صاحب کا سارئیس، حاکم ان کے اثر میں، پولیس ان کے کہنے میں لاکھوں کروڑوں کے مالک جو چاہیں کر ڈالیں کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں، میری بات سنو، چلتے چلاتے میں تمہارے ساتھ دوستی کئے جاتی ہوں، ننھی جان اب میں تمہیں ننھی جان ہی کہوں گی پچاس کے لگ بھگ ہوگئی ہو، کبھی اس کا بھی خیال آیا ہے کہ اب موت کے دن قریب ہیں خدا کو ظاہر میں بہت مانتی ہو۔ نذر نیاز بھی کرتی رہتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کا وہم آتا ہے کہ کتنے گھر تم نے کھائے ہیں اور کتنے خاندان تم نے تباہ کئے ہیں ان سب کا وبال تمہاری جان پر پڑے گا یا نہیں، یاد رہے کہ تمہارے اعمال قبر میں کالے ناگ بن کر ڈسیں گے اور یہ حرام کاری کے پیسے کی نذر و نیاز ایک کام نہ آئے گی توبہ کرو توبہ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔''

کسی بڑے شہر کے جنکشن اسٹیشن کے باہر خصوصاً تیسرے درجے کے مسافر خانوں کے دروازے پر، جب چاہے یہ تماشائے عبرت اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ سامنے فقیرنیوں، بھیک منگنیوں کا ایک غول کا غول چیتھڑے لگائے ہوئے، میلی کچیلی، گھناؤنی، بیمار اور لاغر ان میں کتنی ایسی ہیں جو ابھی کل تک جوان تھیں، بنی ٹھنی ہوئی، اپنے حسن و جوانی پر نازاں اور اللہ کی اس امانت کو بازار میں دوکان لگا کر بیچ ڈالنے والیاں۔ بی بی آسیہ کا نام کس نے نہیں سنا ہے؟ بیوی کس کی تھیں، اللہ کے دشمن فرعون مصر کی، اللہ کے دشمنوں کے درمیان پلی بڑھیں، فرعون ہی کے محل میں رہیں بسیں، اس کے باوجود جب اللہ کی طرف جھکیں، سجدہ میں گریں تو مرتبہ کیا پایا؟ قرآن تک میں ذکر آیا فرشتوں کو رشک آیا۔ اللہ اللہ تائب کے مرتبہ اور سرفرازیوں کا کیا

پوچھنا! اور پھر یہ بھکی ہوئی ہماری بہنیں اور بھٹکی ہوئی بیٹیاں تو منکر نہیں مومن ہیں، باغی نہیں صرف غافل ہیں۔ آج یہ اپنے خوش نصیب شوہروں کے گھر آباد کیے ہوتیں تو خود بھی کیسی ہنسی خوشی چین اور سکھ کی زندگیاں گزارتیں اور ان کی گودوں میں پل پل کر سرورِ سردار کے لشکر میں کتنے وفادار اور جاں باز سپاہیوں کا اضافہ ہوتا! محمد مصطفےٰ کو برحق ماننے والیاں، اس نبی کی امت کہلانے والیاں، اس کی شفاعت سے آس لگانے والیاں، کیا خدانخواستہ ان کے کلیجے پتھر کے ہیں؟ جنت کی کھڑکی اپنے سامنے دیکھیں گی اور ادھر سے آنکھ بند کر لیں گی، منہ پھیر لیں گی، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بچانے والا ہاتھ ان تک پہنچے گا اور اپنی ٹھوکروں سے ٹھکرا دیں گی؟ گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھیں گی اور آگ بجھانے کے انجن والوں کو اپنے پاس سے دھکے دے دے کر نکال دیں گی۔

طول طویل خط کا ایک آخری ٹکڑا سن کر مکتوب اور کتاب دونوں کو بند کر دیجیے:

"گھر گرہست اور پاک زندگی کے مزے تم کیا جانو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ امیروں کی تو بڑی بات ہے بیسیوں مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں ہر وقت منہ دیکھتی رہتی ہیں غریبوں کو لو میاں کے دل پر اگر بیوی بیٹھ گئی اور کیوں نہ بیٹھے گی، بیوی جوان اور وہ بھی جوان زندگی کی خوشی ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر رہے گی، درد دکھ، خوشی و راحت، رنج و غم میں دونوں شریک۔ ایک دوسرے کی ہر حالت میں اور ہر جگہ ہمدرد آدمی آج خود مفلس اور قلانچ ہوا تو کیا، اولاد کو خونِ جگر کھا کے حوصلے سے پالتا اور پرورش کرتا ہے۔ اس امید پر کہ وہ جوان ہوگی تو اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ یہ ریت کی عمارت نہیں ہوتی سینکڑوں مثالیں اس کی میری اور تمہاری آنکھوں کی دیکھی ہوئی موجود ہیں۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ کسی مردی نکاحی یا تم

سے بڑی ڈیرہ دار طوائف کے پہلو میں ایسی امید ہوتی ہے قصہ طویل ہے اگر خدا نے کچھ بھی عقل دی ہے تو اس خط سے سبق لو۔''

سبق قصہ کی اس نائیکہ نے لیا یا نہیں۔ اسے چھوڑ یئے، سبق لینے کے قابل ہے پڑھنے والوں کے اور پڑھنے والیوں کے بوڑھوں کے اور نوجوانوں کے، تماش بینوں کے اور تماشا گروں کے، پھنسنے والوں کے اور پھانسنے والیوں کے، نوابوں کے رئیسوں کے، امیروں کے، کوٹھے والیوں کے، فلم ایکٹرسوں کے، ریڈیو اسٹاروں کے، غرض ہمارے آپ کے سب کے صحت کو، عزت کو، دولت کو، برباد کرنے والے اور برباد کرنے والیاں کاش آنکھیں کھولیں اور سوچیں کہ اب تک کس طرح زنگی کا نام کافور رکھے ہوئے ہیں۔

کوتوال شہر اپنی سراغ رسی میں کہاں تک کامیاب رہے؟ حسن جان کا کچھ پتہ لگا؟ میر زین العباد پر کیا گزری، نواب بنیاد حسین خاں کی خوش تدبیریوں اور ہوشمندیوں نے کیا کیا گل کھلائے؟ خورشید مرزا نے سارے کھیل میں کیا حصہ لیا؟ خورشید دلہن کی اصلیت کیا نکلی؟ شہزادہ صاحب کی خبر ان کی بیگم صاحبہ نے کس بری طرح لی؟ میر صاحب چشمہ فروش کی افیون نوازی کیا رنگ لائی؟ اسی طرح کے سارے سوالات کا حل کتاب میں تلاش کیجئے اور اس کا اطمینان رکھئے کہ جو لوگ مغز کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر قصہ کو محض لطف زبان اور حسنِ بیان کے لئے پڑھنا چاہتے ہیں وہ بھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ یہاں تو صرف مصنف سے یہ کہنا ہے کہ اگر انہوں سے اس خدا داد نعمت کی پوری قدر نہ کی اور جس طرح اس کتاب میں لطیف و جمیل پیرائے میں اور دلکش انداز سے نیکی کی فتح بدی پر اور پارسائی کی بے عصمتی پر دکھائی ہے آئندہ اگر اسی رنگ میں دین کی فتح بے دینی پر نہ دکھائی، تو عجب نہیں کہ کل خود ان سے سوال ہو جائے۔

صدق نمبر 29 جلد 6 مورخہ 22/ اپریل 1940

(193) گئودان

از منشی پریم چند

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔

پریم چند کی کسی کتاب کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ افسانہ نویسی میں وہ ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔ دیہات کے سادہ تمدن اور غم والم کی مصوری ان کے قلم کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ شریفانہ جذبات کی برتری، باطل پر حق کی فتح، مظلوموں کی حمایت، صحیح وطن دوستی، غریبوں کی خدمت، نیکی کی عزت، فطرت بشری کی نبض شناسی، ان کے قلم کے یہ سارے جوہر ان کے آخری حصۂ عمر کی اس کتاب میں اور زیادہ چمک اٹھے ہیں۔ اردو میں ہندی الفاظ کی کثرت تو ان کے ہاں شروع سے رہا کی ہے۔ لیکن اس کتاب میں عربی کے بھی خاصے الفاظ ملیں گے۔ مثلاً یہ فقرہ ''ڈاکٹر مہتاب مُمتحن سے ممتحن ہو گئے۔'' ص 523۔

ہفتہ وار صدق 3/جون 1940 پرچہ نمبر 5 جلد نمبر 6

(194) میدانِ عمل

از منشی پریم چند

مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

پریم چند افسانہ نویسی کی ایک خاص صنف کے گویا بے شریک وسہیم مالک تھے اپنے خاص رنگ کے موجد بھی وہی تھے اور کہنا چاہیئے کہ خاتم بھی وہی۔ زبان سلیس وسادہ سبک خیالات پاکیزہ اور اصلاحی، پلاٹ دلچسپ اتنا کہ ایک بار شروع کر کے چھوڑنے کو جی ہی نہ چاہے۔ منظر عموماً دیہات کی سادہ پر خلوص زندگی کا دکھاتے ہیں لیکن شہر کی پر تکلف اور پر تصنع زندگی کے نقشے بھی جا بجا لازمی طور پر موجود ملتے ہیں اور نفس بشری کے تجزیہ اور جذبات انسانی کی تشریح کے وقت تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نویس نہیں حکیم اور ماہرِ نفسیات ہیں۔ پھر میدانِ عمل تو ان کے قلم کا میدان ہی ہے۔ آخر عمر میں پختہ مشقی کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ میدانِ عمل ان کی عمر کی آخری کوششوں میں سے ہے (اس کے بعد اب ان کی کوئی اور کتاب ریویو کے لیے کیوں موصول ہونے لگی) اور ان کی تمام قلمی خصوصیات کی حامل۔ قصہ بعض مقامات پر دردناک اس قدر کہ پڑھنے والے کے آنسو بے اختیار نکل نکل آئیں۔ مکتبہ جامعہ نے اچھا کیا کہ ان کی آخری کوششوں کو بھی سمیٹ لیا اور بیوہ اور گئودان کی طرح میدان عمل کی بھی اشاعت کا سہرا اپنے ہی سر بندھایا۔

صدق نمبر 7 جلد نمبر 6 مورخہ 17/جون 1940

(195) ضمیر

از محمد عبدالرحمٰن خاں

سابق صدر کلیہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد (دکن)

کتاب درحقیقت ایک ناول ہے جدید طرز زندگی کے اجتماعی و اخلاقی پہلوؤں سے متعلق اور چونکہ اظہار و بیان شروع سے آخر تک مکالمہ کے ذریعہ سے ہوا ہے اس لئے اسے ڈرامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈرامہ کے افراد مشرق کے مقیم لندن زن و مرد ہیں اور گفتگو کی جائے وقوع انگلستان اور ترکی کے مختلف مقامات ہیں۔ ڈرامہ کا موضوع تمام تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ حسن و عشق کی چاشنی بہت ہلکی بلکہ برائے نام ہے۔ نوعیت مباحثہ کے اندازہ کے لئے ذیل کا اقتباس کافی ہوگا۔ یہ تقریر ایک ہندوستانی طالب علم اپنے ترک دوستوں سے کررہا ہے۔

''محض یہ سمجھ کر کہ ہم یورپ میں ہیں ہماری سیاسی، معاشرتی زندگی بھی بعینہٖ یورپ کے دیگر اقوام کے مماثل ہونا چاہیے۔ اگر ترکی قوم اپنے آپ کو ہر خصلت میں یورپ کا تابع اور ہر خیال میں یورپ کا مطیع بنانا چاہتی ہے تو سخت غلطی کرتی ہے۔ جس طرح محض لباس سے قومیت تبدیل نہیں ہوسکتی اسی طرح دوسری قوموں سے سیاسی و معاشرتی طریقے محض ان کی مشابہت کے لئے اختیار کرنے سے ایک قوم دوسری قوم کا عروج و اقبال حاصل نہیں کرسکتی۔'' ص 64۔

کتاب کے مصنف دکن کے ایک ممتاز ماہر سائنس ہیں ان کے سے تعلیم یافتہ اصحاب کا یہ اصلاحی رنگ اختیار کرلینا ملت کے حق میں فال نیک ہے۔ مصنف کے تبلیغی جوش و انہماک کا ایک ثبوت یہی کیا کم ہے کہ کتاب کا انگریزی ایڈیشن بھی انہوں نے شائع کر رکھا ہے جو حضرات انگریزی سے زیادہ مانوس ہوں وہ انگریزی ایڈیشن طلب فرما سکتے ہیں۔

ہفتہ وار صدق مورخہ 8/جولائی 1940 پرچہ نمبر 9 جلد نمبر 6

(196) ہوائی

از سلطان حیدر جوش

نظامی پریس بک ایجنسی، بدایوں۔

گرد پوش پر ایک برہنہ زنانی تصویر۔ جوش صاحب کا شمار اب پرانے لکھنے والوں میں ہے۔ ناول اور شاید تاریخی ناول بھی وہ بارہا لکھ چکے ہیں اور مشہور اپنی شوخ نگاری کے لیے رہے ہیں جواب ادھر اپنی حدود سے تجاوز کر کے عریانی تک پہنچ گئی ہے۔ مزاح ہے بھی ایسی لطیف و نازک چیز کہ اس کی باگ اگر ڈھیلی چھوڑ دیجے تو اسے پھکڑ بن جاتے کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔

اب پختہ سالی پر پہنچ کر اور شاید اپنے پچپن سالہ کے شاید کچھ عرصے کے بعد ان کے قلم نے ایک جدید شئے ناولچہ (ناولٹ) پیش کی ہے یا یوں کہیے ایک نیا شگوفہ چھیڑا ہے اور اردو میں یہ تقلیدی جدت شاید اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ اس کی ایجاد کا سہرا ایک فرانسیسی کے سر ہے!-------- یورپ جو بھی حماقت کرے کیوں کر ممکن ہے کہ غلام ہندوستان اس کا اعادہ اور وہ بھی بڑے فخر و مباہات کے انداز میں اپنے ہاں کرے!-------- ڈی موپاساں ایک فرانسیسی جو 1850 میں پیدا ہوا اور نشہ بازی اور طرح طرح کی علتوں میں گرفتار ہو کر اور طرح طرح کے جسمانی و دماغی امراض کا شکار ہو کر بوڑھے ہونے سے بہت قبل ایک پاگل خانہ سے 1893 میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ''روشن خیال'' ہندوستان آسکر وائلڈ اور بائرن اور مالیسان کے انجام سے عبرت کبھی حاصل نہ کرے گا صرف ان کی نقالی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھے گا۔ جو شجرِ خبیثہ فرنگستان کی کسی سرزمین پر بھی پیدا ہوگا اس کے برگ و بار ہندوستان میں بھی ضرور آئیں گے۔

یہ ناولٹ ناول و افسانہ سے الگ ہے آخر کیا بلا؟ جوش صاحب اسے پوری

طرح سمجھے بھی ہیں یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہر حال ہو جو کچھ اور جیسا اسے سمجھے ہیں وہ انھیں کی زبان میں حاضر ہے۔

''غالباً گائی ڈی موپاساں ناول کے بجائے ناولٹ سب سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کر سکا۔ اس جدت سے اس کے ہم عصر نقاد چراغ پا ہوئے مگر دنیائے ادب نے آگے چل کر اس کو سر آنکھوں پر جگہ دے دی۔ ناولٹ کو اپنے کرداروں کے محض مخصوص زمانے سے تعلق ہوتا ہے اور صرف غیر معمولی واقعات کی نقاشی اس کا مقصد ہوتا ہے وہ حسرت آموز، المناک یا سبق آموز انجام پر ختم نہیں ہوتا۔ ناولٹ یا ناولچہ دراصل ناول اور افسانہ کے آرٹ کا نسخۂ مرکب ہے۔ میں اردو ادب میں ناولچہ کے اضافے کی جہد تو کر رہا ہوں اور غالباً سال خوردہ اور مفروضہ قواعد میں جکڑے ہوئے نقادوں کی نکتہ چینی اور اخلاقیات بگھارنے والے واعظوں کی عیب جوئی کا مستحق ہوں''۔ (دیباچہ صفحہ 7-6)

خوب ہوا کہ مصنف نے اپنا تعارف آپ کرا دیا اور تبصرہ نگار کو بڑی طوالت سے بچا دیا۔ اقتباس بالا سے یہ امور بھی روشنی میں آ گئے:۔ (1) اس ایجاد پر خود فرنچ نقادانِ فن چراغ پا ہو گئے۔ (2) ناولٹ کو اصل زندگی کی مصوری یا عکاسی سے کوئی تعلق نہیں اس کا کام صرف کرداروں کے وقتی قول و فعل کا عکس لینا اور تصویر کو اسی نا تمام حالت میں چھوڑ دینا ہے۔ (3) اس کا کام عام وقتی حالاتِ زندگی کو نہیں صرف غیر معمولی واقعات زندگی کی وقتی نقاشی ہے۔ (4) نفس عکاسی کی طرح انجام کا ناتمام رکھنا اس صنف سخن کا عیب نہیں جوہر اور کمال ہے۔ (5) اردو میں اس نئے ہنر کے نمونے پر جو کوئی نکتہ چینی یا عیب جوئی کی جسارت کرے گا اس کا شمار سال خوردہ، مفروضہ قواعد میں جکڑے ہوئے نقادوں اور اخلاقیات بگھارنے والے واعظوں کی صف میں کیا جائے گا۔ یاد کر لیجیے یہاں پہنچ کر اودھ کی بعض خواتین کا یہ بین ''موئے تیرا حشر شمر کے ساتھ ہوگا''۔

مصنف صاحب عالم باعمل ہیں آرٹ کو وہ جیسا کچھ سمجھے ان کے قلم نے پوری وضاحت سے بغیر کسی جھجک کے اس کی ترجمانی کر دی-------دولڑکیوں کے کردار درج ہیں اور دونوں سیرت کے لحاظ سے عجیب وغریب، 'شب زفاف' کی لذتوں کے سلسلے میں مقدمات مواصلت کی ایک ایک جزئیہ کی تفصیل درج ہے۔ایک بازاری گفتگو کے ذیل میں ایک فحش گالی تک کے اول وآخر حروف دیئے گئے ہیں اور قصہ کے انجام صفحات تو چھپنے سے رہ گئے ہوں۔ پلاٹ کی تقلیدی جدتوں کے ساتھ زبان بھی جا بجائی ہوگئی ہے۔''رات کو ہم آدم حوا بنیں گے بہشت منائیں گے''۔ یہ عید منانا جشن منانا چھوڑ کر بہشت یا دوزخ منانا خود جوش صاحب نے بایں کہنہ مشقی نہیں لکھا ہو تو براہ کرم اپنی ہی سند پیش فرمائیں اور پھر ارادہ وصل کے موقع پر یہ آدم وحوا تنہا کیا خوب اور کتنا برمحل تصرف۔اور ایسی گفتگوئیں تو بارہا کتاب میں ہیں جو شاید فرنگی جوڑے آپس میں کرتے ہوں مگر بیان کے وہ اسلوب دہلی، لکھنؤ، بدایوں، کلکتہ میں بھی ابھی رائج نہیں ہوئے۔مصنف نکاح اور سول میرج کے درمیان شاید کوئی فرق نہیں کرتے صفحہ 121۔اور دوسرا نکاح کرنے، طوائف رکھ لینے، داڑھی بڑھانے اور حج کر آنے کو ایک ہی سطح پر رکھتے ہیں۔صفحہ 33۔

قاصرالنظر ناقد کی سمجھ میں ایک بات نہ آئی گرد پوش پر زنانہ برہنہ تصویر کے ایک گوشہ میں صرف مردوں کے لیے کی رجم سمجھ میں نہ آئی۔

کتاب ایسے مردوں اور عورتوں کے لیے قابلِ دید ہے جو ملک کی فضا کو جلد از جلد اخلاق کے خس وخاشاک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ جوش صاحب شرر صاحب کی طرح باغی ہرگز نہیں جنھوں نے ناول کی لعنت یورپ سے لے کر اسے اپنایا اور الٹا شیطان کے گلے کے لیے پھندا بنا دیا۔ جوش صاحب نے مغرب سے جو آرٹ حاصل کیا ہے اپنی شاگردی کی سعادت مندی کا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی لاش کو عفونتوں کے ساتھ اپنے کاشانہ کے ایک ایک کمرے اور کوٹھری میں گھسیٹتے پھریں۔

صدق نمبر 45 جلد 12 مورخہ 17رجنوری 1947

(197) شبنم

از عزیز احمد صاحب بی اے

218 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت ساڑھے چار روپیہ، مکتبہ جدیدیہ لاہور (پاکستان)

شبنم کوئی دینی، اخلاقی و تاریخی کتاب نہیں، ناول ہے۔ اور وہ بھی ایک معروف ترقی پسند ناول نگار کے قلم سے۔ صدق کے صفحات میں اس کا استقبال تو خیر دور رہا، اس کا تعارف بھی زرا عجیب سا ہے۔ لیکن کچھ ایسا عجیب بھی نہیں۔ صدق کا دستور محض شخصیت یا پارٹی کے نام سے بھڑک جانا نہیں۔ اس کی وضع جس طرح سیاسیات کی دنیا میں کچھ آزادوں اور سر پھروں کی سی ہے۔ اس کی قطع اسی طرح ادبیات کے عالم میں کچھ قلندروں سے ملتی جلتی ہے۔

ناول "ترقی پسندانہ" یقیناً ہے مذہب پر چوٹیں، بعض مذہبی شعائر پر چبھتے ہوئے فقرے، سوشلزم کی تبلیغ کہیں پردہ پردہ میں اور کہیں بالکل بے پردہ۔ "مادہ کے معاشی ارتقاء" اور "بیوی کے جسم کے حق ملکیت" وغیرہ کے تلازے (جیسے جلسوں جلوسوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے) سب "ترقی پسندی" کے نشان منزل کا کام دیتے ہوئے۔ اور سب سے بڑھ کر کتاب کا انتساب، ایک عجیب و غریب فدویت و خاکساری کے ساتھ، پارٹی کی دو بڑی بلند بانگ اور شہرۂ انام شخصیتوں کے ساتھ!۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ، ع

کچھ جنوں میں ابھی آمیزش دانائی ہے!

عالی خاندانی اور ابتدائی تربیت کی شرافت کا نشہ بھی غضب کا ہوتا ہے، مزدکیت اور فرنگیت کی بڑی سی بڑی ترشیاں اسے پوری طرح نہ اتار سکیں۔ اور عزیز احمد صاحب ترقی پسندی کے میدان میں کوئی بڑے شہسوار ثابت نہ ہوئے۔ کچھ پچھڑے ہوئے ہی سے نکلے نہ مذہب پر وہ بھرپور حملے، نہ فحش و عریانی کے وہ قد آدم

مرقعے، اور نہ چرکینت کے وہ متلی آور مظاہر جواب تک ''ترقی پسند'' لٹریچر کے انمول موتی شمار ہوتے رہے ہیں۔

افسانہ کی سرزمین حیدرآباد (فرخندہ نگر) اور اورنگ آباد (عالم گیر نگر) کی ہے۔ اور ماحول شریف بگڑے ہوئے مسلمان خاندانوں کا۔ لڑکیاں بہت کم سن نہیں، خاصی سن دار اور پڑھی لکھی، کوئی بی اے کوئی ایم اے، کوئی مضمون نگار، کوئی کسی روزنامہ کے دفتر میں کارگزار۔ لڑکے بھی نوعمر نہیں خاصے پختہ کار۔ کوئی کالج میں استاد کوئی کسی محکمہ میں عہدہ دار۔ قصہ کے ہیرو ایک انگریزی روزنامہ دکن آبزرور کے ایڈیٹر ارشد علی خاں۔ اور ہیروئن ایک شریف خاندان ایم اے خاتون شبنم سلطان حسین۔ اردگرد اور لپیٹ میں اور بہت سی شخصیتیں، عزیز دوست سہیلیاں اور ہمسائیاں، رفیق و رقیب۔ انسانی زندگی ریاضی کے پہاڑوں کی طرح کسی سادہ اور سپاٹ، یکساں و ہموار چیز کا نام نہیں۔ اتار چڑھاؤ، پیچ و خم، دکھاوے اور الجھاوے، حادثے اور شکستیں، کامیابیاں اور فتح مندیاں، پریشانیاں اور پشیمانیاں زندگی کے اجزاء لاینفک ہیں۔ مصنف کو نفسیات بشری کی پرکھ اچھی خاصی ہے۔ خوب خوب سب کی نبضیں ٹٹولتے چلے گئے ہیں۔ اور کالجی ماحول کی عکاسی کے تو جیسے ماہر خصوصی ہیں۔ بعض بعض فقرے اس سیاق میں ایسے دلچسپ اور اتنے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان کے قلم سے نکل آئے ہیں کہ دل بے اختیار داد دینے کو چاہتا ہے۔ مثلاً یونیورسٹی کے فلاں استاد اور ان کی فلاں قبول صورت ''شاگردہ'' کے درمیان رشتہ ''نیم دلبر، نیم دختر'' کا؟

ناول کی زبان عام طور پر خوب ہے۔ سلیس و شستہ، نستعلیق و شایستہ، لیکن کہیں کہیں یہ صاف نظر آنے لگتا ہے جیسے اردو مصنف صاحب کی مادری زبان نہیں۔ بلکہ اجنبی زبان کی طرح سیکھی ہوئی اور مشقت سے حاصل کی ہوئی ہے جیسے وہ سوچتے انگریزی میں ہیں، اور پھر اس کا ترجمہ اردو میں کر دیتے ہیں:

''نوازش ہاسٹل میں شریک ہوگیا تھا جہاں خط پہنچتے میں شبنم کو وہی اندیشہ تھا جو پورا ہوکر رہا۔'' (ص:197)

یہ ''داخل'' ہونے کے بجائے شریک ہونا صاف Join کا ترجمہ ہے اور ''جہاں'' اور ''جو'' بالکل انگریزی ترکیبوں کی پیروی ہے۔

''ارشد نے اپنے دل میں ایک ہزار ایک افسوس کے ساتھ سوچا'' (ص:298)

یہ ایک ہزار ایک، خالص انگریزیت ہے۔ اردو محاورہ بہ صد افسوس، بہ ہزار افسوس یا بہ صد ہزار افسوس نری انگریزیت ہے۔

''معصوم دعائیں ساتھ ہیں'' (ص:191)

''صرف، اگر صرف وہ اور سب لڑکیوں کی طرح ہوتی'' (ص:107)

''صرف'' کا یہ محل استعمال خالص انگریزی ہے۔

''امید کے خلاف امید کے بعد ایک طرح کی امید تھی'' (ص:93)

یہ بھی صاف انگریزی محاورہ کا اردو ترجمہ ہے۔

(ہیروئن کے خط میں ہیرو کے لیے)
''اچھے بچوں کی طرح'' (ص:171)

یہ انگریزی کا Like Good Boys اردو میں بالکل بے محل بلکہ مضحک ہے۔

یہ چند مثالیں محض نمونہ کے طور پر عرض کردی گئیں۔ تلاش سے اور بہت سی مل جائیں گی۔ انگریزیت کے علاوہ زبان کہیں کہیں دکھنی بھی ہوگئی ہے۔ مثلاً ''بتانا'' دکھانے کے معنی میں یہ فقرہ ''اچھا اب غصہ نہیں ہونا'' (ص: 171) زبان و محاورہ کی اور لغزشیں بھی جا بجا ہیں۔ مثلاً ''آخری ملاقات ہوکے اب ایک سال ہو چکا تھا'' (ص: 91) ''راضی بہ رضا'' (ص: 237) ''کسی رسالہ کی ان کے پاس کوئی وقعت ہی نہیں تھی'' (ص: 11) ''اس سے ہزار ہا میل دور دراز تھی۔ (ص: 15) وغیرہا۔

لیکن ان مثالوں سے ناول نگار کے عام اسلوب بیان سے متعلق بدظنی نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے وہ بڑے شگفتہ نگار ہیں۔ اور صحیح اردو لکھنے والے (گو ایک خالص ترقی پسند اسے اپنے حق میں داد سے بڑھ کر ہجو سمجھے گا)۔ اور نثر کے ساتھ نظم پر بھی قادر ہیں۔ اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ اور یہ سارا کلام ان کی خوش ذوقی

کا گواہ ہے سوا اس کے کہ کوئی شعر ذرا ٹھوس (ٹھس نہیں۔ٹھوس) زیادہ ہو گیا ہے۔ غالب اور اردو فارسی کے دوسرے استادوں کا بھی جتنا کلام وہ لائے ہیں، وہ سب بر محل، برجستہ اور بڑا پُر لطف ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ شاہی درباریوں، امیروں، وزیروں کا سا مذاق شعر و سخن رکھ کر ''ترقی پسندوں'' کے رجسٹر میں اپنا نام انھوں نے لکھا کیسے لیا!- گویا نثر کے جوش ملیح آبادی! ''رد کردہ از ما یک طرف'' ضرور پھر بھی ''افگندہ کاکل یک طرف، زلف چلیپا یک طرف''! مذہب سے بھاگے ہوئے، پھر بھی شرافت ان کے واپسی کے انتظام میں آغوش کھولے ہوئے!

ایک جگہ وہ بڑے ٹھسّے سے ''نیاز فتحپوری'' بن کر میدان میں آئے ہیں اور خوب ہی اس پارٹ کو ادا کر گئے ہیں:

> ''عورت شادی کے نہیں شاعری کے لیے ہے۔ کیوں کہ اس سے محبت کرنا نہایت ہی شاعرانہ تخیل ہے اور تحریک منا کحت میں مطلق شاعری نہیں۔ مجھے الفت ہے اس مظہر شعری سے جو پیکر ہے لطافت انسانیت کا، جس کے تصور میں شعریت ہے، جس کے نظارے میں مصوری ہے۔ جس کی گفتگو میں موسیقی ہے۔ جس کی خاموشی عنوان ہے ربوبیت کا جس کی تمکین و وقار لرزہ ہے انوہیت کا۔!'' ص:225

نہیں نہیں انداز بیان اتنا شستہ، بے تکلف اور پیارا ہو گیا ہے کہ مرزا رسوا کی امراؤ جان کا دھوکا ہونے لگتا ہے، گو یہ دھوکہ منٹ دو منٹ سے زیادہ قائم نہیں رہتا۔

کتاب عوام کے لیے نہیں اس کی ایک دو بیسیوں بلکہ پچاسوں ادبی شعری علمی تلمیحات کو عام لوگ سمجھیں گے بھی نہیں۔ کتاب سے پورا لطف صرف وہی اٹھا سکتے ہیں جو کالج یا یونیورسٹی کے اونچے ماحول میں ایک مدت گزار چکے ہیں۔ مشرق و مغرب دونوں کے سرچشموں سے خوب سیراب ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی اپنی نوجوانی کی عمر بھی ختم کر چکے ہیں۔ عشق و عاشقی کے جذبات اور پھر ان کے پیچ و خم، نشیب و فراز کچی عمر کے اسکولی لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔

صدق جدید، نمبر 20، جلد 2، 18/اپریل 1952

(198) خوجی

ازڈاکٹرمحمداحسن فاروقی ، ایم اے۔ پی ایچ، ڈی،

150 صفحہ، مجلد مع گردپوش، قیمت ڈھائی روپیہ، پتا: رابعہ رام کمار پریس لکھنؤ۔

فسانہ آزاد (سرشار) اردو کا ایک مشہور و مقبول ناول ہے۔ اردو ادب کے ہر طالب علم کا خوب جانا پہچانا ہوا۔ اس کے صفحات میں خود آزاد (ہیرو) کے بعد سب سے زیادہ نمایاں و ناقابل فراموش شخصیت خواجہ بدیع الزماں خوجی کی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر احسن فاروقی استاد اگرچہ شعبہ انگریزی کے ہیں لیکن مناسبت انھیں اپنی ہی زبان کی خدمت سے ہے۔ خوجی انھیں کے ذوق ادبی و ملکۂ تلخیص و ترتیب کی پیداوار ہے۔ اس میں انھوں نے فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں کو کھنگال کر خوجی کا ذکر جہاں جہاں بھی ملا ہے، سب کو یکجا کر کے گویا موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے، اور موتیوں کی آب و تاب جوں کی توں۔ جن لوگوں کو سرشاریات سے دلچسپی ہے وہ ضرور اس کامیاب کوشش پر مرتب کی خدمت میں ممنونیت و شکرگزاری کے گلدستہ پیش کریں گے۔ اتفاق سے کتاب کو شایع اسی پریس کے وارث و جانشین نے کیا ہے جس نے آج سے ۷۲ سال قبل اصل فسانہ آزاد کی اشاعت کی تھی۔

صدق جدید، نمبر 27، جلد 2، 6/جون 1952

(199) یزید

از سعادت حسن منٹو صاحب

212 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ، مکتبہ جدید، لاہور، (پاکستان)

خیال نہ گزرے کہ کتاب کا تعلق، دور یا نزدیک کا کسی طرح بھی واقعہ کربلا یا اس کے متعلقات سے ہے۔ کتاب ترقی پسندوں کے سرخیل و سردار منٹو صاحب کے چھ افسانوں اور ایک مضمون کا مجموعہ ہے۔ پہلے افسانہ کے پلاٹ کا توڑ اس پر ہوا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے دریاؤں کا پانی بند کرنے والا اور اس طرح اس کے لیے نئی کربلا پیدا کرنے والا ہے۔ کہ عین اس گفتگو کے وقت پاکستانی ہیرو کریم والا کو بچہ پیدا ہونے کی خوش خبری ملتی ہے اور وہ خوشی میں آ کر اس کا نام یزید رکھتا ہے۔ اس مناسبت سے کہ اس تاریخی یزید نے پانی بند کر دیا تھا۔ اور یہ نیا یزید پانی کھول دے گا! سبحان اللہ! ۔صنعت 'حسن تعلیل' کے نمونے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے ''سوء تعلیل'' کی اس نادر مثال تک کسی کا ذہن اس دور ترقی پسندی سے قبل کیوں کبھی پہنچا ہوگا!

زبان، انداز بیان، پلاٹ! سب خالص ''ترقی پسندانہ'' ۔لطیف، شیریں اسلوب بیان کا ایک ہلکا سا نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''بات یہ ہے کہ آج وھسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی ہے''! (ص:196)

اس کے بعد کچھ اور نمونوں کی تاب آپ لا سکیں گے؟

میاں چرکین کے کلام کی خصوصیت یہ مشہور چلی آتی ہے کہ مضمون کوئی سا بھی ہو۔ جب تک اس میں تلازمہ جسم انسانی کے رقیق یا غلیظ فضلات کا نہ آ جائے۔ اس مرحوم کے ذوق شعری کی تسکین ہی نہیں ہوتی تھی۔ کچھ یہی رنگ یہاں بھی ہے۔

ایک صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ جانے میں دوسرے بزرگوار یہی نہیں کہ اس کا استقبال زور کے بلند قہقہہ سے کرتے ہیں۔ بلکہ کتنی لطیف، نفیس پھبتی بھی چست کرتے ہیں:

''حیدرآباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے'' (ص:197)

اور جیسے اس میں کچھ کسر رہ گئی چند ہی سطروں کے بعد مزید ترقی کر کے یہ فرماتے ہیں:

''اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ ہی خراب ہے'' (ص:198)

اور جب ذوق چرکنیت کی تسکین اب بھی نہ ہو سکی، تو سہ بارہ بھی اسی فقرہ کو دہرایا ہے۔ (ص: 200) - طبع لطیف خدا جانے مثانہ پر پہنچ کر کیوں کر رک گئی۔ استعارہ واقعات کے لیے ابھی اعضائے اسفل کا ایک بڑا ذخیرہ باقی تھا!

ترکیبوں کی تراش و خراش کی نفاست کا کیا کہنا؟ ذوق سلیم قدم قدم پر بلائیں لے رہا ہے:

''میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی'' (ص:140) ''میری پر تکلف بیوی'' (ص:140) - گویا بیوی بھی کوئی دعوت تھی، عمارت، لباس تھی، تقریب تھی! - ''اس نے چہل و حجت نہ کی'' (ص:141) - جیسے ''چہل'' بھی کوئی چیز بحث و حجت کی قسم کی ہے! - ''ایک بے پردہ عنوان'' (ص:142) ''گنجا ماحول'' (ص: 141) ''کھوکھلا قہقہہ'' (ص:196) ''کنوارے گلاس'' (ص:145) - گویا یہ بھی ''کورے آبخورے'' ہیں! - اور یہ صرف انبار میں سے چند دانے ہیں۔

اور جہاں تک پلاٹ کی واقعیت اور حقیقت پسندی (Realism) کا تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اس سے فرما لیجیے، کہ ان بزرگ کے ہاں فالج کے مریض کی چارپائی۔ چھڑکاؤ سے ٹھنڈے کیے ہوئے صحن میں لا کر بچھائی جاتی

مضامین کی بے حیائی اور حرام کاری کی دلالی کی بابت کچھ کہنا تحصیل لا حاصل ہی ہے۔ باقی ساتھ ساتھ شراب خوری کی تبلیغ بھی خوب جاری ہے۔ اور پھر شراب شراب میں بھی تو فرق ہے۔ حافظ خیام غالب و ریاض، بلکہ جوش ملیح آبادی تک کی شراب اور جو کچھ ہو بہر حال بازاریوں اور ٹچون کی شراب نہیں۔

صدق جدید، نمبر 31، جلد 2، 2/جولائی 1952

(200) عشق

ازمولوی سید رئیس احمد جعفری

399 صفحہ، مجلد ہے، گرد پوش قیمت چار روپیہ بارہ آنہ: ادارہ اشاعت اردو 266 پیرالٰہی بخش کالونی، کراچی، (پاکستان).

یہ ناول ہے اور حسب تصریح سرورق ایک ''رومانی ناول'' لیکن کتاب پڑھنے کے بعد محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اشتیاق کا جو جذبہ ناول اور رومانی ناول کے نام اور اس سے بھی بڑھ کر مصنف ''رویتہ'' وغیرہ کے نام سے بھڑک اٹھا تھا، پورا ہونے کے بجائے کچھ سرد سا ہو کر رہ گیا اور رئیس احمد جعفری 1952 میں وہی ثابت ہوئے جو آج 15، 20 سال قبل سے ظاہر ہوتے چلے آرہے ہیں۔ عریاں نگار نہیں، بلکہ سیرت محمد علی کے مؤلف و مرتب روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر اور قائد اعظم جناح کے سوانح نگار!

قصہ کا خاکہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ سعد آباد کا ایک نوجوان امتیاز ہے۔ فہم و ذہانت میں ممتاز اور ہمت و استقلال میں بے نظیر، باپ کی اچانک موت سے اس کے حوصلے اور ولولے دل کے دل ہی میں رہ جاتے ہیں اور اسے تلاش معاش میں پہلے گھر سے اور پھر شہر سے نکلنا پڑتا ہے، عروس البلاد میں اسے طرح طرح کے سخت سے سخت سابقہ پیش آتے ہیں۔ اور اس کی ہمت کی آزمائش ہر ہر طرح ہوتی ہے۔ وہ ہر معرکہ میں کامیاب ہی ثابت ہوتا ہے۔ کسی کے زور اور زر کی تو خیر کیا ہستی تھی۔ حسن، شباب، لگاوٹ کے بھی بڑے سے بڑے حربے اس کے مقابلہ میں ناکام ہی رہتے ہیں۔ وہ اخلاق و ضمیر کا ایک پتلا ہے اور شرافت و عالی نسبی کا ایک مجسمہ، انجام کار بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ اور اس کی شادی ایک بڑی مالدار وفا سرشت و شریف طینت فلم ایکٹرس سے ہو جاتی ہے۔ اور اسی حجلہ عروسی پر تماشہ کا پردہ گر جاتا ہے۔

شریف گھرانوں کی خانگی معاشرت، شہری فاسقانہ معیشت، غربت و افلاس

کی شرافت سے ٹکر، فلمی سیٹھوں ساہوکاروں کی اندرونی حالت فلم ایکٹرسوں کی اندرونی اور بیرونی زندگی، یہ سارے منظر اس میں خوب آتے گئے ہیں۔ اور زندگی کی دھوپ چھاؤں، اتار چڑھاؤ کی مصوری اچھی خاصی ہوتی گئی ہے۔ ہر فلم ایکٹرس جوان و حسین، لازمی طور پر شیطان کی خالہ نہیں ہوتی۔ ہر گندے سے گندے پیشہ میں شرافت کی کھپت بھی ممکن ہے اور قصہ کی ہیروئن پروین اس قسم کی ایک شرافت و عالی ظرفی کی پتلی ہے۔ ''ماڈرن ازم'' (جدت پرستی) کے دور میں اور ''ترقی پسندی'' کی دوڑ میں ایک ایسے سنبھلے ہوئے سلجھے ہوئے ناول کا وجود کچھ عجیب ہی سا لگتا ہے!

''ہونٹوں پر ہلکا تبسم کھیلنے لگا'' (ص28) ''تبادلۂ آب و ہوا بھی ہو جائے گا'' (ص38) اس قسم کے انگریزی نما جملے ذرا کھٹکے، لیکن کوئی 400 صفحوں میں اس طرح کی گنی چنی دو چار ترکیبوں کے آ جانے کی بساط ہی کیا ہے؟ کہیں کہیں گفتگو کی طوالت و ثقالت پر تقریر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن یہ میدان تو وہ ہے جس میں آ کر بڑے بڑے استادوں کا پیر بھی پھسلنے سے کب محفوظ رہا ہے؟ اور یہ تنقید بھی صرف اسی اعتبار سے ہے کہ ناول نویس کا قلم خاندان ریاض کی یادگار ہے۔ اس کا معیار جہاں تک زبان کی صحت و سلاست اور بیان کی آمد و شگفتگی کا تعلق ہے عام معیار سے بہر حال بلند ہونا چاہیے۔

صدق جدید، نمبر 43، جلد 2، 22/ستمبر 1952

(201) امراؤ جان ادا

از مرزا رسوا لکھنوی مرحوم

452 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت ایک روپیہ، نیا ادارہ، لاہور، پاکستان۔

کتاب نئی نہیں پرانی ہے۔ اول بار آج سے 55، 60 سال قبل 1899 میں لکھنؤ میں چھپی تھی اب یہ اس کا نیا ایڈیشن نکلا ہے۔

لکھنؤ میں ایک پڑھے لکھے بزرگ تھے، مرزا محمد ہادی بی، اے، فارسی، عربی اور قدیم معقولات کے علاوہ جدید منطق و فلسفہ و ریاضیات و ہیئت میں بھی برق، ان سب کے علاوہ شعر و سخن میں طاق اور ادب و انشاء میں شہرہ آفاق، لیکن شاعری اور اس سے بھی بڑھ کر ناول نویسی کو اپنے مرتبہ علم و فضل سے فرو تر سمجھتے، اور مشاعروں میں تو خیر کبھی شریک بھی ہو جاتے اور مرزا کے نام سے غزل پڑھ دیتے۔ لیکن ناول نویسی بالکل چوری چھپے کرتے اور اس غرض کے لیے اپنے نام کا ایک نقاب ''مرزا رسوا'' گڑھ لیا تھا۔ سمجھتے تھے کہ اپنی شخصیت نظروں سے مخفی رہے گی اور آئی گئی سب اسی فرضی ہستی پر ہوگی...... وقت کا معیار تہذیب و شرافت تھا ہی کچھ ایسا!

امراؤ جان ادا، ایک ناول ہے۔ ایک پڑھی لکھی مہذب شائستہ و نستعلیق ذیرہ دار طوائف کی سوانح عمری، خود اسی کی زبان سے بیان کی ہوئی...... ادب اور انشاء کے معیار سے اردو کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہونے کے قابل۔ مرزا صاحب خاص اہل زبان تھے۔ ان کے جوہر پوری طرح اس کتاب میں کھلتے ہیں۔

شروع شروع تو خیر کتاب اس قابل ہی نہیں سمجھی گئی، کہ ثقہ طبقہ کے کان میں اس کے نام کی بھنک بھی پڑنے پائے۔ اس کے بعد بھی سالہا سال تک نیم گمنامی میں پڑی رہی۔ 1932 میں جب مرزا صاحب کا انتقال ہولیا، تو مدیر صدق نے ان پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا۔ اس میں اس کا بھی ذکر بڑی داد و تحسین کے ساتھ کیا اور اللہ کا کرنا،

کہ یہ تحسین ناشناسی ہی کتاب کی اشاعت و مقبویت میں معین ہوگئی ...... کتاب کا موضوع جیسا کچھ ہے ظاہر ہی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے قلم کی شرافت کا کیا کہنا کہ کہنے کو تو سب کچھ کہہ گئے، لیکن کچھ اس طرح بھلے آدمیوں کی بول چال میں کہ نہ کہیں تہذیب کو آنکھیں نیچی کرنا پڑیں۔ اور نہ کہیں زبان قلم کو فحش سے آلودہ ہونا پڑا- کاش ترقی پسندی اس سے سبق لیتی۔

یہ نیا ایڈیشن اسی قدیم نسخہ کی ہو بہو نقل ہے۔ البتہ خاتمہ پر ناشر نے بڑی جدت کا ثبوت دیا ہے۔ اصل کتاب 326 پر ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد ایک بڑا لمبا اختتامیہ تمکین کاظمی حیدر آبادی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس کے اندر یوں تو باتیں کام کی ہیں اور دلچسپ بھی، لیکن ایک عجیب دلگی ہے کہ کاظمی صاحب نے امراؤ جان کے وجود کو فرضی کے بجائے حقیقی یقین کر کے ''جنون انتظار'' یا ''افسانہ مرزا رسوا'' کو بے تکلف ان کی تصنیف بلکہ جوابی یا انتقامی تصنیف ٹھہرالیا ہے! ان بی صاحبہ کا وجود اگر تخیل کی دنیا سے باہر اس عالم آب و گل میں ہوتا بھی تو وہ عہد نوابی کی پیداوار تھیں۔ 1857 میں اچھی خاصی سن دار اور شہرت کی مالک تھیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں ان کے زندہ رہنے اور جواب لکھنے کا امکان ہی کیا تھا! ...... یہ جواب و سوال کا قصہ تمام تر مرزا صاحب ہی کی اُپج تھی اور ایسے ایسے چٹکلے خدا معلوم کتنے ان کی جیب میں پڑے رہتے تھے۔ خود ہی امراؤ جان کی تخلیق کی اور غزلیں کہہ کر تخلص اس کا ڈال دیا۔ اور پھر جب تماشہ دیکھنے کو جی چاہا، تو اس کی طرف سے اپنے ردّ جواب کا ایک قصہ کھڑا کر دیا۔

صدق جدید، نمبر 41، جلد 6، 7 ستمبر 1956

(202) آتش خموش

از خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری

صفحہ 204 مجلد مع گردپوش۔ قیمت پانچ روپے، بک لینڈ، ..س روڈ، لاہور (پاکستان)

خواجہ محمد شفیع بحیثیت ناول نویس ملک کے لیے کوئی نامانوس یا غیر معروف ہستی نہیں۔ ہجرت لاہور کے بعد سے البتہ اس حیثیت سے خاموش ہو گئے تھے۔ آتش خموش ان کی اس خاموشی یا نیم گمنامی کے دور کو ختم کرنے والی ہے۔ خواجہ شفیع انشاء پرداز واہلِ زبان پہلے ہیں اور ناول نویس بعد کو لکھنؤ کے سرشار کی طرح لیکن یہ نہیں کہ سرشار کی طرح وہ زبان، محاورہ اور روزمرہ ہی کے رہیں اور اس رو میں یہ خیال ہی نہ کریں کہ پلاٹ کی چولیں کتنی ڈھیلی پڑ ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ نہیں، انھیں خیال پلاٹ کی چستی کا بھی رہتا ہے اور اشخاص قصہ کی شخصیتوں (یا بہ اصطلاحِ حال 'کرداروں') کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں رہتے۔ البتہ نمبر اول پر اہتمام ان کے ہاں زبان ہی کا ہے۔ اور ضرور نہیں کہ اس اہتمام میں دخل ان کے قصد اور ارادے کو بھی ہو۔ لغت، معانی و بیان کی کسی کتاب کی ورق گردانی نہ کی۔ ان کے کسی ناول ہی کا کوئی صفحہ ذرا غور کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس ناول کا پلاٹ مجلسی زندگی کا ہے اور وہی حسن و عشق جو ہر ناول کی جان ہوتا ہے۔ دل کی بے تکلف زندگیوں کا مرقع۔ کہیں واہ کہیں آہ، کہیں سوز کہیں ساز، کہیں غفلتیں کہیں عبرتیں، کہیں قہقہوں اور تالیوں کا زور، کہیں نالہ و ماتم کا شور، قصہ کی حلاوت قصہ پڑھنے والے ہی کے حصے میں آسکتی ہے۔ اخلاقی سبق ہلکے ہلکے کتاب بھر میں بکھرے ہوئے البتہ نذیر احمد و راشد الخیری کی طرح سر پر مسلط نہیں۔ اس کا پلاٹ سادہ نہیں۔ خاصہ پیچیدہ اور پر اسرار ہے۔ راز دل سے پردہ کہیں بالکل آخر میں جا کر اٹھتا ہے اور اس سے بڑھ کر نئی بات یہ کہ اب کی نری بزم آرائی نہیں بلکہ رزم بھی شاملِ بزم ہو گئی ہے۔ اور آخر میں تو شبہ یہ ہونے لگتا ہے کہ

جیسے کوئی جاسوسی ناول کسی روپوش یا under ground دہشت پسند سے متعلق کھلا ہوا ہے! (اس انگریزی لفظ کا ترجمہ خدا کے لیے کوئی صاحب ''زمین دوز'' نہ کر گزریں۔ یہ قدیم ''روپوشی'' کے لیے جدید اصطلاح ہے!)۔ سب سے بڑھ کر آئی گئی دہلی کے ایک ادھیڑ سن کے حکیم پر ملتی ہے۔

طرز ادا کا نمونہ دیکھنا ہو تو کتاب کا ایک صفحہ درمیان سے پڑھتے چلئے:۔

برسات کا موسم۔ امنگوں کے دن۔ کالی کالی بدلیاں سیہ کاریوں پر آمادہ کریں۔ رم جھم رم جھم مینہہ برسے۔ پیا ملن کا جیوڑا ترسے۔ اس موسم میں بوڑھے جوان کی تخصیص نہیں۔ بدلی آئی اور نیت بدلی۔ اپنی اپنی توفیق کے مطابق سب کھل کھیلتے ہیں۔ حکیم صاحب کا تو پوچھنا ہی کیا۔ کشتوں کی خشکی میں لگی جو برسات کی بھیگی بھیگی ہوا تو بے آپے ہو گئے۔ اور تر دامنی پر آمادہ۔ دل کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اگر کسی پر طبیعت آ جائے اور دل کو بھا جائے تو کسی اور سے دل بہلتا نہیں۔ حکیم صاحب نے ایک دو بار زیر علاج طوائفوں کو بلایا۔ باغ میں جلسہ جمایا۔ پر کچھ دل خوش نہ ہوا۔ بوتلیں لنڈھائیں پر طبیعت تشنہ کام ہی رہی۔ نگاہیں کسی اور ہی کو ڈھونڈتی تھیں۔ ایک مریض نے جلسہ دیا۔ لالہ صاحب کے باغ میں انتظام ہوا۔ کڑھائی چڑھی ہوئی ہے۔ جھولے پڑے ہیں۔ آموں کی ناندیں بھری رکھی ہیں۔ دو چار گلعذار جمع۔ سب احباب موجود طبلہ کھڑک رہا ہے۔ مینہہ برس رہا ہے۔ ملہار گائے جا رہے ہیں، پینگ بڑھ رہے ہیں۔ کپڑے جسم پر چپکے جا رہے ہیں۔ پھول سے جسم جھلک رہے ہیں۔ پیمانہ ہائے عیش چھلک رہے ہیں'' (صفحہ 124)۔

جا بجا خواجہ صاحب جہاں لکھنویت پر اتر آئے ہیں۔ وہاں اچھے اچھے لکھنویوں کو مات دے دی ہے۔ ایک نمونہ اس رنگ کا بھی ملاحظہ ہو۔ حکیم صاحب کے مصاحب خاص ایک ''ولایت پلٹ'' ماسٹر صاحب ہیں۔ بات چیت ان سے تخلیہ میں ہو رہی ہے:۔

حضور کے اقبال سے ایسی سوجھی ہے کہ جواب نہیں۔ اول کشمیری دماغ۔

پھر ولایت کا سنجھ ہوا ...... وہاں کی ہوا میں عقل و شعور بے بڑے بہہ گئے ہیں دانایان فرنگ۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔ حکیم صاحب بولے ایک دن کا واقعہ شب فردا پر اٹھا رکھیے پہلے تدبیر بتایئے۔ اس پر ماسٹر صاحب مقدمہ جیتے ہوئے بیرسٹر کی ادا سے مسکرا کر بولے۔ اجی تدبیر کو کیا پوچھتے ہیں آپ۔ نو تولہ باون رتی کی ہے۔ بس سنتے ہی تڑپ جایئے گا بھڑک جایئے گا۔ یہ کوڑی کبھی پٹ پڑی ہی نہیں۔ ان قدموں کی قسم بڑی دور کی کوڑی لایا ہوں۔ لاکھوں کا کام کوڑیوں میں بناتا ہوں۔ کوڑیالے کو افعی سے لڑاتا ہوں۔ کوڑی کے چار سو دے بتاتا ہوں۔ اور پھر کوڑی بجالاتا ہوں۔ بس یوں سمجھیے کہ پھوٹی کوڑی کے کوڑے کرلاتا ہوں۔ حکیم صاحب جھلا کر بولے یہ ضلع جگت کب تک بولیے گا۔ معاملہ کی بات کیجیے" (صفحہ 213)۔

افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیاں بڑی کثرت سے رہ گئی ہیں۔ تبصرہ کا جو نسخہ موصول ہوا ہے وہ مصنف کے ہاتھ کا اصلاح شدہ ہے۔ اس پر بھی غلطیاں افراط سے موجود۔ "عندیہ" کا املا ہر جگہ "اِندیہ" "بہ این ریش فش" کے بجائے "بہ مع اش وفش" صفحہ 126۔ "وہی" کے بجائے "وہ ہی" (صفحہ 443)۔

ایک عرض اور بھی دبی زبان سے کرنے کی ہے۔ گو وہ ایک اہلِ زبان اور مانے ہوئے ادیب کی شان میں ہے بہت گستاخانہ۔ یہ پریس اور سنیما سلامت رہیں۔ اس دور میں اہلِ زبان کو بھی اپنی زبان کی صحت قائم رکھنا دشوار ہو گئی ہے۔ تا وقتیکہ اس کا وہ اہتمام خاص نہ رکھیں۔ اور اپنے کو گنواروں کی صحبت سے تمام تر محفوظ رکھیں۔ ("گنوار" یہاں دہقانی کے معنی میں نہیں۔ بلکہ جس کسی کی بھی زبان چوپٹ ہے وہ گنوار ہی کے حکم میں داخل ہے) پڑھنے بولنے اور سننے میں چوبیسوں گھنٹے اس شدت سے غلط لفظیں غلط ترکیبیں آتی رہتی ہیں کہ اہلِ زبان بیچارہ خود مخبوط و مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

"موسیقار" کا استعمال بجائے ایک پرند کے "گویے" کے معنی میں تو فلمی اشتہاریوں کی زبان ہے اور 'ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا' اس تمام تر ایک فرنگی محاورہ کا

ترجمہ ہے جب ایسی چیزیں بھی اس کتاب میں بار پا جائیں تو اب سند و استناد کے آخری مرجع کے لئے کوئی بتائے کہ کون سا آستانہ تلاش کیا جائے۔

صفحہ 189 پر ایک شعر بھی نکتہ چینی کی آنکھ کو کھٹکا۔ غالب کی غزل "برنہیں آتی"، "نظر نہیں آتی" اوپر سے چلی آرہی تھی یک بیک ایک شعر اسی وزن ورد یف کا مگر بالکل دوسرے قافیہ کا اس میں کیسے آ گیا ہے۔

خواجہ کی ادبیت کے قدر دانوں کو اپنی قدر دانی کا تازہ ثبوت خواجہ کے اس تازہ پیش کش کے لئے بھی ضرور بنوانا چاہیے۔

صدق جدید نمبر 38 جلد 7 مورخہ 23/ اگست 1957

(203) لہو کے پھول

از حیات اللہ صاحب انصاری

5 جلدیں چھوٹی تقطیع کل صفحات 2 ہزار 6 سو 8 صفحے کی۔ قیمت ستر روپیہ
کتاب دان بی 4/2 ریور بینک کالونی لکھنؤ۔

کتاب کو وصول ہوئے ایک جگ بیت گیا۔ نوبت ختم کرنے کی تو کیا آتی، توفیق نصف نصف کی بھی آج تک نہ ملی۔ پہلی جلد تو لشتم پشتم نکل گئی۔ دوسری جلد بھی 3/4 تک کھینچ لے گیا۔ بس آگے گاڑی نہ چلی اور ہاں پانچویں جلد ختم کے قریب بھی کوئی سو پچاس صفحے کا جوں توں چاٹ گیا اس طرح کل کتاب کا 40، 45 فیصد حصہ اپنے پلے پڑ گیا...... کون جانتا تھا کہ اس بیسویں صدی کے ثلث آخر میں کوئی اس غضب کا لکھاڑ اپنی اردو میں پیدا ہو جائے گا کہ روزنامہ کے لمبے لمبے اور قسط وار اداریوں کے ساتھ ساتھ ناول کے بھی ڈھائی ہزار صفحے سے زائد لکھ ڈالے گا۔ لکھنے والا ایسا من چلا نکل آیا۔ تبصرہ نگار کی ہمت جواب دے گئی.... لیکن پھر یاد پڑ گیا کہ کیا مضایقہ آخر بریانی کی بھری دیگ کا اندازہ چند ہی چاولوں سے تو کر لیا جاتا ہے۔

''ترقی پسندی'' کی چھاپ کتاب کے نام پر پڑی ہوئی۔ نئے پن کی دھن میں لکھنؤ کی سلاست کا خون ہوا جاتا ہے تو ہو جانے دیجئے۔ اعجوبہ پن کے صدقے میں اگر لکھنؤ کا بانکپن برباد ہو رہا ہے تو ہو جانے دیجئے ______ ''لہو کے پھول'' کے آخر معنی کیا ہیں؟ اور معنی اگر ٹھونس ٹھانس کر پہنا بھی لیجئے تو آخر کیا یہ احساس مردہ کر لیجئے یا ترکیب کی غرابت کا، بندش کی ثقالت کا، لفظ کی رکاکت کا تلازمہ علی گڑھ کے روز مرہ میں ''بور'' ہونے کا بھی! ظالم لکھنوی عنیک کو خود اپنا نام بھی نہ سوجھا!.....''فسانۂ حیات'' کیسا رہتا ہلکا پھلکا، ڈھلا ڈھلایا، سلیس، بلیغ، لطیف،

لذیذ، ہر تکلف سے خالی، ہر تصنع سے ماورا! ___ ہائے فسانۂ آزاد!

سائز یقیناً چھوٹا ہے پھر بھی فسانۂ آزاد کی تقطیع پر چھ سو صفحے کی جگہ تو کتاب گھیر ہی لے گی ___ آج ہے اتنا دم اکھاڑے کے کسی پہلوان میں!...... ناممکن کو ممکن اور محال کو واقع کر دکھایا مرے شیر نے!

ناول رقبہ پورے ایک قرن کا گھیرے ہوئے ہے۔ کہانی کی بائے بسم اللہ چلی ہے اخیر 1911 سے ملکہ معظم دربار تاجپوشی دہلی سے اور تائے تمت آ کر تمام ہوئی ہے گاندھی جی کے حادثۂ قتل پر ختم جنوری 1948 پر۔ ملک کے اندر خودی، خودداری کی تحریک کیسے اٹھی، کیسے بڑھی اور کیسے مطالبۂ آزادی و خودمختاری اور پھر بغاوت کے نعرہ تک ذہن پہنچا۔ ہندو مسلمان کبھی ملے اور جڑے، الجھے اور گتھے، ابھی گرے اور ابھی چڑھے۔ کیسے الجھے اور کیسے بگڑے۔ کبھی پکڑے گئے، جکڑے گئے، مہاتما کی جے کس نے پکاری، اللہ اکبر کی صدائے تکبیر کس کس نے سنائی، کاشی کا دل ستیہ گرہ والوں سے ذرا نہ پسیجا، علی گڑھ نے اپنے جگر کے ٹکڑے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام پر نچھاور کر دیئے۔ کہیں خان بہادروں اور رائے بہادروں کے پینترے کہیں رضا کاروں کے جوش بھرے جے کارے! ادھر پولیس کی دھر پکڑ، ادھر بی اماں کی زبان سے جان بیٹا خلافت پہ دیدو'' کا رجز، کہیں صاحب لوگوں کی ڈانٹ پھٹکار اور کہیں امن سبھا والوں کی صرف کواگہار مخلصوں کی گرم جوشیاں اور سخت کوشیاں، راجوں نوابوں کی ٹھنڈی گرمیاں کہیں گدگدیاں، کہیں چٹکیاں سارے ہی منظر بڑے اور چھوٹے اپنا پرا جمائے ہوئے موجود، کہیں آمد، کہیں آورد، کہیں نقش دیہاتیوں کی پنچایتوں کی، کہیں نقشہ کشی شہر والوں کے جمگھٹوں کی، قلم کی رفتار کہیں گرم، کہیں سرد، کہیں ہنسانے والی، کہیں پر درد پکار کہیں حیرت میں ڈالنے والی۔ چونکانے والی ذرا زیادہ، رلانے والی اور افسردگی میں ڈال دینے والی ذرا کم، حسن و عشق، رندی و فسق کی تصویریں کیا دیہاتی کیا شہری جہاں جہاں ہیں عریانی ان میں کھل کر نہیں ہو پاتی ہے۔ ہاں کہیں کہیں بیان

کے ڈانڈے اس سے ضرور مل گئے ہیں۔

دیہات کی منظر کشی میں ماحول تو دیہات کا بے شک آ گیا ہے لیکن لب و لہجہ ہر جگہ دیہاتیوں کا نہیں آ سکا ہے بلکہ مصنف کی اپنی زبان دیہاتی کرداروں کی زبان پر غالب آ گئی ہے۔____ کرداروں میں اصلی نام صرف گاندھی جی اور چوٹی کے مسلمان لیڈروں کے آئے ہیں باقی سارے کردار فرضی ہیں۔ مقامات میں اصلی نام صرف بمبئی، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ کے آنے پائے ہیں باقی سارے نام فرضی اور مدح و تحسین کے موقع پر عموماً قلم پر احتیاط و توازن کا پہرہ بیٹھا رہا ہے۔ گاندھی جی کی ذات البتہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ ان کے قتلِ ناحق کا جہاں جہاں ذکر ہے مصنف نے انھیں شہید کے لقب سے بلا تکلف یاد کیا ہے حالانکہ اردو کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ یہ ایک ٹھیٹھ اسلامی اصطلاح ہے اور یہ ایسی ہی بے جوڑ بات ہے کہ جیسے کوئی گاندھی جی کی عبادت کا ذکر یوں کرنے لگے کہ وہ ''نماز'' میں مشغول تھے.. کتاب کی زبان عموی صورت میں معیاری و ٹکسالی تو نہیں البتہ غنیمت ہے کہ کتاب کا بیشتر حصہ ترقی پسندوں کی ٹولی کی سطح پر نہیں...... لفظوں کے انتخاب، بندشوں اور ترکیبوں میں قلم اس منزل پر ہے جس پر ایک اوسط درجہ کے مشاق اردو نگار کا ہوتا ہے۔ تذکیر و تانیث کے باب میں ذوق شاید ہر فریق کو خوش رکھنے کا ہے جس لفظ کو بھی دیکھیے وہ اگر صفحہ فلاں پر مذکر ملے گا تو صفحہ فلاں پر مونث ...... پانچویں جلد میں پاکستان کی سرحد پر ایک مسلمان قافلے میں شامل ایک ادھیڑ سن کی عورت کا بیدردانہ قتل ایک سکھ کے ہاتھ سے دکھایا ہے قاتل اس کے بعد اس کی نو عمر لڑکی پر دست درازی کیا ہی چاہتا ہے کہ عین وقت پر اس کو اس کا ثبوت مل جاتا ہے کہ لڑکی تو اسی کی تھی اور مقتولہ کبھی اس کی داشتہ رہ چکی تھی! یہ منظر اتنا پر اثر ہے کہ اس سے گزرتے ہوئے پڑھنے والے کی آنکھ میں اگر آنسو آ جائیں تو کچھ عجب نہیں!

کتاب کا ناقابلِ برداشت حصہ ادبی حیثیت سے اس کا سرورق یعنی غزل کا

مطلع۔ کتاب کا پتہ درج ہے کہ شہر کی فلاں سڑک کے فلاں نمبر پر ''کتاب دان'' سے مل سکے گی کیا ارشاد ہوا؟ کتاب دان، جی ہاں کتاب دان، مصنف کی لکھنوی نفاست طبع نے آخر اس کراہت بلکہ غلاظت کو گوارا کیوں کر کر لیا اسے استفراغ نہ ہو گیا!......
''کتاب دان'' ترجمہ بک کیس کا تو ہو سکتا ہے اور خیر کھینچ تان کر الماری کے خانے یا تختہ کے معنی میں بھی سمجھا جا سکتا ہے لیکن ''کتاب دان'' دارالاشاعت کے معنی میں لینا اپنی مہملیت میں کتاب کے نام لہو کے پھول سے بھی کچھ بڑھ ہی کر داد طلب ہے...... ظالم کو خدا معلوم بالکل سیدھے سادے نام ''کتاب گھر'' کی توفیق کیوں نہ ہوئی۔ اس لفظی ژولیدہ بیانی کے ساتھ ایک معنوی شترگربہ'' بھی ملاحظہ فرماتے چلیں،، دوسری جلد میں کہیں نصف کے قریب (اور ایک جگہ اس کے بعد بھی) ایک کتے کا مالک الگ سالہا سال کے بعد دیہات میں کتے کے پاس واپس آیا ہے۔ کتا اپنے جوشِ وفاداری میں بے خود ہو کر مالک کے قدموں پر لوٹنے اور رونے لگتا ہے! کاش مصنف نے پڑھنے والوں کی ناواقفی اور جہالت پر ترس کھا کر یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ یہ کتا کس ذات، کس نسل اور کس ملک کا تھا؟.... بھلے آدمی! فرط محبت و وفاداری سے بے خود ہو کر رونے لگنا یہ رقت قلب انسانی کا اثر ہے۔ کتے کا کام نہیں۔ کتا تو روتا صرف اس وقت ہے جب اس پر دہشت اور وحشت طاری ہو جائے۔ سوء مشاہدہ کی ایسی کھلی ہوئی مثال ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

رہی کتاب کی قیمت سو کتاب کی قدر و قیمت تو اس کے قدرداں جتنی بھی چاہیں فرض کریں۔ محض قیمت کے معیار پر اتنی رقم اب اس پر کیا عرض کیا جائے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ سوشلزم کے عہد میں کتب فروشی کا یہی معیار قرار دیا جائے۔

قدح کے بعد مدح ''عیب مے'' کے بعد ہنرش نیز بگو۔

دو چیزوں کا مصنف کو ملکہ ہے۔ ایک تو داستان شکار انگریز حکام اپنے زمانے میں شکار کھیلنے کے عادی ہوتے تھے اور ہمارے رجواڑے شکار کھلانے کے

اور اس کے پورے آداب و تکلفات کے ساتھ۔ خدا جانے کتنے انھیں خدمات کے صلے میں راجہ بن گئے۔ سر ہو گئے، ہز ہائی نسوں کی تقریبات شکار کی اولوالعزمیوں اور پھیلاوے کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ کتاب میں بار بار ذکر سرکاری شکار گاہوں یا پارٹیوں کا آتا ہے اور مصنف نے ہر جگہ مصوری بلکہ نوک پلک کے ساتھ عکاسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ گویا پڑھنے والوں کو عین شکار گاہ کے اندر کھڑا کیا ہے اور جنگل میں منگل کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

ایک چیز تو یہ ہوئی۔ دوسری لکھنؤ کے بعض پرانے نوابی گھروں کی تصویر کشی، بیگمات کے ٹھسّے، نواب صاحب کے چونچلے، مغلانی اصیلوں کی چخ چخ، خدمت گاروں کارندوں کے جوڑ توڑ، یہاں مصنف کی لکھنویت پھسپھسی او گھتی ہوئی نہیں بلکہ جیتی جاگتی خصوصیت کے ساتھ وہ مزہ دے جاتی ہے کہ آخر

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

اور سب سے بڑھ کر، سب سے برتر ایک ذرا سی ترکیب لفظی جس نے کتاب بھر میں جان ڈال دی ہے اور زمین کو ہم مرتبہ آسمان بنا دیا! کتاب کا انتساب (ڈیڈی کیشن) اپنی رفیق زندگی کے نام کیا ہے۔ لیکن دیکھیے نہ کسی لقب سے نہ کسی اور نام و نشان سے بلکہ صرف

"حاصل حیات، شریک حیات سلطانہ کے نام"

چہیتی بیوی کے لیے چھانٹ کر صرف "حاصل حیات" واہ حضرت حیات اللہ! سبحان اللہ! اس ایک ذہن کی رسائی نے سیکڑوں نارسائیوں کی تلافی کر دی!

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اور لکھنؤ کے بانکپن کی لاج رکھ لی! ...... نہ ہوا یہ دہقانی تبصرہ نویس کسی راج کا رجواڑے، کسی ملک کا اعلیٰ حضرت قدر قدرت ورنہ درباری شاعروں نشیوں بذلہ سنجوں کی طرح اس سوشلسٹ اہل قلم کا منہ موتیوں سے بھر دیتا۔

صدق جدید نمبر 66 جلد 21/8 جنوری 1971

(204) امراؤ جان ادا کا نیا ایڈیشن

امراؤ جان ادا

از مرزا محمد ہادی رسوا

360 صفحہ، قیمت چھ روپئے، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اصل کتاب چھپے ہوئے 70، 72 سال گزر چکے اور کتاب مسلم طور پر اردو کے کلاسیکی ادب میں داخل ہو چکی ہے۔ اگلی سطروں میں جو تعارف و تبصرہ ہوگا وہ نفس کتاب سے زیادہ اس کے نئے ایڈیشن کا۔ اس کی ترتیب وتہذیب کے ذمہ دار کتاب کے تعارف نگار ڈاکٹر محمد حسن صاحب (استاد اردو دہلی یونیورسٹی) ہیں۔

سب سے پہلی بحث مصنف کے نام کی ہے۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر مرزا محمد ہادی رسوا، لکھ کر آیا ہے حالانکہ اس کے مصنف اب تک صرف مرزا رسوا تھے''۔ مرزا محمد ہادی تو کہنا چاہئے کہ مرتب کی دریافت ہے۔ اس نام کی صراحت وہ اپنے دیباچہ یا تعارف میں ضرور کر سکتے تھے۔ اور انہیں کرنا چاہیے بھی تھی۔ لیکن سرورق پر درانہ اور بے تحاشہ اس کتاب کو ان کی جانب منسوب کر دینا شاید بے تکلفی کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ مصنف کو اپنے نام کا اخفا ہی مقصود تھا پھر میں یا آپ ان کی مصلحت کا خون کرنے والے کون؟...... خافی خاں نے جو تاریخ اورنگ زیب اپنے کو گمنام کر کے لکھی ہے کیا آج کسی کو حق ہے کہ اس پر بجائے خافی خاں کے ان کا اصل نام درج کر دے! لکھنؤ میں شریفوں کا ایک طبقہ انیسویں صدی کے آخر تک ایسا موجود رہا جو ناول نویسی کو (شاید وہ چونکہ مغرب کی راہ سے آئی تھی) اپنی ثقاہت وشرافت کے منافی سمجھتا تھا (حالانکہ شاعری میں بیٹا باپ کے سامنے بے تکلف اپنا عاشقانہ بلکہ فاسقانہ کلام پڑھ ڈالتا) مرزا صاحب نے اسی مصلحت سے رسوا کا ایک نقاب اپنے لئے تیار کر لیا۔ اور ناول نگاری کے گورا بازار میں جب آئے نقاب اپنے چہرے پر ڈالے

ہوئے۔کوئی پہچانے کوئی نہ پہچانے، رسوا تخلص شاعرانہ نہ تھا۔شاعری کی دنیا میں وہ مرزا تھے۔مشاعروں میں غزل سناتے تو اسی تخلص سے۔میرے سامنے تیسرا ایڈیشن 1933 کا چھپا ہوا موجود ہے۔اس تک میں وہ صرف ''مرزا رسوا'' ہیں۔

غنیمت ہے کہ دوسرے ایڈیشنوں کے برخلاف اس ایڈیشن میں مصنف کے ڈاکٹر آف فلاسفی کے قصے کی تشہیر نہیں کی گئی ہے، یہ بوگس ڈگری مرزا مرحوم کے لئے ہرگز باعث فخر نہ تھی۔محض بعض یارانِ طریقت کی اُپج تھی۔امریکہ کی ایک ڈگری فروش دوکان جو نہ سرکاری حلقوں میں معتمد تھی نہ علمی حلقوں میں مستند محض مرزا صاحب کی نظر میں اسے ایسا اچھالا، چرکا یا کہ ان کی جیب سے ایک رقم اگلوا ایک برائے نام مقالہ کے عوض یہ ڈگری منگا دی۔مرزا صاحب کی خودداری ان اشتہاری بلکہ تشہیری ہتھکنڈوں کے بھتھے چڑھ گئی البتہ اتنی احتیاط رکھی کہ خود اپنے قلم سے میرے علم میں اس ڈگری سے کبھی کام نہ لیا۔

کتاب کا تعارف دس صفحے کا بہت اچھا اور سلجھا ہوا ہے۔مصنف کی شخصیت اور فن دونوں پر حاوی اور تحلیل و تجزیہ کا جامع۔جو کچھ کور کسر رہ گئی وہ صرف اس کا نتیجہ ہے کہ غالباً مرتب کو مصنف کے ذاتی قرب کا موقع نہیں ملا۔دو چار معلوماتی باتیں محض اطلاعاً و مشورۃً ذیل میں عرض ہیں۔کان میں پڑی رہیں شاید کہ کسی آئندہ ایڈیشن میں کام آجائیں۔

(1) مرزا صاحب عملاً جیسے بھی تھے وارستہ مزاج ہوں عقیدتاً بڑے مذہبی تھے۔پختہ شیعہ تھے۔اثبات شیعت میں ایک بڑی ضخیم کتاب تیار کر رہے تھے۔کئی طویل و عریض جلدوں کے مسودہ کی شکل میں میں نے دیکھی تھی۔ساتھ ہی نفس اسلام کے بنیادی عقائد، توحید و رسالت کے بھی بڑے مضبوطی سے قائل تھے۔وہ اسی سے الحاد و دہریت کے ابطال میں کام لیا کرتے تھے۔کہیں کہیں ناول اور ڈرامے میں بھی۔ماہ نامہ الحکم (اسے ''حکم'' بالضم پڑھیے) میں جو مکالمہ ''آزاد'' و ''ہادی'' کے درمیان ہوا تھا۔وہ قابلِ دید تھا۔

(2) بعض زمانے بڑی عسرت کے گزارے ہیں۔ امراؤ جان ادا کی تصنیف کا زمانہ بھی ایسا ہی تھا۔ روایت مشہور یہ تھی کہ ضرورت سے مجبور ہو کر ساری کتاب ایک رات میں لکھ ڈالی۔ اور دوسری صبح کو پبلشر مہا دیو پرشاد ورما کے ہاتھ مسودہ بہت ہی قلیل قیمت پر بیچ ڈالا تھا، افسوس ہے کہ روایت کی تحقیق کا خیال نہ کبھی مرزا صاحب سے آیا نہ ورما صاحب سے۔

(3) سلاست، شگفتگی، دلکشی، مرصع نگاری، سحر نگاری جو کچھ بھی ہے سب ان کے ناولوں تک محدود ہے اور امراؤ جان میں تو حسن انشاء ان کا کمال شباب پر پہنچا ہوا ہے، لیکن علمی ترجموں اور مقالوں کو اٹھا کر دیکھئے تو عالم ہی دوسرا نظر آئے گا۔ اور چھوٹے منہ سے بڑی بات کا سننا اگر گوارا ہو تو بعض خشکی کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں اور ترجمہ میں لفظی پابندی حد سے بڑھی ہوئی۔

(4) عثمانیہ یونیورسٹی کے کلاس تو غالباً 1918 میں کھلے سررشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال پہلے 1917 میں قائم ہو گیا تھا۔ فلسفہ کے مترجم کی حیثیت سے مترجمین کی پہلی کھیپ میں طلبی اس خاکسار کی ہوئی تھی۔ سال بھر بعد جب میں نے استعفیٰ دیا تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ اپنی حد سے تجاوز کر کے اپنی جانشینی کے لئے نام بھی تین پیش کر دیئے تھے۔ ان تینوں میں نمبر اول پر نام مرزا صاحب کا تھا۔ ان کا تقرر غالباً 1919 ہی میں ہوا۔

(5) سنہ غالباً 1917 تھا۔ لکھنؤ (رفاہ عام) میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا جلسہ زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اہل سنت کے خلاف گرما گرمی پر خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنی تقریر میں ٹوکا ایک مشہور مجتہد صاحب کو طیش آ گیا۔ اپنی کرسی سے نیم خیز ہو کر فرمایا ''میں ایسی تقریر کا سننا حرام جانتا ہوں'' خواجہ صاحب کس سے دبنا کیا جانیں اسی ردیف و قافیہ میں جواب دیا کہ ''میں ایسے جلسے میں شریک رہنا حرام جانتا ہوں'' یہ کہا اور جلسے سے نکل آئے، مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ جلسے میں کم سے کم ایک مردِ حق آگاہ اور موجود تھا اس نے خواجہ صاحب کا ساتھ دیا اور وہ بھی باہر نکل آیا۔ یہ

شخصیت انہیں مرزا محمد ہادی کی تھی۔

کتاب کا زمانۂ تصنیف انیسویں صدی کا بالکل اخیر ہے۔70،72 سال تو ہو ہی گئے۔ یہ کہانی جس زمانے کی ہے وہ اس سے بھی 60،65 سال قبل کی، ظاہر ہے کہ معاشرت کا ڈھانچہ بدل گیا۔ اور زندگی کا سانچہ ہی کچھ ہو گیا۔ لال ٹین اور لیمپ اور چمنی کے دور سے پہلے اور گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں کے دور سے بہت پہلے روشنی پھیلانے والے آلے چراغ اور ڈیوٹ اور شمع دان، چراغ دان اور فتیل سوز مشعل اور فانوس اور کنول اور جھاڑ اور مردنگ تھے۔ انہیں اب کوئی کیسے سمجھے؟ اسی طرح سائیکلوں، ٹراموں اور موٹر سائیکلوں اور ریل اور انجن اور ٹراموے اور بسوں سے بہت پہلے روایتی سواریاں۔ شکرم اور بگھی اور فٹن اور ٹم ٹم اور ہوا دار تھیں اور زنانی سواریاں ڈولی اور فینس اور چو پہلا تھے۔ اور دیہاتی سواریوں میں بہل اور رتھ اب ان کو جاننے والے پہچاننے والے کتنے باقی رہ گئے ہیں! اور یہی حال معیشت اور معاشرت کے چھوٹے بڑے ہر شعبے کا ہے۔ کوڑی اور گنڈے اور دھیلا الگ رہے، آنے اور پائی کا مفہوم بھی آج کے نوجوانوں کے دماغ میں کیسے اتار دیا جائے! ضرورت تھی کہ اس قبیل کے سارے لفظوں پر جواب نامانوس اور غریب ہو کر رہ گئے ہیں، مفصل نہیں تو مختصر ہی تشریحی نوٹ ہوتے۔ اگر ہر صفحے پر تحت اللفظ نہ ہوتے تو آخر میں بصورتِ فرہنگ تو ضرور ہی ہوتے اور اس سے بھی زیادہ ضرورت قدیم محاورں اور ترکیبوں کو روشن کرنے اور جو لفظ مطبعی غلطی سے یا کسی سبب سے بھی صریح غلط یا مشتبہ و مشکوک رہ گئے ہیں ان کی تصحیح کی ہوتی...... کہنے کو ایک فرہنگ کتاب کے آخر میں اب بھی موجود ہے لیکن کل چار صفحہ کی! حالانکہ ایسی کلاسیکی ادب کی کتاب فرہنگ چار صفحہ کی نہیں چالیس صفحہ کی مانگ رہی تھی...... ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے حسن ظن سے کام لے کر شاید ناظرین کو بھی اپنا جیسا ہی ماہر اردو سمجھ لیا ہے اور سب کچھ ان کی فہم و استعداد پر چھوڑ دیا!

فرہنگ نامکمل ناتمام اور ناقص تو ہئی ہے جتنی اور جیسی بھی ہے وہ بھی غضب یہ ہے کہ تمام تر معتمد و مستند نہیں۔

اسم ہونا کے تحت لکھنا تھا کہ یہ محاورہ اب متروک ہے۔

بھاؤ بتانا یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ یہ فنِ رقاصی کی اصطلاح ہے اور ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں کا تعلق محفل مشاعرہ سے نہیں۔

بینڈ یہ بھی اب تقریباً متروک ہی ہے۔ یہ تو جس زمانے میں سفر عموماً پیدل کیا جاتا تھا، مسافر کمر تک کپڑے سے کس لیتے تھے اور اس میں روپیہ پیسہ رہتا تھا۔

اوماتی (یا اودماتی جیسا کہ فرہنگ میں درج ہے) صحیح ترجمانی جوش، شباب یا مستی سے ہوسکتی ہے۔

این مین دوسرے ادیبوں کے یہاں اس کا املا کہیں عین مین ملتا ہے اور لغت کی کتابوں میں بھی یہی ملا۔

برق انداز۔ اس پر بھی حاشیہ دینا تھا کہ اب یہ تقریباً متروک ہے پہلے سپاہی کے مرادف تھا۔

تکلیف مالایطاق ''تکلیف'' یہاں اردو مفہوم میں اور اذیت کے مترادف نہیں بلکہ عربی معنی میں ہے یعنی ذمہ داری اور مسؤلیت۔

پاسی ''غریب کسانوں کا ایک قبیلہ'' نہیں۔ نیچ اور اچھوت ہندوؤں کے ہاں ایک ذات ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہ لوگ سور پالتے ہیں۔ کاشتکاری اور چوکیداری کا کام دیتے ہیں۔

پاپوش جوتیاں بہ صیغۂ جمع نہیں۔ صیغۂ واحد میں جوتی ہونی چاہیے۔

جیوڑا اس کا ''معشوق'' کے مرادف ہونا یوں بھی بہت مشکوک ہے۔ کم سے کم اس کتاب میں اس معنی کا تو کوئی قرینہ نہیں۔

چوپہلا (نہ کہ ''چو پہلے'') قصباتی زبان میں اسی کو میانہ کہتے ہیں۔

ڈیرہ دار طوائف فرہنگ نویس کو لفظ ''ڈیرہ'' سے سخت دھوکہ ہوا۔ مراد وہ طوائفیں نہیں جو مختلف شہروں کے دورے پر رہتی ہیں بلکہ اونچی معزز طبقہ کی طوائفیں مراد ہیں۔ جو عموماً کسی کی ملازم یا پابند ہو جاتی ہیں۔

گنڈہ پیسہ کا مترادف نہیں بلکہ چار پیسے یا چار کوڑیوں کا مترادف ہے۔

مانگ چوٹی گرفتار ایسی عورت کے لئے آتا ہے جو اپنی الجھنوں میں برابر پھنسی رہتی ہو۔ (صاحب فرہنگ اثر نے ایک باریک فرق اس میں اور ''ناک چوٹی میں گرفتار'' میں دکھایا ہے)۔

یوسف محض ''مشہور پیغمبر'' ان کے تعارف کے لئے کافی نہیں حسن و جمال کے لئے ضرب المثل کا اضافہ ضروری تھا۔

کتاب کے بالکل خاتمے پر مرتب کی طرف سے درج ہے:

''بدقسمتی سے ناول کا کوئی ایڈیشن چوتھے سے پہلا دستیاب نہ ہو سکا اس کے لئے اس کے مطابق مسودہ شائع کیا جاتا ہے۔''

یہ معذرت نہ کچھ زیادہ صحیح اور نہ وقیع۔ اول تو پرانے ایڈیشن ابھی ناپید نہیں ہوئے ہیں۔ اردو کے اکثر پرانے کتب خانوں میں کوئی نسخہ ضرور نکل آتا ہے بلکہ اگر جامعہ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا تو عجب نہیں کہ کچھ اللہ کے بندے اپنے نسخے پیش کر دیتے۔ اور پھر پہلا ایڈیشن جیسا غلط سلط چھپا، کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ اور پچھلے ایڈیشن والے اس کو بجنسہٖ چھاپتے اور مکھی پر مکھی مارتے چلے آئے۔ کسی نے اتنی سی بھی محنت گوارا نہ کی کہ موٹی اور صریحی غلطیوں کو تو درست کر دیا ہوتا!............ مجرم سب سے بڑھ کر میں خود ہوں کہ مرزا صاحب کی زندگی میں اتنی مدت تک موقع پانے کے باوجود بھی مشتبہ، مشکوک عبارت کے سلسلے میں کبھی ان سے رجوع کی توفیق نہ ہوئی۔

اب آخر میں کچھ اور گزارشیں اس سلسلے کی ملاحظہ ہوں:

(1) کہیں کہیں کوئی فقرہ مکرر چھپ گیا ہے اس کی تصحیح ضروری تھی۔

(2) جو لفظ اور ترکیبیں زنانی بولی کے ساتھ مخصوص ہیں ان پر نوٹ دینا ضروری تھا۔

(3) ص 40 پر ختم کے قریب لفظ 'سلام' مونث استعمال ہوا ہے ''لوگ جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے''۔ اسی طرح کتاب میں دو جگہ یہ فقرہ درج ہے۔ ''دوزخ کے کندے پڑتے ہوں گے''۔ دوزخ کے کندے ہوں گے۔ یہ ترکیب تو عام طور پر مستعمل ہے لیکن ''کندے'' ''پڑنا'' نامانوس معلوم ہوا...... اگر یہ اغلاط محض مطبعی ہیں تو انھیں درست ہو کر آنا تھا...... اگر یہی الفاظ مصنف کے ہیں تو انہیں تفردات مرزا میں شمار کرنا ہوگا۔ (ہر امام فن کے کچھ اپنے تفردات بھی ہوتے ہیں۔ ان میں وہ اپنے ہم عصروں سے الگ ہوتا ہے)۔

(4) بیگم کے ساتھ تعظیمی لفظ ''صاحبہ'' کتاب بھر میں بیسیوں بار آیا ہے لیکن اسی کثرت سے ''صاحب'' بھی۔ میرے کان میں آواز پڑی ہوئی ہے کہ اہل زبان کے روزمرہ میں لفظ بیگم کے ساتھ صرف ''صاحب'' ''صاحبہ'' نہیں...... کتاب سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک دونوں یکساں جائز ہیں۔

(5) اشتعال سے الگ اور اس کے عام معنی سے ایک جگہ ''اشتعالک'' ایک زنانی آواز میں ''ترغیب'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس پر نوٹ ضروری تھا۔

(6) ''ایک ہی لکھا بیسوا تھیں'' ملک آئین کے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے ''یہ بڑا قابو چی ہے'' اگر کچھ زیادہ بڑبھس کریں گے تو انہیں کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤنگی۔'' بیسیوں فقرے، محاورے، روزمرہ تلمیحات کتاب بھر میں مشتبہ صورت میں پھیلے ہوئے ہیں ان سب کو آج کا پڑھنے والا بغیر کسی تحقیق و توضیح کے کیا سمجھے گا۔

(7) ص 84 کے شروع میں ایک فقرہ ہے ''مشاعروں میں ڈریالے گئے''۔ یہ لفظ ''ڈریانا'' اپنی کم استعدادی سے نہ سمجھ سکا اور نہ لغت سے اس کا پتہ چلا سکا ممکن ہے کہ یہ بھی تفردات مرزا میں شامل ہو۔

(8) ص 212 پر ایک فقرہ ہے ''دوسرے کی مثال ہے جیسے فریاد رس الٰہی'' اب آج اس تلمیح کو کون سمجھے گا۔ اور منتہی طلبہ بلکہ استادوں میں بھی کتنے اس تلمیح کے سمجھنے والے نکلیں گے!

(9) ص 114 پر فقرہ ہے ''ان کو کوتوال کا چبوترہ میں دکھاؤں گی''۔ اس 'کا' پر دل کھٹکا۔ عجب نہیں کہ یہ محض کوتوالی چبوترہ ہو۔ چبوترہ پرانی اردو میں تو خود کوتوالی کا مترادف ہے۔

(10) ص 130 میں یہ لفظ ''خاگینہ'' جس سیاق میں آیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس سے مراد اس کا معلوم و معروف مفہوم یعنی کچلا اور تلا ہوا انڈہ نہیں بلکہ عجب نہیں کہ غریبانہ ناشتہ چینٹی پینٹی کی قسم کا مراد ہو۔ (جیسے راقم السطور کو گھر کی ایک لکھنوی خادمہ کی ز . ن سے معلوم بھی ہوا تھا) افسوس ہے کہ فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات اور مہذب اللغات تینوں بالکل خاموش ہیں۔ صرف پلیٹس Plates نے اشارہ Pan-cake لکھ کر کر دیا ہے۔ بعض لفظ اپنی جگہ پر صحیح تو بالکل ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال وسیع و عام نہیں ہوتا ہے۔ محدود و قلیل ہی طبقہ تک ہی رہتا ہے۔ اس لئے اہل لغت کی نظر بھی چوک جاتی ہے۔

مکتبہ جامعہ قابلِ داد ہے کہ اس نے معیاری ادب کے سلسلے میں کتاب کا انتخاب خوب کیا۔ فسانۂ آزاد کے بعد امراؤ جان ہی ایسی کتاب ہے جو لکھنوی تہذیب و زبان اور ثقافت کا حق پورا ادا کر رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ مرتب صاحب نے ضرورت سے زیادہ شرافت نفس سے کام لے کر اور ناظرین کی فہم و استعداد و معلومات پر تکیہ و اعتماد کر کے ان پر ظلم عظیم کر ڈالا۔

صدق جدید نمبر 2، 3، جلد 22۔ مورخہ 10/دسمبر اور 17/دسمبر 1971

متفرق

(205) مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں

از مولوی عمران خاں ندوی

مکتبہ جمیعۃ التعاون دار العلوم ندوہ، لکھنؤ۔

الندوہ (دور سوم) نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ادارت میں ایک سوال اہل علم کی خدمت میں کر کے کہ آپ کی محسن کتابیں کون کون سی ہیں؟ یا کن کن کتابوں کے مطالعہ نے آپ پر خاص اثر ڈالا ہے؟ بہتوں سے اس کے جوابات بھی حاصل کر لیے تھے جو تقریباً اسی زمانے میں الندوہ سے نکل بھی گئے تھے۔ مدیر صدق کے قلم سے نکلا ہوا اب صدق میں بھی نقل ہو چکا ہے وہی مقالات و مضامین 18 عنوانات کے ما تحت مع ایک مفصل اشاریہ کتب نے ایک مجموعہ کی صورت میں مرتب کر کے شایع کر دئے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں جہاں ایک طرف تعلیمِ جدید کے بہترین نمونے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا شروانی، مولانا مودودی وغیرہم نظر آتے ہیں وہاں دوسری طرف تعلیمِ جدید کے پیداوار خواجہ غلام السیدین میاں بشیر احمد بھی ہیں اور بعض دونوں تعلیموں کے میل جول کی یادگار مثلاً پروفیسر سید نواب علی صاحب، مجموعہ کا مطالعہ جس قدر مفید ہوگا اسی قدر دلچسپ بھی اور بڑی حد تک ہر مقالہ نگار کی سیرت و ذہنیت پر روشنی ڈالنے والا۔

کتاب کے مختصر لیکن بہت ہی پر معنی و بلیغ پیش لفظ فاضل مرتب کے قلم سے کچھ دلچسپ و مفید ہیں۔ لفظ لفظ پڑھنے کے قابل ہے جزاہ اللہ خیر الجزاء

صدق نمبر 35 جلد 12 مورخہ 25/اکتوبر 1946

اشاریہ

تبصرات ماجدی (ادبی)

اس اشاریہ میں کتب تبصرہ شدہ کے نام اور صفحہ نمبر/ان کے مصنف/مرتب/شاعر/شائع کرنے والے اداروں کے تہجی وار نام کے ساتھ دیئے گئے ہیں تا کہ حوالہ ڈھونڈنے میں زحمت نہ ہو۔

	نام مصنف/مرتب/شاعر/ادارہ	نام کتاب	صفحہ نمبر
1	آرزو لکھنوی	جہانِ آرزو	269
2	آفتاب احمد صدیقی (ڈاکٹر)	صہبائے مینائی	139
3	آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	70
		ادب اور نظریہ	116
		نئے اور پرانے چراغ	128
		ذوق جنوں	310
4	آمنہ خاتون	لطائف السعادت	356
5	آوارہ (مارہروی)	اپنی موج میں	353
6	ابوالحسن منصور احمد	الف لیلہ ولیلۃ	164
7	ابوالکلام آزاد	غبارِ خاطر	158
8	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	74
9	ابوتمیم فرید آبادی	خلاصہ فسانۂ آزاد	7
10	احمد سعید خاں چھتاری (نواب)	یادِ ایام	200

نمبر	مصنف	کتاب	صفحہ
11	احمد فاروقی (خواجہ)	کلاسیکی ادب	103
12	احسن فاروقی (ڈاکٹر)	ناول کیا ہے	437
13	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	تاریخ ادب اردو	23
14	اصطفا خاں لکھنوی	آئینہ	275
15	اعجاز حسین (ڈاکٹر)	انتخاب کلام آتش	316
16	اقبال علامہ	ضربِ کلیم	14، 22
		پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق	22
17	اکبرالدین صدیقی	کلام بے نظیر شاہ	330
18	الیاس احمد مجیبی	خلاصہ فسانۂ عجائب	165
		خلاصہ باغ و بہار	165
19	انجم بدایونی	اُجالے	298
20	برج موہن دتاتریہ کیفی (پنڈت)	خمسہ کیفی	58
		کیفیہ	256
21	بیخود موہانی (محمد احمد)	شرح دیوان غالب	142
22	پطرس (اے ایس بخاری)	مضامین پطرس	341
23	تراب علی خاں	تنقیدات عبدالحق	57
24	تسنیم مینائی	مے خانۂ ریاض	77
25	تلوک چند محروم	گنج معانی	322
26	جان صاحب	مسدس بے نظیر	278
27	جعفر علی خاں اثر (مرزا)	چھان بین	324
		انیس کی مرثیہ نگاری	95
		نو بہاراں	324
28	جگت موہن لال رواں	نقدِ رواں	292

29	جگن ناتھ آزاد	اردو	181
30	جوش ملیح آبادی	یادوں کی برات	239
31	جہاں بانو بیگم	محمد حسین آزاد	61
32	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی	کیا خوب آدمی تھا	247
33	حامد اللہ افسر	تنقیدی اصول اور نظریے	109
34	حامد حسن قادری	نقد و نظر	68
35	حبیب الرحمٰن خاں شروانی	مقالات شروانی	397
36	حبیب اللہ خاں ڈپٹی	حیات آفتاب	222
37	حمید صدیقی لکھنوی	گلبانگ حرم	254
		نشاط خاطر	237
38	حیات اللہ انصاری	شکستہ کنگورے	8
		ن۔م۔راشد	78
		لہو کے پھول	449
39	خلیفہ عبدالحکیم	تشبیہات رومی	137
40	خلیق الزماں چودھری	شاہراہِ پاکستان	236
41	خواجہ الطاف حسین حالی	حیات جاوید	189
		مسدس حالی	247
42	خواجہ بدر السلام	ایم اسلم اور اس کا عہد	93
43	خواجہ حسن نظامی	مادر ہمدرد	52
44	خواجہ محمد شفیع دہلوی	ناکام	445
		چند افسانے	4
		ہم اور وہ	48
		دلّی کا سنبھالا	49

نمبر	مصنف	کتاب	صفحہ
		شرح درد	66
		آتش خاموش	445
45	رام بابو سکسینہ (ڈاکٹر)	مثنویات میر بخط میر	318
		تذکرہ مرقع شعراء فارسی	320
46	رشید احمد صدیقی	گنج ہائے گرانمایہ	404
		خنداں	343
		آشفتہ بیانی میری	404
47	رشید حسن خاں	مثنوی گلزار نسیم	406
		انتخاب مضامین شبلی	406
48	رضا علی (سر)	اعمال نامہ	190
49	رضی الدین صدیقی (ڈاکٹر)	اقبال کا تصور زمان ومکاں	27
50	رئیس احمد جعفری	بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد	151
		دید وشنید	151
		رند پارسا	198
		مقالات محمد علی حصہ ۱	392
		مقالات محمد علی حصہ ۲	395
		عشق	441
51	زین العابدین سجاد (قاضی)	بیان اللسان	374
52	زین العابدین قدوائی بیکس	صدائے بازگشت	335
53	ساغر نظامی	رنگ محل	252
54	سدھیشور ورما	آریائی زبانیں	362
55	سعادت حسن منٹو	یزید	338
56	سکندر علی وجد	لہو ترنگ	259

57	سلطان حیدر جوش	ہوائی	430
58	سید آصف علی	پرچھائیں	402
59	سید احتشام حسین	تنقیدی جائزے	175
		ذوق ادب اور شعور	124
		ساحل اور سمندر	175
60	سید سلیمان ندوی (علامہ)	یادرفتگان	364
		حیات شبلی	192
		لغات جدیدہ	364
61	سید عابد حسین (ڈاکٹر)	بزمِ بے تکلف	350
62	سید مسعود حسین صاحب رضوی ادیب	فسانۂ عبرت	132
		آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ	111
		تذکرہ نادر	135
		رزم نامہ انیس	324
63	سید نظام شاہ لبیب	حکایات رومی حصہ اول	143
		حکایات رومی حصہ دوم	144
64	سید وہاج الدین	تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید	50
65	سید ہاشمی فرید آبادی	تاریخ انجمن ترقی اردو	56
66	شانتی سروپ بھٹناگر (سر)	لاجونتی	266
67	شبلی نعمانی (مولانا)	مقالاتِ شبلی حصہ ۳،۴	384
		مقالاتِ شبلی حصہ ۵	386
		مقالاتِ شبلی حصہ ۶	388
68	شفیع احمد	مضامین سید سلیمان ندوی	400
69	شفیق جونپوری	فانوس	287

70	شورش کاشمیری	اس بازار میں	224
		عطاء اللہ شاہ بخاری	224
		ظفر علی خاں	224
		گفتنی و ناگفتنی	313
71	شوکت تھانوی	شیش محل	347
		مابدولت	194
		شوکتیات	347
72	شیخ عبدالرحمٰن	ترجمان اسرار	289
73	صالحہ عابد حسین	یادگار حالی	203
74	صباح الدین عبدالرحمٰن	بزم تیموریہ	33
		ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	41
75	ضیاء احمد بدایونی	تجلیات	296
76	ظفر الرحمٰن (مولوی)	اصطلاحات پیشہ وران حصہ ۱	365
		اصطلاحات پیشہ وران حصہ ۲	372
		اصطلاحات پیشہ وران حصہ ۳	372
77	ظفر عمر	مرزا بلگرامی - لال کتھور	408
78	عباس خاں شروانی (حاجی)	شروانی نامہ	216
79	عبدالحلیم شرر	گزشتہ لکھنؤ	44
80	عبدالحفیظ بلیاوی (مولوی)	مصباح اللغات	376
		اردو عربی ڈکشنری	388
81	عبدالرحمٰن بجنوری	باقیات بجنوری	62
82	عبدالرؤف عباسی	میٹھی کونین یا فسانہ جمیل	419
83	عبدالسلام ندوی (مولوی)	اقبال کامل	30

نمبر	مصنف	کتاب	صفحہ
84	عبدالغفار (قاضی)	حیات اجمل	211
85	عبدالقادر سروری (ڈاکٹر)	کلیاتِ سراج	248
86	عرش ملسیانی	ہفت رنگ	283
87	عزیز احمد	شبنم	433
88	عزیز لکھنوی	انجم کدہ	333
89	عزیز الحسن مجذوب	کشکول مجذوب	285
90	عشرت حسین	حیات اکبر	207
91	عمران خاں ندوی	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	462
92	علی اشرف	نقش امروز	261
93	علی عباس حسینی	ناول کی تاریخ	81
94	غلام احمد فرقت	مداوا	71
		کف گلفروش	345
		صید ہدف	359
		طنز و مزاح	360
95	غلام ربانی	انجمن ترقی اردو کی کہانی	47
96	غلام رسول مہر	غالب	168
97	غلام عباس	جزیرۂ سخنوراں	345
98	فرحت اللہ بیگ (مرزا)	دیوان نظیر اکبرآبادی	253
99	فضل کریم فضلی	نغمۂ زندگی	250
		چشم غزال	307
100	قمر الدین احمد	بزم اکبر	64
101	کرشن چندر	پرانے خدا	5
102	کشن پرشاد کول	ادبی اور قومی تذکرے	54

		نیا ادب	48
103	گوپال متل	صحرا میں اذان	338
104	گیان چند جین	اردو کی نثری داستانیں	221
105	مالک رام	ذکر غالب	98
		گل رعنا	141
		تلامذہ غالب	23
		دیوان غالب	328
106	ماہر القادری	ذکر جمیل	258
107	محمد امین زبیری	ذکر شبلی	196
108	محمد باقر شمس	لکھنؤ کی زبان	226
109	محمد حسن (ڈاکٹر)	ادبی تنقید	113
		کہرے کا چاند	170
		جلال لکھنوی	228
		امراؤ جان ادا کا نیا ایڈیشن	454
110	محمد عبدالرحمٰن	ضمیر	62
111	محمد علی چودھری	کشکول محمد علی شاہ	209
112	محمد سرور (حاجی)	خطوط محمد علی	156
113	محی الدین زور	کلیات سلطان محمد قلی شاہ	248
		تذکرہ اردو مخطوطات	51
114	مسعود حسین خاں (ڈاکٹر)	تاریخ زبان اردو	35
		اردو زبان اور ادب	132
115	مسیح الزماں	اردو تنقید کی تاریخ	119
116	مرزا عزیز بیگ	روح کلام غالب	301

117	مرزا محمد عسکری	مرزا غالب کی شاعری	76
118	مرزا محمد ہادی رسوا	امراؤ جان ادا	443
		مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے	463
119	ملا واحدی	میرے زمانے کی دلی	40
		حیات اکبر	207
120	منشی پریم چند	گئودان	427
		بیوہ	481
		میدان عمل	428
		پریم چند	506
121	منے آغا ذکی	پھول مالا	326
122	منور لکھنوی	بھگوت گیتا	305
123	مولوی عبدالحق (ڈاکٹر)	ادبی تبصرے	79
		چند ہم عصر	141
		اسٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	326
124	مولوی مہیش پرشاد	خطوط غالب	160
125	مہذب لکھنوی	مہذب اللغات جلد ۵،۶	381
		مہذب اللغات جلد ۷	383
126	میر شیر علی افسوس	آرائش محفل	162
127	میر ولی الدین (ڈاکٹر)	اقبال کا فلسفۂ خودی	28
		رموز اقبال	29
128	نثار احمد فاروقی	میر کی آپ بیتی	226
129	نذیر احمد (ڈاکٹر)	تحقیقی مطالعے	108
130	نظم طباطبائی	شرح دیوان غالب	105

131	نورالحسن ہاشمی	دلّی کا دبستان شاعری	90
		ناول کیا ہے	100
		نوطرز مرصع	168
		ایک نادر روزنامچہ	171
		کلیات ولی	271
		کلیات ولی دوسرا ایڈیشن	303
132	نورالرحمٰن	حیات سرسید	203
133	وزارت اطلاعات حکومت ہند	ابوالکلام آزاد	233
134	ہوش بلگرامی	مشاہدات	218
		طوفان محبت	263

ISBN : 978-81-7587-276-9

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-I, R.K. Puram, New Delhi-110 066